ہم فکری سے ہمراہی تک
افکار و تحریر : سید جہانزیب عابدی
(جلد دوئم)

اللّٰھُمَ صَّلِ عَلَی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد وعَجِّل فَرَجَھُم

انتساب

اس روشنی کے نام جو ہمارے تاریک ترین اوقات میں رہنمائی کرتی ہے،

امام زمانہ عج کے لیے، انسانوں کے نجات دہندہ، خدا کی نشانی حضرت بقیۃ اللہ،

اور اپنے والدین کے لیے، جو میرے وجود کی بنیاد ہیں، ظاہری اور فکری،

سید سرکار حیدر عابدی (مرحوم) اور سیدہ رفعت عابدی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہا)

آپ کی محبت اور حکمت میرے رہنما ستارے رہے ہیں اور

ان سرپرستوں اور روحانی مربیوں کے نام جنہوں نے میر اراستہ روشن کیا، منزل کو واضح کیا۔۔۔

آیت اللہ سید حسین مرتضیٰ نقوی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے اہل خانہ، اور

حجۃ الاسلام والمسلمین سید غلام عباس رضوی (حسین آغا) حفظ اللہ تعالیٰ عنہ

نیز آیت اللہ شیخ شبیر حسن میثمی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید ظفر مہدی نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی سلمان نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ نور عالم، دامت توفیقاتہم

آپ حضرات کی تعلیمات نے زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھانے کے طریق واضح کیے،

میری پیاری بیوی سیدہ مہوش زہرہ، جن کی زحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کیلئے ایک مقالہ لکھنا پڑے،

اور میرے نوجوان بیٹے،

سید محمد حسین مہدی، مستقبل کی روشن کرنوں میں سے ایک کرن،
آپ سب کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی میرے سفر کو تیز کرتی ہے۔
میرے پورے خاندان کے لیے، لامتناہی طاقت اور محبت کا ذریعہ،
برادران حجۃ الاسلام سید شعیب عابدی، عدیل عابدی، مصطفیٰ عابدی،
بہنیں اسرا اور فرحین، اور میرے پیارے سسرالی، ماں اور باپ اور بہنیں،
اے خدا تو میرے وجود کی جڑ ہے، زندگی کے طوفانوں میں مجھے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے،
میرے ساتھ چلنے والے دوستوں اور خیر خواہوں کے نام،
آپ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میرے لیے باعث برکت ہے۔
عاجزی کے ساتھ، میں "ہم فکری سے ہم راہی تک" کتاب آپ سب کے نام کرتا ہوں۔
یہ کتاب یہ علمی و فکری لگن آپ میں سے ہر ایک کے لیے میری شکر گزاری اور پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ آپ سب میرے آسمان میں بالائی برج ہیں، زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت، حکمت اور تعاون اس کتاب کے صفحات میں بُنے ہوئے ہیں اور میں اس کام کی تشکیل میں آپ کے کردار کے لیے ہمیشہ مقروض ہوں۔
دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور اٹوٹ محبت کے ساتھ!

سید جہانزیب عابدی

فہرست

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ، جو ہمیں عقل اور فہم کے اس راستے پر لے کر آیا ہے، جو ہمیں اسلامی اصولوں اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کا مقصد، ہمارے دین کے ثبوتی دلائل کو فراہم کرنا ہے۔

یہ کتاب مستقل فکری محنت اور مشاہدے اور اصلاح کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ مضامین زندگی کے متفرق زندہ موضوعات پر مشتمل ہیں جو اس عرصے میں زیر قلم آئے، یہ ایک خود اونچ نیچ کا سفر ہے، جس میں میری زندگی کے مختلف مراحل کا تجربہ شامل ہے، جس نے میری فہم اور تجدید کو اضافی روشنی دی ہے۔

اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک خالص فکری کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس سے اختلاف کا حق اختلاف کی اہمیت اور احترام کے باعث روا ہے ہر ایک کے پاس خود کے خیالات اور رائے کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن، حدیث، تاریخ، علمیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، ابلاغیات، اور دیگر سماجی علوم کی موٹی موٹی باتوں کو متعدد مواقع پر پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان کو اپنی زندگی میں عمل میں لا سکیں۔

یہ کتاب خصوصی طور پر نوجوانوں کیلئے ہے، تاکہ وہ اس میں سے کام کی باتیں انتخاب کریں اور اپنے فکری جولان کو بڑھا سکیں۔ اس کتاب کی تیاری کے اسباب نے میری زندگی کو تبدیل کیا ہے، اور میری امید ہے کہ یہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی تبدیل کرے گی۔

کتاب میں جس جگہ مضامین دوسرے لکھاریوں سے لے کر اضافہ جات کیے ہیں یا ترجمہ کیے ہیں وہ مضمون میں عنوان کے ساتھ مشخص کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی امید کے ساتھ، میں آپ کو اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کتاب کو پڑھ کر، آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا راستہ تلاش کر سکیں گے اور اپنے اصولوں کو مضبوط کرنے میں کافی کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ

عابدی

zaib.abidi.pk@gmail.com

منافق، معتدل سیاستدان، اور انقلابی

منافق، معتدل سیاستدان، اور انقلابی تین مختلف شخصیتیں یا رویے ہیں جن کی بنیاد ان کی نیت، طریقہ کار، اور بنیادی اقدار پر ہوتی ہے۔ ان تینوں کے درمیان بنیادی فرق کو واضح طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

منافق وہ شخص ہوتا ہے جو بظاہر کسی عقیدے، اخلاقیات، یا اصول کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس پر حقیقت میں یقین نہیں رکھتا۔ اس کا عمل اس کے کہے گئے عقائد یا اقدار کے برخلاف ہوتا ہے۔ منافق کی اہم خصوصیات میں دھوکہ دہی کی نیت شامل ہے، جس کا مقصد ذاتی فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ جھوٹا تاثر دینے یا دوسروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں اخلاقی عدم استحکام پایا جاتا ہے، اس کی بات اور عمل میں تضاد ہوتا ہے، اور وہ عوامی طور پر کچھ اور کہتا ہے اور ذاتی طور پر اس کے برعکس عمل کرتا ہے۔ منافقت کا مقصد دوسروں کو گمراہ کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے مفاد کے لیے فائدہ اٹھا سکے۔ مثلاً، ایک ایسا لیڈر جو ایمانداری اور دیانتداری کا پرچار کرتا ہے، مگر خود کرپشن یا جھوٹ میں ملوث ہوتا ہے۔

معتدل سیاستدان وہ ہوتا ہے جو مختلف گروہوں، ممالک یا فریقین کے درمیان تعلقات کو بہتر انداز میں سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد تنازعات کو حل کرنا اور باہمی افہام و تفہیم پیدا کرنا ہوتا ہے۔ معتدل سیاستدان کی اہم خصوصیات میں مصلحت پسندی اور حکمت عملی شامل ہیں، وہ اپنے الفاظ اور طریقہ کار میں حکمت سے کام لیتا ہے اور مشترکہ بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ منافق کے برخلاف، حقیقی حل اور سمجھوتے کے لیے کام کرتا ہے اور امن، تعاون، اور باہمی افہام و تفہیم کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں اخلاص ہوتا ہے اور اس کا مقصد ہمیشہ فائدہ مند نتائج حاصل کرنا ہوتا ہے، دھوکہ دینا نہیں۔ مثلاً، ایک بین الاقوامی نمائندہ جو جنگ میں ملوث ممالک کے درمیان امن معاہدہ کراتا ہے اور دونوں فریقین کی ضروریات اور مفادات کا توازن برقرار رکھتا ہے۔

انقلابی وہ شخص ہے جو بڑے پیمانے پر تبدیلی لانا چاہتا ہے اور عام طور پر موجودہ نظام یا صورتحال کو چیلنج کرتے ہوئے تبدیلی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد سماجی، سیاسی یا ثقافتی نظام کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ انقلابی کی اہم خصوصیات میں تبدیلی کے لیے جذبہ شامل ہے، وہ شدید تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے اور موجودہ نظام کو ناانصافی یا غلط سمجھتے ہوئے اسے چیلنج کرتا ہے۔ انقلابی عام طور پر مقابلہ آرائی پر یقین رکھتا ہے اور سمجھوتے کو ناکافی سمجھتا ہے۔ وہ احتجاجات، بغاوت یا حتیٰ کہ تشدد کا بھی سہارا لیتا ہے اگر اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے

ضروری سمجھتا ہو۔ انقلابی عموماً اپنے نظریے کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں اور کسی درمیانی راستے کو قبول نہیں کرتے جو ان کے اہداف کے مطابق نہ ہو۔ مثلاً، ایک سیاسی کارکن جو ایک ظالم حکومت کے خلاف عوامی تحریک کی قیادت کرتا ہے اور نئے قوانین یا ڈھانچے کے نفاذ کا خواہاں ہوتا ہے۔

ان تینوں کرداروں میں نیت اور اقدار کا فرق واضح ہے۔ منافق کی نیت دھوکہ دہی پر مبنی ہوتی ہے اور وہ ذاتی مفاد کو حقیقی اقدار پر ترجیح دیتا ہے۔ معتدل سیاستدان باہمی افہام و تفہیم اور تنازعات کے حل کے لیے کام کرتا ہے اور امن و تعاون کو ترجیح دیتا ہے۔ انقلابی اپنے نظریات کے لیے شدید جذبہ رکھتا ہے اور بڑی تبدیلی لانے کا خواہاں ہوتا ہے۔ ان کے طریقہ کار میں بھی فرق ہے۔ منافق دھوکہ دہی اور جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، معتدل سیاستدان سمجھوتے اور مذاکرات کے ذریعے مسائل کو حل کرتا ہے اور انقلابی براہِ راست کارروائی اور مقابلہ آرائی کے ذریعے تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز، ان کا تنازعہ کے ساتھ تعلق بھی مختلف ہے۔ منافق تنازعہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، معتدل سیاستدان تنازعہ کو حل کرنے کے لیے شامل ہوتا ہے تاکہ پرامن اور مشترکہ حل تلاش کیے جا سکیں اور انقلابی تنازعہ کو تبدیلی کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور اسے بڑھانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ منافق کا کردار دھوکہ دہی پر مبنی ہوتا ہے، معتدل سیاستدان سمجھوتے اور مسائل کے حل پر کام کرتا ہے، اور انقلابی نظام میں بڑی تبدیلی لانے کے لیے مقابلہ آرائی کی راہ اپناتا ہے۔

اقتصادِ مقاومتی اور نجی زندگی

آیت اللہ خامنہ ای کے پیش کردہ تصور" معاشی مزاحمت "کو نجی یا انفرادی زندگی میں بھی اپنایا جا سکتا ہے تاکہ افراد اپنی معاشی زندگی کو مستحکم بنائیں، خود انحصاری حاصل کریں، اور بیرونی معاشی دباؤ سے محفوظ رہ سکیں۔ نجی زندگی میں مزاحمتی معیشت کے اصولوں کو اپنانا ایک پائیدار اور خود کفیل طرز زندگی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

انفرادی زندگی میں مزاحمتی معیشت کے اصول اپنانے کے چند اہم طریقے یہ ہیں:

مالی خود کفالت اور بچت ایک اہم اصول ہے جس کے ذریعے افراد اپنی آمدنی کو سمجھداری سے استعمال کرتے ہیں اور غیر ضروری اخراجات سے بچتے ہیں۔ مالی خود کفالت کا مطلب یہ ہے کہ افراد اپنی آمدنی کا ایک حصہ بچت کے لیے مختص کریں اور مستقبل کے لیے اسے محفوظ رکھیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ماہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ بچت کے لیے مختص کریں، غیر ضروری اخراجات سے اجتناب کریں، اور ایسی مالی حکمت عملی اپنائیں جو آپ کو مستقبل میں مالی تحفظ فراہم کرے۔

سادگی اور اعتدال مزاحمتی معیشت کا ایک اور بنیادی اصول ہے۔ غیر ضروری تعیشات سے بچنا اور سادہ طرز زندگی اپنانا معاشی استحکام کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں سادگی اپنائیں، اضافی فضول خرچی سے گریز کریں، اور اپنی ضروریات کو محدود کریں تاکہ آپ اپنی مالی صورتحال کو مستحکم کر سکیں۔

خود انحصاری اور مقامی مصنوعات کا استعمال بھی اس تصور کا حصہ ہے۔ مزاحمتی معیشت کے اصول کے مطابق اپنی ضروریات کو مقامی وسائل سے پورا کرنے کی کوشش کرنا اور مقامی مصنوعات کو ترجیح دینا اہم ہے۔ اس طرح نہ صرف اپنی معیشت مضبوط ہوتی ہے بلکہ مقامی معیشت کو بھی فروغ ملتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر ملکی مصنوعات پر انحصار کم کریں، مقامی مصنوعات خریدیں، اور جہاں ممکن ہو اپنے ہاتھوں سے چیزیں بنائیں یا مقامی وسائل کا استعمال کریں۔

مزاحمتی معیشت کے تحت علم اور فنی مہارتیں حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ علمی اور فنی مہارتیں معاشی حالت بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اپنی تعلیمی اور فنی صلاحیتوں کو بہتر بنائیں، نئے ہنر سیکھیں، اور ان شعبوں میں مہارت حاصل کریں جو مالی خود مختاری اور استحکام کے لیے اہم ہیں۔

سماجی تعاون اور ہم آہنگی بھی مزاحمتی معیشت کے اصولوں میں شامل ہیں۔ سماجی تعاون اور دوسروں کی مدد سے معاشی مشکلات سے نمٹنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس

کے لیے ضروری ہے کہ اپنے معاشرے کے ساتھ مل کر کام کریں، مشترکہ مسائل کے حل کے لیے تعاون کریں، اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں تاکہ پورے معاشرے کی معیشت مضبوط ہو۔

ماحول دوست طرز زندگی اپنانا بھی مزاحمتی معیشت کا ایک اہم اصول ہے۔ پائیدار ترقی اور ماحولیاتی تحفظ نجی زندگی میں بھی اہم ہے۔ ماحول دوست طرز زندگی اپنانے سے نہ صرف ماحول کی حفاظت ہوتی ہے بلکہ اس کے معاشی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے لیے توانائی کی بچت، پانی کے ضیاع کو کم کرنا، اور ماحول دوست مصنوعات کا استعمال اہم ہے تاکہ آپ کے وسائل ضائع نہ ہوں۔

خوراک میں خود کفالت بھی مزاحمتی معیشت کا حصہ ہے۔ اگر ممکن ہو تو اپنی خوراک خود پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ گھر میں سبزیاں اگائیں یا مقامی خوراکی وسائل کا استعمال کریں۔ اپنے صحن یا چھت پر سبزیاں اگائیں، باغبانی سیکھیں، اور خوراک میں خود انحصاری حاصل کریں۔

اخلاقی اور دینی تربیت بھی مزاحمتی معیشت کا ایک اہم پہلو ہے۔ مالی معاملات کو اسلامی تعلیمات کے مطابق منظم کریں، دیانتداری سے کام کریں، اور حلال ذرائع سے روزی کمائیں۔ مالی معاملات میں دیانتداری اور شفافیت کو اپنائیں، حلال روزگار کو ترجیح دیں، اور مالی فیصلے اسلامی اصولوں کے مطابق کریں۔

مزاحمتی معیشت کے اصول نجی زندگی میں اپنانے سے نہ صرف انفرادی مالی استحکام اور خود کفالت حاصل ہوتی ہے بلکہ معاشرتی استحکام میں بھی کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔ جب افراد خود کفیل اور مالی طور پر مضبوط ہوتے ہیں تو پورا معاشرہ معاشی طور پر مضبوط ہوتا ہے، جس سے بیرونی دباؤ اور پابندیوں کا مقابلہ آسان ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ مزاحمتی معیشت کا مقصد نجی زندگی میں سادگی، خود انحصاری، اور علم و مہارت کے حصول کے ذریعے اپنے معاشی حالات کو مستحکم بنانا ہے تاکہ انفرادی اور معاشرتی سطح پر معاشی چیلنجز کا کامیابی سے سامنا کیا جا سکے۔

جدید اسلامی تمدن

آیت اللہ خامنہ ای کا تصور" تمدن نوین اسلامی "یعنی" نئ اسلامی تہذیب "ایک ایسی فکر ہے جو اسلامی دنیا کو دوبارہ زندہ کرنے اور اسلامی اصولوں پر مبنی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو جدید دنیا کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہو۔ اس تصور کے مطابق، اسلامی تہذیب کا نیا دور اس وقت ہی ممکن ہے جب مسلمان اپنی علمی، فکری اور عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک جدید اور مضبوط اسلامی معاشرہ قائم کریں جو نہ صرف دینی اصولوں اور اخلاقیات میں بلکہ سائنس، ٹیکنالوجی اور موجودہ فکری ترقیات میں بھی نمایاں ہو۔

نئ اسلامی تہذیب کے چند اہم نکات یہ ہیں:

نئ اسلامی تہذیب کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں اسلامی اقدار جیسے عدل، انصاف، اخلاق اور انسانیت کی بھلائی کو اولین ترجیح دی جائے۔ اس معاشرتی ترقی کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہوگی اور یہ دنیاوی کامیابی کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی کامیابی کے لیے معاون ہوگی۔

اس اسلامی تہذیب کے نئے دور میں علم اور تحقیق کو مرکزی حیثیت دی جائے گی۔ آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق، مسلم اقوام کو چاہیے کہ وہ سائنسی اور تحقیقی ترقی کو فروغ دیں تاکہ جدید علم کے میدان میں خود کفیل ہو سکیں اور دنیا کی اقوام کے درمیان عزت اور مقام حاصل کر سکیں۔

نئی اسلامی تہذیب کے تحت مسلم ممالک کو اپنی سیاسی خودمختاری کو برقرار رکھنا ہو گا اور بیرونی طاقتوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا ہوگی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آزاد اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں جو عالمی سطح پر اسلامی امت کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق، نئی اسلامی تہذیب میں اقتصادی خودکفالت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنے وسائل اور توانائی کو مؤثر طریقے سے استعمال کریں، بیرونی امداد پر انحصار کو کم کریں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوں تاکہ ان کی معیشت مضبوط ہو سکے۔

نئی اسلامی تہذیب کے دور میں اسلامی ثقافت کو زندہ کیا جائے گا تاکہ مسلمان اپنی ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر فخر کر سکیں اور اسے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس ثقافتی احیاء کا مقصد اسلامی شناخت کو مضبوط بنانا ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای نئی اسلامی تہذیب کے اہم عنصر کے طور پر اسلامی دنیا میں اتحاد اور یکجہتی کے فروغ کو دیکھتے ہیں۔ مسلم ممالک اور افراد کو فرقہ واریت اور تفرقہ بازی سے بچنا چاہیے اور متحد امت کا تصور اپنانا چاہیے تاکہ وہ دنیا میں ایک طاقتور قوم بن سکیں۔

نئی اسلامی تہذیب کے دور میں افراد اور معاشرے کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر زور دیا جائے گا۔ آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق، اسلامی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کو زندگی کا حصہ بنانا اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے۔

نئی اسلامی تہذیب کے تصور کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عالمی سطح پر ایک بااثر، خودمختار اور مضبوط امت بن سکیں۔ یہ تصور مسلمانوں کو ان کے اسلامی ورثے کی طرف واپس آنے کی دعوت دیتا ہے اور انہیں جدید دنیا کی ضروریات کے مطابق ترقی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس نئی اسلامی تہذیب کا مقصد دنیا کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنا اور ایک ایسے معاشرے کی تعمیر ہے جو انسانی فلاح، عدل اور ترقی کا مظہر ہو۔

مختصراً، نئی اسلامی تہذیب آیت اللہ خامنہ ای کا ایک جامع وژن ہے جس کا مقصد ایک ایسا جدید اسلامی معاشرہ قائم کرنا ہے جو علمی، معاشی اور ثقافتی طور پر خودکفیل ہو اور اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔

اقتصادِ مقاومتی اور معاشرہ

آیت اللہ خامنہ ای کا تصور" اقتصادِ مقاومتی "ایک اقتصادی نظریہ ہے جس کا مقصد داخلی معیشت کو مضبوط بنانا اور اسے بیرونی دباؤ سے محفوظ رکھنا ہے۔ یہ تصور عالمی معاشی نظام اور بیرونی پابندیوں کے چیلنجز کے پیشِ نظر پیش کیا گیا، تاکہ اسلامی ممالک، خاص طور پر ایران، اپنی معیشتوں کو خود کفیل بنا سکیں اور دشمنانِ اسلام کی جانب سے عائد کردہ معاشی پابندیوں کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

اقتصادِ مقاومتی کے مطابق یہ ایک ایسا اقتصادی نظام ہے جو بیرونی دباؤ، پابندیوں اور معاشی جنگ کے باوجود کسی ملک کی معیشت کو مستحکم اور ترقی یافتہ بنا سکتا ہے۔ اس نظام کا مقصد ملکی وسائل کو بہتر طور پر استعمال کرنا اور داخلی پیداوار کو فروغ دینا ہے، تاکہ ملک اپنی ضروریات کو خود پورا کر سکے۔

اقتصادِ مقاومتی کی ایک نمایاں خصوصیت خود کفالت اور داخلی پیداوار کا فروغ ہے۔ اس نظام کے تحت ملکی وسائل اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معیشت کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے، جس سے بیرونی درآمدات پر انحصار کم ہو جاتا ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای کے نزدیک علمی اور فکری میدانوں میں خود کفالت اقتصادی ترقی کے لیے نہایت اہم ہے۔ اقتصادِ مقاومتی میں تحقیق و ترقی کو فروغ دینا اور جدید سائنسی علوم کو اپنانا ضروری ہے تاکہ جدت طرازی اور معاشی ترقی حاصل ہو سکے۔اقتصادِ مقاومتی میں قومی وسائل کے درست اور مؤثر استعمال پر زور دیا گیا ہے۔ اس نظریے کے تحت ملکی قدرتی، انسانی اور مالی وسائل کو بہترین انداز میں استعمال کرنے پر زور دیا گیا ہے تاکہ معیشت خود کفالت کی راہ پر گامزن ہو سکے۔اس نظام کے تحت ایک اہم مقصد درآمدات پر انحصار کو کم کرنا اور مقامی مصنوعات کو فروغ دینا ہے۔ اس سے مقامی صنعتوں کی ترقی ہو گی اور ملکی معیشت کو تقویت ملے گی۔

آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق، اقتصادِ مقاومتی کا مقصد بیرونی معاشی پابندیوں اور دباؤ کا مقابلہ کرنا ہے۔ ایک مضبوط معیشت وہ ہے جو بیرونی طاقتوں کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کے اثرات کا سامنا کر سکے اور ترقی کے سفر پر گامزن رہے۔اقتصادِ مقاومتی میں عوامی شرکت کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ عوام کو مختلف شعبہ جات میں شرکت کی ترغیب دی جاتی ہے جس سے قومی معیشت کو استحکام ملتا ہے اور لوگوں میں خود کفالت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای کے مطابق، اقتصادِ مقاومتی میں اسراف اور فضول خرچی کی مذمت کی گئی ہے اور اعتدال پسندی کو فروغ دیا گیا ہے۔ معیشت کو مستحکم رکھنے

کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں فضول اور غیر ضروری اخراجات سے بچا جائے۔

اقتصادِ مقاومتی کے تصور میں ملکی مصنوعات کی برآمدات کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔ برآمدات میں اضافہ ملکی آمدنی کو بڑھاتا ہے اور عالمی سطح پر معیشت کو مضبوط بناتا ہے۔

اس نظریے میں عدل و انصاف کا قیام بھی ضروری ہے۔ اس تصور میں معیشت میں دولت کی منصفانہ تقسیم اور غربت و معاشرتی ناہمواریوں کا خاتمہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔اقتصادِ مقاومتی میں پائیدار ترقی پر زور دیا گیا ہے تاکہ اقتصادی ترقی ایسے انداز میں ہو جس سے ماحولیاتی اثرات کا خیال رکھا جائے اور آئندہ نسلوں کے لیے وسائل محفوظ رہ سکیں۔

آیت اللہ خامنہ ای کے تصورِ اقتصادِ مقاومتی کا مقصد اسلامی ممالک، خصوصاً ایران کی معیشت کو مضبوط بنانا ہے، تاکہ وہ بیرونی دباؤ، پابندیوں اور معاشی جنگ کے باوجود ترقی کر سکیں۔ اس نظریے کا مرکز معاشی خود کفالت، داخلی پیداوار اور قومی وسائل کا مؤثر استعمال ہے، تاکہ معیشت کو داخلی اور خارجی خطرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

مختصر یہ کہ اقتصادِ مقاومتی ایک جامع اقتصادی تصور ہے جسے آیت اللہ خامنہ ای نے داخلی معیشت کو مضبوط بنانے اور بیرونی پابندیوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے پیش کیا۔ خود کفالت، علمی ترقی، وسائل کا بہترین استعمال اور عوامی شرکت کے ذریعے معیشت کو مستحکم اور ترقی یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔

خود ساختہ انحصاریت

امپیریل طاقتیں نہ صرف موجودہ ضروریات کے استحصال کے ذریعے انحصار پیدا کرتی ہیں بلکہ ایسے مسائل اور حالات کو بھی فعال طور پر تخلیق کرتی ہیں جو مزید انحصار کو مضبوط کرتے ہیں۔ یہ حکمت عملی اس طرح سے تیار کی گئی ہیں کہ پہلے کسی ضرورت کو پیدا یا بڑھایا جائے اور پھر اپنے آپ کو واحد حل کے طور پر پیش کیا جائے۔ ان مختلف شعبوں میں یہ حکمت عملی یوں کارفرما ہوتی ہے:

صحت اور طب :

امپیریل طاقتیں اور بین الاقوامی ادویہ ساز کمپنیاں بعض اوقات بیماریوں کے پھیلاؤ یا آبادی کو بیماریوں کا شکار بنانے میں ملوث ہوتی ہیں۔ یہ مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے، جیسے صنعتی منصوبوں کی وجہ سے آلودگی، ناقص عوامی صحت کے انفراسٹرکچر، یا غیر صحت مند طرز زندگی کا فروغ۔ جب یہ مسائل ابھرتے ہیں تو انہی طاقتوں کے کنٹرول میں ادویات یا ویکسین کی فراہمی ہوتی ہے، اور انہیں مہنگے داموں فروخت کیا جاتا ہے، جس سے متاثرہ آبادی ان پر منحصر ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی، ان ادویہ ساز کمپنیوں کی طرف سے سستی ادویات یا عام دواؤں

کو روکا جاتا ہے، جس سے افراد کو مغربی کمپنیوں کی ادویات پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

تعلیم :

نیولبرل تعلیمی نظام کے نفاذ سے، جس میں مغربی حکومتیں اور بین الاقوامی کمپنیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں، تعلیم کو ایک ایسے ذریعہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے جو لوگوں کو کمپنیوں کے لیے کام کرنے والے بناتا ہے۔ اس نظام میں طلباء کو تنقیدی سوچ، اخلاقی اقدار اور سماجی ذمہ داری کے بجائے ایسے ہنر سکھائے جاتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی، مقامی علمی نظام کو نظرانداز کر کے اسے مغربی نصاب سے بدل دیا جاتا ہے، جس سے افراد کو مقامی مسائل کے حل کے قابل بنانے کے بجائے مغربی کمپنیوں کے لیے کارکنوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

خوراک اور زراعت :

مغربی کمپنیاں اکثر مخصوص فصلوں کی کاشت کو فروغ دیتی ہیں جو مغربی ممالک کی مارکیٹوں کے لیے زیادہ فائدہ مند ہوتی ہیں، جیسے کہ کافی، کپاس اور پام آئل، بجائے اس کے کہ مقامی آبادی کے لیے خوراک کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔ نتیجتاً، یہ ممالک بنیادی غذائی اشیاء درآمد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور قیمتوں میں اتار

چڑھاؤ کے زیر اثر رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ، مغربی غذائی کمپنیاں بازار میں پروسیسڈ غذائیں متعارف کرواتی ہیں، جو اکثر غیر صحت بخش ہوتی ہیں، جس سے مقامی لوگوں کو صحت کے مسائل میں مبتلا کر کے انہیں مغربی ادویات پر انحصار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

ٹیکنالوجی اور جدت :

مغربی کمپنیاں پیٹنٹس اور ذہنی املاک پر کنٹرول رکھ کر ترقی پذیر ممالک کو خود اپنی تکنیکی ترقی سے محروم کر دیتی ہیں، جس سے یہ ممالک بیرونی ممالک سے مہنگی ٹیکنالوجی خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ، تعلیمی نظام میں مقامی طور پر نئے تکنیکی حل تیار کرنے کے بجائے مغربی ٹیکنالوجی کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے، جس سے یہ ممالک مغربی ٹیکنالوجی پر انحصار کرتے ہیں۔

معیشت اور محنت :

عالمی مالیاتی ادارے جیسے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ترقی پذیر ممالک پر مالیاتی پابندیاں عائد کرتے ہیں جن سے انہیں صحت، تعلیم اور سماجی خدمات میں کٹوتی کرنا پڑتی ہے۔ اس سے مقامی معیشت کمزور ہوتی ہے اور حکومتیں بیرونی امداد پر منحصر ہو جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ، ان ممالک کو برآمدی معیشت پر مجبور

کر کے غربت کے دائرے میں رکھا جاتا ہے، جہاں انہیں بیرونی سرمایہ کاری اور مالی امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

میڈیا اور ثقافت :

مغربی میڈیا کمپنیاں ایسا مواد پیش کرتی ہیں جو مقامی ثقافتوں کو مٹا کر مغربی طرز زندگی کو فروغ دیتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ترقی پذیر ممالک میں لوگ مغربی اقدار اور مصنوعات کو اپنانے کی خواہش رکھتے ہیں، جس سے ثقافتی انحصار پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح لوگ مغربی مصنوعات خریدنے کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور قرضوں میں جکڑے جاتے ہیں۔

مذہبی اور نظریاتی کنٹرول :

مغربی طاقتیں جان بوجھ کر مذہبی اور نسلی فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہیں جس سے معاشرہ کمزور ہوتا ہے اور اس میں غیر ملکی مداخلت کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ ساتھ ہی، مغربی ممالک ان مذاہب کو فروغ دیتے ہیں جو مغربی اقدار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، تاکہ مزاحمتی مذہبی قیادت کو کمزور کر دیا جائے۔

سماجی انجینئرنگ :

مغربی طاقتیں حکومتوں کو مغربی مفادات کے تابع کر کے ان کے اندرونی معاملات کو کنٹرول میں رکھتی ہیں، اور معاشرے میں فرقہ واریت اور قومیت کے فروغ سے اندرونی تضادات کو بڑھا کر لوگوں کو مغرب پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

ماحولیاتی اور وسائل کا کنٹرول :

مغربی کمپنیاں ترقی پذیر ممالک میں ماحول کو تباہ کرتی ہیں، جیسے کہ جنگلات کی کٹائی، پانی کی آلودگی وغیرہ۔ جب ماحولیاتی تباہی ہوتی ہے تو وہ امداد اور انفراسٹرکچر کے نام پر مداخلت کرتے ہیں اور ان پر انحصار بڑھاتے ہیں۔ مزید یہ کہ، مغربی طاقتیں اہم قدرتی وسائل پر کنٹرول رکھ کر مقامی معیشت کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔

سیکیورٹی اور نگرانی :

مغربی طاقتیں ترقی پذیر ممالک میں سلامتی کے خدشات کو بڑھاوا دیتی ہیں اور ان ممالک کو اسلحہ اور نگرانی کے نظام بیچ کر ان کی سلامتی کو اپنے کنٹرول میں رکھتی ہیں۔ اس طرح یہ ممالک مقامی طور پر اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہتے اور مغربی افواج پر انحصار کرتے ہیں۔

قانونی اور ادارتی انحصار :

مغربی ممالک قانونی ڈھانچے اور تجارتی معاہدوں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے قوانین پر قبضہ کرتے ہیں، جس سے ان ممالک کو اپنی صنعتوں اور ملازمین کی حفاظت کے قابل نہیں رہنے دیا جاتا۔ ساتھ ہی، مقامی حکومتوں کو ان کی عوامی خدمات کو نجی ملکیت میں دینے پر مجبور کیا جاتا ہے، جس سے انحصار بڑھتا ہے۔

توانائی اور بنیادی ڈھانچے کا انحصار :

مغربی ممالک ترقی پذیر ممالک کو تیل اور دیگر مضر ذرائع پر منحصر کرتے ہیں، جس سے یہ ممالک توانائی کے متبادل ذرائع کی ترقی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انفراسٹرکچر منصوبوں میں قرض دے کر انہیں مغربی کمپنیوں پر انحصار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

مالیاتی نظام اور کرنسی کا کنٹرول :

ترقی پذیر ممالک کو مغربی مالیاتی نظام سے جوڑ کر ان کی معیشت کو غیر مستحکم کیا جاتا ہے، اور ان کی کرنسیوں کو غیر ملکی ریزرو پر منحصر کر دیا جاتا ہے، جس سے یہ ممالک عالمی مالیاتی منڈیوں پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔

نفسیاتی اور سماجی انحصار :

مغربی طاقتیں میڈیا اور ثقافتی اثرات کے ذریعے ترقی پذیر ممالک میں احساس کمتری پیدا کرتی ہیں اور مقامی ثقافتوں کو کمزور کر کے نفسیاتی انحصار پیدا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی، سماجی تقسیم کو فروغ دے کر اجتماعی مزاحمت کو روک دیا جاتا ہے۔

ماحولیاتی تبدیلی اور وسائل کا استحصال :

مغربی ممالک صنعتی آلودگی کے ذریعے ماحولیاتی تبدیلیوں میں کردار ادا کرتے ہیں اور ترقی پذیر ممالک کو ان تبدیلیوں کے اثرات سے نمٹنے کے لیے مغربی امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ترقی پذیر ممالک بیرونی مداخلت کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

نتیجہ : امپیریل طاقتیں جان بوجھ کر ماحول، معیشت، تعلیم اور صحت جیسے شعبوں میں مسائل پیدا کرتی ہیں، تاکہ ترقی پذیر ممالک ان کے حل پر انحصار کرتے رہیں۔ ان کی یہ حکمت عملی معاشی، سیاسی اور ثقافتی طور پر کنٹرول کو برقرار رکھنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے، جس سے یہ ممالک خود انحصاری سے دور اور مغربی طاقتوں کے زیر اثر رہتے ہیں۔

ولی کی خصوصیات

اسلامی تعلیمات کے مطابق معاشرے کا حقیقی حاکم وہی شخص ہو سکتا ہے جو اللہ کے احکامات اور رہنمائی کا علمبردار ہو اور جو خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی قیادت کے ذریعے معاشرتی نظام کو منظم و متحرک کرے۔ ایسے حاکم کو اللہ کا ولی یا اللہ کا مقرر کردہ نمائندہ کہا جاتا ہے، جو خود کو ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف اللہ کی رضا اور معاشرتی فلاح کے لیے وقف کرتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر میں یہ ولی معاشرے کی تمام قوتوں، سرگرمیوں اور تحریکات کا مرکز ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک محور کی سی ہوتی ہے جس پر معاشرے کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں مرکوز ہوتی ہیں۔ اس کی رہنمائی سے معاشرے کے تمام طبقات اور افراد ایک سمت میں یکجا ہو کر اجتماعی ترقی اور بھلائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہی تمام احکام و فرامین جاری کرتا ہے، اور معاشرتی زندگی کے مختلف شعبہ جات کو منظم و متحرک کرتا ہے۔ اس کے احکام اللہ کے احکام سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، اور اس کے فیصلے اللہ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کے فرامین میں حق اور عدل کی عکاسی ہوتی ہے، اور یہ معاشرتی انصاف کے قیام کا سبب بنتے ہیں۔

ایسا حاکم لوگوں کے دلوں میں اپنے بلند کردار، عدل و انصاف اور تقویٰ کی بنا پر جگہ بناتا ہے۔ وہ کسی جبر یا زبردستی سے نہیں بلکہ اپنی روحانی عظمت، اخلاقی برتری اور اللہ سے قربت کے سبب لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کی قیادت میں معاشرہ امن و امان اور ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے، کیونکہ لوگ اسے اللہ کا نمائندہ جان کر اپنی اطاعت اس کے لیے خاص کر دیتے ہیں۔ اس کے احکامات اور فیصلے سب پر لازم ہوتے ہیں، اور ان کی پیروی میں دنیاوی اور اخروی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔

ایسا معاشرہ اللہ کی ولایت کے زیر سایہ چلتا ہے اور اللہ کے منصوبہ بند احکام کی پیروی کرتا ہے۔ معاشرے کے تمام طبقات اسی حاکم کی طرف دیکھتے ہیں، اسی کی رہنمائی پر انحصار کرتے ہیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسی کے ذریعے درست سمت میں استوار کرتے ہیں۔ ایسی قیادت معاشرے میں اصلاح اور انقلاب کی ضامن ہوتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے معاشرتی برائیوں، ظلم اور زیادتیوں کا خاتمہ ہوتا ہے، اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حقیقی معنوں میں اسلامی کہلاتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں اللہ کا ولی یا اللہ کے مقرر کردہ حاکم کا مقام محض انتظامی یا سیاسی قیادت سے بڑھ کر ہے۔ اس کی حیثیت ایک روحانی رہنما، مصلح، اور اخلاقی اصولوں کا محافظ کی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے معاشرتی اقدار، اخلاقی روایات اور

دینی تعلیمات کی حفاظت کی جاتی ہے، اور وہ معاشرے کے افراد کو ایک مخصوص طرز زندگی کی طرف گامزن کرتا ہے جس میں اللہ کی رضا اور اسلامی اصولوں کی پیروی کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔

اسلامی حاکم کا مقصد صرف حکمرانی کرنا نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی فلاح و بہبود کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں عدل، مساوات، اور امن کے اصولوں کو نافذ کرتا ہے اور لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ایسا حاکم اللہ کی جانب سے ذمہ دار ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف لوگوں کی دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے بلکہ ان کے روحانی اور اخروی امور کی بھی رہنمائی کرے۔

اس کے کردار اور عمل میں ہدایت، شرافت، اور تقویٰ کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ معاشرے میں اصلاحات کے ذریعے اللہ کے احکام کے مطابق انصاف اور امن کا نظام قائم کرتا ہے۔ معاشرتی مسائل، غربت، بے انصافی اور دیگر برائیوں کے خاتمے کے لیے وہ حکمت عملی ترتیب دیتا ہے اور ایسے نظام کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے جو انسانوں کو انصاف، امن اور اخوت کی فضا فراہم کر سکے۔

اللہ کے ولی کا کردار صرف قوانین کے نفاذ تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگوں کو خود آگاہی، ذمہ داری اور بلند اخلاق کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس کی رہنمائی میں افراد اپنی ذاتی زندگی کو بھی اللہ کی رضا کے مطابق گزارنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ اس طرح، ایک اسلامی معاشرہ نہ صرف ظاہری طور پر مضبوط ہوتا ہے بلکہ اس کے افراد باطنی طور پر بھی پاکیزگی اور تقویٰ کے حامل ہوتے ہیں۔

اللہ کے ولی کی موجودگی میں معاشرہ حقیقی طور پر اسلامی بنتا ہے، جہاں کے افراد اپنی زندگیوں کا محور دین کو بنا لیتے ہیں اور دنیاوی فلاح و بہبود کو دینی اصولوں کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کے ہر پہلو میں اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق پورا کرتے ہیں، اور یہی ان کی کامیابی کا راز بن جاتا ہے۔

ایسا معاشرہ نہ صرف خود مضبوط اور خود مختار ہوتا ہے بلکہ دیگر اقوام کے لیے بھی ایک قابل تقلید مثال بنتا ہے۔ یہ اسلامی نظام کی روح ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرتی نظام کی تشکیل کرے جہاں عدل و انصاف، امن، اور بھلائی کا بول بالا ہو، اور جہاں ہر فرد کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق استوار کرنے کا موقع ملے۔

کرپشن زدہ معاشرہ اور فردی زندگی

ایسے ممالک میں جہاں معیشت بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے چنگل میں پھنسی ہو اور قیادت میں بدعنوانی ہو، وہاں عوام کے لیے معاشی خود کفالت اور خوشحالی کا حصول ایک مشکل لیکن ممکنہ ہدف ہے۔ اس کے لیے فرد اور معاشرے کو مل کر کوشش کرنی ہوگی تاکہ بیرونی قرضوں اور بدعنوان نظام پر انحصار کم ہو اور خود انحصاری کی طرف بڑھا جا سکے۔

معاشرتی اور انفرادی سطح پر معاشی خود کفالت کے حصول کے لیے ضروری اقدامات:

1۔ تعلیم اور تکنیکی مہارتوں کا فروغ:

- وضاحت: انفرادی اور معاشرتی سطح پر تعلیم اور تکنیکی مہارتوں کا فروغ انتہائی اہم ہے۔ تعلیم افراد کو معاشی مواقع سے بہتر فائدہ اٹھانے کے قابل بناتی ہے، جبکہ تکنیکی مہارتوں کا حصول خود انحصاری میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

- عملی قدم: حکومت، نجی ادارے اور غیر سرکاری تنظیمیں پیشہ ورانہ تعلیم اور تربیت کے پروگرام شروع کریں تاکہ نوجوان مہارتیں حاصل کرکے روزگار حاصل کر سکیں۔ پیشہ ورانہ تربیت کو اسکول کے نصاب کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔

2۔ مقامی پیداوار اور صنعتوں کا فروغ:

- وضاحت :مقامی صنعتوں اور کاروبار کو فروغ دینا قومی معیشت میں خود کفالت حاصل کرنے اور عوام کو روزگار فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

- عملی قدم :مقامی پیداوار کو فروغ دینے کے لیے عوام کو کاروباری مہارتوں کی تربیت دی جائے اور حکومت کو چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے آسان قرضے فراہم کرنے چاہئیں۔

3۔ زرعی ترقی اور غذائی خود کفالت:

- وضاحت :پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور زرعی ترقی کے ذریعے غذائی خود کفالت حاصل کرنا ممکن ہے۔ جدید زرعی تکنیکوں کے استعمال اور کسانوں کی تربیت سے معیشت کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔

- عملی قدم :کسانوں کو جدید زرعی تکنیکوں کی تربیت دی جائے، پانی کے مؤثر استعمال کے لیے اقدامات کیے جائیں اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے حکومت کی حمایت فراہم کی جائے۔

4۔ بچت اور سادہ طرز زندگی:

- وضاحت :افراد کو غیر ضروری اخراجات سے بچنے کے لیے سادہ طرز زندگی اپنانا چاہیے اور بچت پر توجہ دینی چاہیے۔ بچت سے فرد کو مالی استحکام حاصل ہو گا جو معاشرتی سطح پر بھی مثبت اثرات ڈالے گا۔

- عملی قدم :عوام کو مالی منصوبہ بندی اور بچت کے فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ میڈیا سادگی کو فروغ دے اور فضول خرچی کے نقصانات کو اجاگر کرے۔

5۔ سماجی تعاون اور مشترکہ منصوبے:

- وضاحت :سماجی تعاون اور یکجہتی کے ذریعے مشترکہ منصوبے شروع کیے جا سکتے ہیں جو معاشی ترقی کا سبب بنیں۔ معاشرتی سطح پر سرمایہ کاری اور کاروباری منصوبے شروع کرنا سماجی خود کفالت کی طرف ایک قدم ہو سکتا ہے۔

- عملی قدم :کمیونٹی کی سطح پر کاروباری تنظیمیں قائم کی جائیں جہاں افراد اپنی سرمایہ کاری جمع کرکے کاروبار شروع کر سکیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ کمیونٹی بینکوں اور کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا قیام بھی ایک مثبت قدم ہو سکتا ہے۔

6۔ بدعنوانی کے خلاف عوامی شعور:

- وضاحت :عوام کو بدعنوان نظام کے خلاف شعور اور آگاہی دینا ضروری ہے۔ لوگوں کو بدعنوانی کے نقصانات کو سمجھنا ہوگا اور یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کے خاتمے سے قومی معیشت مضبوط ہو سکتی ہے۔

- عملی قدم :بدعنوانی کے خلاف عوامی مہمات چلائی جائیں، ایمانداری کو فروغ دیا جائے اور حکومتی اداروں میں شفافیت کے مطالبات کیے جائیں۔

7۔ مالی منصوبہ بندی اور تنظیم:

- وضاحت :انفرادی سطح پر مالی منصوبہ بندی اور تنظیم ضروری ہے تاکہ افراد اپنی آمدنی کو بہتر طریقے سے سنبھال سکیں اور اپنے مالی حالات کو مضبوط کر سکیں۔

- عملی قدم :افراد کو مالی منصوبہ بندی میں تربیت دی جائے، بینکاری نظام سے آگاہ کیا جائے اور بہتر مالی تنظیم سیکھنے کے اقدامات کیے جائیں۔

8۔ چھوٹے منصوبوں کے ذریعے خود کفالت:

- وضاحت :افراد کو چھوٹے پیمانے کے خود کفالت منصوبے شروع کرنے کی ترغیب دی جانی چاہیے، جیسے کہ گھریلو سطح پر سبزیاں اگانا، مویشی پالنا، یا چھوٹا کاروبار شروع کرنا۔

- عملی قدم :حکومت اور غیر سرکاری تنظیمیں ایسے چھوٹے منصوبے شروع کریں جو افراد کو خود انحصار بنا سکیں۔ چھوٹے قرضے اور تکنیکی مدد فراہم کی جانی چاہیے۔

خوشحال زندگی کے لیے ضروری معاشی مہارتیں:

1۔ مالی منصوبہ بندی کی مہارتیں :بہتر آمدنی اور اخراجات کی منصوبہ بندی، بچت، اور سرمایہ کاری کی حکمت عملیوں کا سیکھنا۔

2۔ کاروباری مہارتیں :کاروبار شروع کرنے، مارکیٹنگ اور مالی انتظام کی مہارتیں۔

3۔ زرعی مہارتیں :جدید زرعی تکنیکوں کے استعمال اور فصلوں کی پیداوار بڑھانے کی مہارتیں۔

4۔ تکنیکی مہارتیں : تکنیکی اور دستکاری کے شعبوں میں مہارتیں جو روزگار کے حصول میں مددگار ہوں۔

.5پائیدار ترقی کی مہارتیں :ماحول دوست طرز زندگی اپنانے اور وسائل کا مؤثر استعمال کرنے کی مہارتیں۔

معاشرتی اور انفرادی سطح پر معاشی خود کفالت کا حصول ممکن ہے اگر افراد خود انحصاری کی طرف بڑھیں اور سماجی تعاون کو فروغ دیں۔ تعلیم، تکنیکی مہارتیں، مقامی صنعتوں کا فروغ اور بدعنوانی کے خلاف شعور خود کفالت کے حصول کے اہم عوامل ہیں۔ اس طرح پاکستان جیسے ممالک کے عوام اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور بدعنوان نظام کے چنگل سے خود کو آزاد کر سکتے ہیں۔

مغربی معاشروں میں کرپشن

مغربی معاشروں میں کرپشن ایک پیچیدہ اور گہرا مسئلہ ہے جو سیاسی، معاشی، اور سماجی ڈھانچوں کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ اس کی نوعیت اور اثرات وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے ہیں، اور یہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ مغربی معاشروں میں کرپشن کی شرح دیگر خطوں کے مقابلے میں کم سمجھی جاتی ہے، مگر اس کا وجود ان معاشروں کی بنیادی ساخت کو کمزور کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں سماجی، اخلاقی، اور معاشی اختلال پیدا ہوتا ہے۔

مغربی معاشروں میں سیاسی کرپشن ایک اہم مسئلہ ہے جو اکثر پوشیدہ اور منظم ہوتی ہے۔ بڑی کارپوریشنز اور بااثر افراد لابنگ اور مالی عطیات کے ذریعے سیاسی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انتخابی عمل میں بھاری فنڈز کا استعمال اور سیاستدانوں کو مالی فائدے پہنچانا عوامی مفادات کو نقصان پہنچاتا ہے۔ جب حکومتی عہدے دار ذاتی مفادات کے لیے عوامی وسائل کا غلط استعمال کرتے ہیں، تو عوام کا اعتماد جمہوری نظام اور ریاستی اداروں پر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں عوامی مایوسی اور عدم اعتماد پیدا ہوتا ہے، جو معاشرتی ہم آہنگی کو کمزور کرتا ہے۔

کرپشن کی وجہ سے مغربی معاشروں میں معاشی نظام بھی عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ بڑی کارپوریشنز اکثر اپنے کاروباری مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے غیر قانونی اور غیر اخلاقی ذرائع استعمال کرتی ہیں۔ ٹیکس چوری، ملازمین کے حقوق کی پامالی، اور ماحولیاتی قوانین کی خلاف ورزی جیسے عوامل معاشرتی انصاف کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں منافع کو اولین ترجیح دی جاتی ہے، اور یہ منافع اکثر غیر منصفانہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح کا نظام امیر اور غریب کے درمیان دولت کی تقسیم کو مزید غیر منصفانہ بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر طبقہ مزید طاقتور ہوتا جاتا ہے جبکہ غریب طبقہ پسماندگی کا شکار رہتا ہے۔

اخلاقی طور پر کرپشن ایک سنگین مسئلہ ہے کیونکہ یہ معاشرتی اصولوں اور قدروں کی نفی کرتی ہے۔ مغربی معاشروں میں جہاں انفرادی آزادی اور انصاف کو اہمیت دی جاتی ہے، کرپشن ان اصولوں کے خلاف جاتی ہے۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ طاقتور افراد قانون سے بالا تر ہیں اور بدعنوانی کے ذریعے اپنے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں، تو معاشرتی اخلاقیات بھی زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ صورتحال عوامی شعور کو منفی طور پر متاثر کرتی ہے، اور لوگ خود بھی بدعنوانی کو ایک عام اور قابل قبول عمل سمجھنے لگتے ہیں۔

مغربی معاشروں میں کرپشن کا ایک اور پہلو قانونی نظام میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ طاقتور اور بااثر افراد اکثر قانونی کارروائیوں سے بچ جاتے ہیں، جبکہ عام شہریوں کو

انصاف کے حصول میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب بڑے کاروباری تنازعات یا سیاسی معاملات میں عدالتیں فیصلہ کرتی ہیں، تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ فیصلے طاقتور افراد کے حق میں جاتے ہیں۔ اس سے قانونی نظام پر عوامی اعتماد کم ہوتا ہے، اور انصاف کا حصول ایک مشکل مرحلہ بن جاتا ہے۔

ماحولیاتی کرپشن بھی ایک سنگین مسئلہ ہے جو مغربی معاشروں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ بڑی صنعتی کمپنیاں اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لیے ماحولیاتی قوانین کو نظر انداز کرتی ہیں، جس سے نہ صرف ماحولیاتی آلودگی بڑھتی ہے بلکہ عوام کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس قسم کی کرپشن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماحولیات کے تحفظ کے لیے جو اقدامات کیے جاتے ہیں، وہ ناکافی ثابت ہوتے ہیں، اور ماحولیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

معاشرتی اداروں پر بھی کرپشن کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ جب تعلیمی ادارے، صحت کے شعبے، یا مذہبی تنظیمیں کرپشن کا شکار ہو جاتی ہیں، تو ان کی ساکھ متاثر ہوتی ہے اور ان کا مقصد محض مالی فائدہ حاصل کرنا بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی ترقی رک جاتی ہے اور عوام کو ان اداروں سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔

کرپشن کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ معاشی ترقی متاثر ہوتی ہے۔ کرپشن سرمایہ کاری کے ماحول کو خراب کرتی ہے، جس سے معیشت میں ترقی کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ جب سرمایہ کار دیکھتے ہیں کہ شفافیت کا فقدان ہے اور بدعنوانی عام

ہے، تو وہ اپنے کاروبار کو دوسری جگہ منتقل کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں بیروزگاری بڑھتی ہے اور عوام کی معاشی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، کرپشن عوامی وسائل کا ضیاع کرتی ہے، جس کا براہ راست اثر عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر پڑتا ہے۔

مغربی معاشروں میں کرپشن ایک جامع مسئلہ ہے جو مختلف سطحوں پر موجود ہے۔ اس کے اثرات نہ صرف سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو متاثر کرتے ہیں بلکہ سماجی اور اخلاقی اقدار کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ کرپشن کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف قانونی اقدامات کیے جائیں بلکہ عوامی شعور کو بلند کیا جائے اور اخلاقی قدروں کو فروغ دیا جائے۔ جب تک معاشرے میں شفافیت، انصاف، اور اخلاقی اصولوں کا فروغ نہیں ہو گا، کرپشن کے اثرات سے مکمل طور پر بچنا ممکن نہیں۔ ایک شفاف اور منصفانہ معاشرہ تبھی تشکیل پائے گا جب معاشرتی، سیاسی، اور معاشی نظاموں کو کرپشن سے پاک کیا جائے اور ان میں شفافیت اور انصاف کو فروغ دیا جائے۔

مغربی معاشروں میں کرپشن کی بات کرتے وقت جدید تاریخ سے کئی اہم مثالیں سامنے آتی ہیں جو اس مسئلے کی پیچیدگی اور وسعت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان مثالوں میں سیاسی کرپشن، مالیاتی اسکینڈلز، اور ماحولیاتی بدعنوانیوں جیسے کئی پہلو شامل ہیں۔

1۔ سیاسی کرپشن" :واٹر گیٹ اسکینڈل "

1970 کی دہائی میں امریکہ میں" واٹر گیٹ اسکینڈل "ایک مشہور مثال ہے۔ صدر رچرڈ نکسن کی حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین کو کمزور کرنے کے لیے غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوکر جمہوری نظام پر عوامی اعتماد کو نقصان پہنچایا۔ اس اسکینڈل نے امریکی سیاست میں شفافیت اور قانونی ضابطوں کی ضرورت پر زور دیا۔

2۔ مالیاتی کرپشن 2008" :مالی بحران "

2008 کا عالمی مالیاتی بحران بھی مغربی معاشروں میں کرپشن کی ایک نمایاں مثال ہے۔ امریکہ اور یورپ کی مالیاتی منڈیوں میں غیر ذمہ دارانہ قرض دینے اور مالیاتی اداروں کی غفلت نے عالمی معیشت کو بحران میں ڈال دیا۔ بڑے بینکوں نے مالی مفادات کے لیے قوانین کو نظر انداز کیا اور عالمی سطح پر شدید اقتصادی مشکلات کا سبب بنے۔

3۔ ماحولیاتی کرپشن Volkswagen" :ایمیشن اسکینڈل "

2015 میں، جرمن کار ساز کمپنی Volkswagen ماحولیاتی کرپشن میں ملوث پائی گئی جب انکشاف ہوا کہ انہوں نے اپنے گاڑیوں کے ایمیشن ٹیسٹوں کو دھوکہ دہی کے ذریعے غلط ظاہر کیا۔ یہ اسکینڈل نہ صرف ماحولیاتی قوانین کی خلاف ورزی تھا بلکہ عوامی صحت اور ماحولیات کو نقصان پہنچانے کا سبب بھی بنا۔

4۔ کارپوریٹ کرپشن Enron" :اسکینڈل "

Enron اسکینڈل، جو 2001 میں منظر عام پر آیا، امریکی کارپوریٹ کرپشن کی ایک بڑی مثال ہے۔ Enron کارپوریشن نے اپنے مالیاتی بیانات میں دھوکہ دہی سے کام لیا اور اپنی کارکردگی کو بہتر ظاہر کرنے کے لیے غیر قانونی طریقے اپنائے۔ اس اسکینڈل نے کمپنی کو دیوالیہ کر دیا اور ہزاروں افراد کی ملازمتیں اور سرمایہ کاری ضائع ہو گئیں۔

5۔ سیاسی اور مالیاتی اثرات "Panama Papers" :لیکس "

2016 میں "Panama Papers" لیک ہونے سے یہ ظاہر ہوا کہ دنیا بھر کے طاقتور افراد، بشمول مغربی معاشروں کی اہم شخصیات، نے اپنے مالی مفادات کو چھپانے کے لیے آف شور کمپنیوں کا استعمال کیا۔ یہ لیکس نے دنیا بھر میں کرپشن اور مالی بے ضابطگیوں کو بے نقاب کیا اور عالمی سطح پر کرپشن کے خلاف تحریکوں کو جنم دیا۔

6۔" برلسکونی اسکینڈل "(اٹلی)

اٹلی کے سابق وزیراعظم سلویو برلسکونی متعدد کرپشن اور جنسی اسکینڈلز میں ملوث رہے۔ انہوں نے اپنی حکومت اور میڈیا کے اثر و رسوخ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کاروباری مفادات کو فروغ دیا اور عدالتی کارروائیوں میں تاخیر یا اثر انداز ہونے کے لیے قوانین میں تبدیلیاں کروائیں۔ ان پر ٹیکس چوری،

رشوت ستانی، اور بدعنوانی کے الزامات بھی عائد ہوئے، جس نے اٹلی کی سیاست اور عدالتی نظام پر شدید اثر ڈالا۔

7۔ "Blackwater" اسکینڈل(امریکہ)

2007 میں Blackwater نامی ایک پرائیویٹ سیکورٹی کمپنی کے اہلکاروں نے عراق میں نہتے شہریوں پر فائرنگ کی، جس میں کئی بے گناہ افراد ہلاک ہوئے۔ اس واقعے نے امریکہ کی پرائیویٹ سیکورٹی کمپنیوں کی کارروائیوں اور ان پر حکومت کی ناکافی نگرانی کو بے نقاب کیا۔ Blackwater کی کارروائیوں میں مالیاتی بدعنوانیاں بھی شامل تھیں، اور یہ کمپنی کئی جنگی جرائم کے الزامات کا سامنا کر چکی ہے۔

8۔ "Libor"اسکینڈل(برطانیہ)

2012 میں (London Interbank Offered Rate) "Libor" اسکینڈل نے عالمی بینکاری نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ کئی بڑے بینکوں، جن میں Barclays اور دیگر شامل تھے، نے سود کی شرحوں کو غلط انداز سے طے کیا، جس کا اثر دنیا بھر میں قرضوں، رہن، اور دیگر مالیاتی مصنوعات کی قیمتوں پر پڑا۔ اس اسکینڈل نے عالمی مالیاتی اداروں کی شفافیت اور دیانت داری پر بڑے سوالات اٹھائے۔

9۔ "Dieselgate" اسکینڈل"(جرمنی)

2015 میں، Volkswagen نے غیر قانونی طور پر اپنی گاڑیوں کے ایمیشن ٹیسٹ میں جعل سازی کی تاکہ وہ قوانین کے مطابق دکھائی دیں۔ اس اسکینڈل کو "Dieselgate" کے نام سے جانا جاتا ہے، اور اس نے کمپنی کو اربوں ڈالر کے جرمانے اور گاڑیوں کو واپس بلانے پر مجبور کیا۔ اس واقعے نے یورپ بھر میں ماحولیاتی قوانین پر سختی سے عمل درآمد کی ضرورت پر زور دیا۔

10۔ FIFA" کرپشن اسکینڈل "

فیفا) فٹ بال کی عالمی تنظیم (کے کئی عہدیداران پر 2015 میں بڑے پیمانے پر رشوت، منی لانڈرنگ، اور بدعنوانی کے الزامات عائد کیے گئے۔ یہ اسکینڈل اس وقت سامنے آیا جب فیفا نے مختلف عالمی فٹ بال ایونٹس، جیسے ورلڈ کپ کی میزبانی کے حقوق، غیر شفاف طریقے سے دینے کے لیے رشوت قبول کی۔ اس نے عالمی فٹ بال کی تنظیم کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا۔

11۔ SNC-Lavalin" اسکینڈل"(کینیڈا)

2019 میں کینیڈا کی بڑی تعمیراتی کمپنی SNC-Lavalin پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے لیبیا میں معاہدے حاصل کرنے کے لیے سرکاری اہلکاروں کو رشوت دی۔ اس اسکینڈل نے کینیڈین سیاست کو ہلا کر رکھ دیا اور وزیراعظم جسٹن ٹروڈو کی حکومت پر شدید تنقید ہوئی، کیونکہ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے کمپنی کو عدالتی کارروائی سے بچانے کی کوشش کی۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مغربی معاشروں میں کرپشن مختلف سطحوں پر موجود ہے اور اس کے اثرات سیاسی، معاشی، اور سماجی ڈھانچوں پر گہرے ہوتے ہیں۔ ان تمام اسکینڈلز سے سیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح کرپشن کے خاتمے کے لیے سخت اقدامات اور شفافیت کی ضرورت ہے اور اس بات پر زور دیتی ہیں کہ قانونی اقدامات، شفافیت، اور عوامی شعور کو بڑھا کر ہی اس مسئلے کا حل ممکن ہے۔

مغربی اور مشرقی معاشروں کا فرق

مغربی معاشروں میں جہاں ٹیکنالوجی، معیشت اور سائنسی ترقی کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں، وہاں کئی منفی پہلو بھی موجود ہیں جو ان معاشروں کو اندرونی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ایک اہم مسئلہ انفرادی آزادی کا غلط استعمال ہے، جس کی وجہ سے خاندانی ڈھانچے میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ مغربی معاشروں میں اکثر افراد اپنے خاندانی اور سماجی تعلقات کو نظر انداز کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں تنہائی، ڈپریشن اور ذہنی امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بے ربطی کی ایک اور بڑی وجہ ماڈرن معاشرتوں میں فوری تسکین اور ذاتی مفاد کو اولیت دینا ہے، جس کے تحت لوگ طویل مدتی تعلقات یا مشکلات کا سامنا کرنے کے بجائے آسان اور جلدی حل تلاش کرتے ہیں۔ یہ رجحان، جو اکثر کیریئر، لائف اسٹائل اور ذاتی آزادیوں کے نام پر فروغ دیا جاتا ہے، معاشرتی سطح پر افراد کے درمیان اعتماد کی کمی اور تعلقات میں کمزوری پیدا کرتا ہے۔

مغربی معاشروں میں مذہبی اور روحانی اقدار کا زوال بھی ایک بڑی منفی تبدیلی ہے۔ سیکولرزم اور سائنسی ترقی نے ان معاشروں میں مذہب کی اہمیت کو کم کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں اخلاقی اور روحانی رہنمائی کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے اور اسے اجتماعی یا معاشرتی زندگی میں کم

اہمیت دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے افراد اخلاقی گائیڈنس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے افراد ایک خلا کا سامنا کرتے ہیں اور زندگی کے بڑے معنوں کی تلاش میں مختلف تجربات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں، جن میں کبھی کبھار منفی رویے اور غیر اخلاقی راستے بھی شامل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف، مشرقی معاشرتوں میں روایتی اقدار اور ثقافتی رشتے آج بھی مستحکم ہیں، جو ان کی سب سے بڑی مثبت خصوصیات میں سے ایک ہے۔ ان معاشروں میں خاندان کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، اور اجتماعی فلاح و بہبود کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مشرقی معاشرتیں عموماً روحانی اقدار پر مبنی ہوتی ہیں، جہاں مذہب اور اخلاقیات کا کردار زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ معاشرتیں دنیاوی مفادات کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی کو بھی اہمیت دیتی ہیں، جو انفرادی زندگی میں توازن پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مہمان نوازی، خدمت خلق، اور انسانیت کی قدر مشرقی معاشرتوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مشرقی معاشرتیں اجتماعی فلاح پر زور دیتی ہیں، جہاں فرد کی بھلائی صرف اس کی ذاتی کامیابی سے نہیں بلکہ اس کے آس پاس کے لوگوں کی خوشحالی سے جڑی ہوتی ہے۔ اس میں روحانی قدروں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ افراد اپنے بزرگوں کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور معاشرتی روایات کو برقرار رکھتے ہیں، جس سے خاندان اور معاشرتی ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے۔ مذہب اور روحانیت کی

موجودگی لوگوں کو اخلاقی اصولوں کی پیروی کرنے کی تحریک دیتی ہے، جس سے بدعنوانی اور غیر اخلاقی حرکات کا مقابلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مشرقی معاشرتوں میں تعلیم کو بھی روحانی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے، جس سے افراد صرف مادی علم نہیں بلکہ اخلاقی شعور بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی معاشروں میں اکثر تعلیم کا مقصد صرف معاشی ترقی اور پیشہ ورانہ کامیابی تک محدود ہوتا ہے، جس کی وجہ سے افراد میں اخلاقی اور سماجی ذمے داریوں کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق، انسان کو اپنی زندگی میں توازن اور انصاف کے اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ مشرقی معاشرتیں اکثر ان تعلیمات کے قریب نظر آتی ہیں، جہاں انفرادی اور اجتماعی فلاح کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے، اور اخلاقی اصولوں کی پاسداری کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ وہ اقدار ہیں جو آج کے تیز رفتار اور مادی دور میں بھی انسانیت کو فلاح کی طرف لے جا سکتی ہیں۔

لہٰذا، مغربی معاشرتوں کی انفرادی آزادیوں کی حد اور روحانی و اخلاقی زوال کے منفی پہلوؤں کے مقابلے میں مشرقی معاشرتوں کی روایتی اقدار، اجتماعی فلاح اور روحانی ترقی کی اہمیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ دونوں معاشرتوں کے تجربات ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ توازن، شفافیت اور اخلاقیات کی بنیاد پر ایک کامیاب معاشرت کی تشکیل ممکن ہے۔

مغربی معاشروں اور مشرقی معاشروں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، جو ان کی ثقافتی، سماجی، اور اقتصادی ڈھانچوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

مغربی معاشروں میں انفرادی آزادی کی مثالیں روزمرہ کی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جیسے کہ امریکا میں، جہاں افراد اپنی زندگی کے انتخاب میں مکمل آزادی محسوس کرتے ہیں۔ یہاں، لوگ اپنے مذہب، سیاسی نظریات، اور معاشرتی تعلقات کا انتخاب خود کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں کبھی کبھی خاندانی روابط میں کمی آتی ہے۔ مثال کے طور پر، کئی مغربی ممالک میں نوجوانوں کے لیے یونیورسٹی جانے کے بعد گھر چھوڑنا ایک عام بات ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے خاندانی ماحول سے دور ہو جاتے ہیں اور تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ یہ صورتحال انفرادی صحت پر منفی اثر ڈال سکتی ہے، جیسا کہ حالیہ سالوں میں ڈپریشن اور ذہنی بیماریوں کی بڑھتی ہوئی شرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، مشرقی معاشروں میں، جیسے کہ پاکستان یا بھارت میں، خاندانی ڈھانچہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ہندوستان میں، خاندان کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، جہاں نسل در نسل خاندان کے افراد اکٹھے رہتے ہیں۔ یہ خاندانی نظام افراد کو جذباتی حمایت فراہم کرتا ہے، جس کی وجہ سے لوگ مشکل حالات کا سامنا کرنے میں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ یہاں مشترکہ خاندانوں کی

مثال دی جا سکتی ہے، جہاں افراد اپنے بزرگوں کی رائے کا احترام کرتے ہیں اور خاندان کے فیصلوں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

مغربی معاشروں میں مذہب کی اہمیت میں کمی بھی ایک نمایاں پہلو ہے۔ کئی مغربی ممالک، جیسے کہ سویڈن اور ڈنمارک، میں لوگوں کی اکثریت خود کو غیر مذہبی یا سیکولر سمجھتی ہے۔ یہ ممالک معاشرتی نظام کو مذہب سے الگ رکھتے ہیں، جو کہ بعض اوقات اخلاقی رہنمائی کی کمی کا باعث بنتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ڈنمارک میں، 2020 میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق، نوجوانوں کی اکثریت نے مذہبی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینے کا اعتراف کیا، جس کی وجہ سے ان کی اخلاقی ترقی متاثر ہو رہی ہے۔

دوسری طرف، مشرقی معاشروں میں، جیسے کہ ایران یا سعودی عرب، مذہب کی موجودگی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر، اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر، افراد کو اپنے عمل اور کردار میں اخلاقیات کی پاسداری کرنے کی سخت ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ معاشرے نہ صرف مذہبی رسومات کو مانتے ہیں، بلکہ ان کی بنیاد پر معاشرتی اصولوں کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ جیسے کہ رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا اور زکات دینا نہ صرف ذاتی روحانی فائدہ بلکہ معاشرتی فلاح کے لیے بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔

تعلیمی نظام کی مثال بھی اہم ہے۔ مغربی معاشروں میں تعلیم کا مقصد اکثر پیشہ ورانہ کامیابی تک محدود ہوتا ہے، جیسے کہ امریکا میں کاروباری تعلیم

اور ریاضی (STEM) پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مشرقی معاشروں میں، جیسے کہ جاپان یا جنوبی کوریا، تعلیم میں روحانی اور اخلاقی تربیت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جاپانی تعلیمی نظام میں طلبہ کو صرف علمی علم نہیں بلکہ معاشرتی ذمے داریوں اور اخلاقیات کی بھی تربیت دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ معاشرتی طور پر ذمہ دار شہری بنتے ہیں۔

ان مثالوں کے ذریعے، یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی اور مشرقی معاشروں کے درمیان انفرادی آزادی، مذہبی اور اخلاقی قدریں، اور تعلیمی نظام میں نمایاں فرق ہے۔ مغربی معاشروں کی انفرادی آزادی اور سیکولرزم کے منفی اثرات کے مقابلے میں، مشرقی معاشروں کی روایتی اقدار اور مذہبی وابستگی ایک متوازن اور مضبوط معاشرتی ڈھانچہ فراہم کرتی ہیں، جو زندگی کے چیلنجز کا سامنا کرنے میں افراد کی مدد کرتی ہیں۔

مغربی فلسفے اور مغربی سماج میں تضادات

بمغربی فلسفے اور مغربی معاشرے کے تضادات ایک پیچیدہ اور گہرے موضوع ہیں، جن میں فلسفیانہ تصورات اور عملی سماجی رویوں کے درمیان غیر مطابقت کی کئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ مغربی دنیا میں مختلف فلسفیانہ مکاتبِ فکر موجود ہیں جیسے سیکولرازم، لبرل ازم، وجودیت، سرمایہ داری، اور انفرادیت پر زور دینے والی تعلیمات، لیکن جب ان فلسفوں کو عملی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اکثر تضادات سامنے آتے ہیں۔

مغربی فلسفہ انفرادیت کو بہت اہمیت دیتا ہے، جس کے مطابق ہر انسان کو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اس فلسفے کی رو سے افراد کو اپنے مفادات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے، اور یہ تصور خاص طور پر سرمایہ داری میں نمایاں ہے، جہاں مالی خودمختاری اور ذاتی کامیابی پر زور دیا جاتا ہے۔ تاہم، جب اس نظریے کو عملی زندگی میں دیکھا جائے تو بڑے پیمانے پر معاشرتی ناانصافی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نظام کچھ لوگوں کو بے پناہ دولت اور طاقت عطا کرتا ہے، جبکہ ایک بڑی تعداد غربت اور پسماندگی کا شکار رہتی ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے اجتماعی ذمہ داریوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے، جس سے معاشرتی فلاح و بہبود کے نظام کو نقصان پہنچتا ہے۔

دوسری طرف، مغربی فلسفہ عقل پرستی اور سائنسی تحقیق پر زور دیتا ہے، اور سائنسی ترقی کو انسانیت کی خدمت کے لیے استعمال کرنے کی بات کی جاتی ہے۔ لیکن عملی زندگی میں سائنسی ایجادات اور تکنیکی ترقی کو زیادہ تر جنگی اور مادی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کہ جوہری ہتھیاروں اور جدید جنگی ٹیکنالوجی کی تخلیق۔ اس سے دنیا بھر میں انسانی جانوں کا ضیاع ہوتا ہے اور معاشرتی توازن بگڑتا ہے۔ یہاں ایک بڑا تضاد یہ سامنے آتا ہے کہ سائنسی ترقی کے نتائج اکثر اخلاقی اصولوں اور انسانیت کی فلاح کے برخلاف ہوتے ہیں۔

مغربی معاشرہ شخصی آزادی کو بہت اہمیت دیتا ہے، خاص طور پر آزادی اظہار اور رائے کی آزادی کو بنیادی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس آزادی کا غلط استعمال کیا جاتا ہے، تو یہ معاشرتی اور اخلاقی حدود کو پار کر جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، آزادی اظہار کے نام پر مذہبی شخصیات یا مقدسات کی توہین کی جاتی ہے، جو دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرتی ہے۔ یہ عمل مغربی معاشروں میں اکثر نظر آتا ہے، جہاں آزادی کی آڑ میں دوسروں کے عقائد اور نظریات کی بے حرمتی کی جاتی ہے، جو خود مغربی فلسفے کے اصولوں سے متصادم ہے۔

سیکولرازم مغربی فلسفے کا ایک اور اہم ستون ہے، جس میں ریاست اور مذہب کو الگ رکھنے کی بات کی جاتی ہے۔ سیکولرازم کے مطابق مذہب افراد کی ذاتی زندگی کا حصہ ہونا چاہیے، اور ریاست کے معاملات میں اس کی کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن عملی طور پر مغربی معاشروں میں مذہب کا کردار مکمل طور پر ختم

نہیں ہو سکا۔ مثال کے طور پر امریکا میں، جہاں سیکولرازم کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہاں مذہبی اثر و رسوخ ابھی بھی مضبوط ہے اور سیاسی و سماجی فیصلوں پر گہرا اثر ڈال رہا ہے۔ اس کے برعکس، یورپ میں مذہب کو ایک ثقافتی ورثے کے طور پر تو قبول کیا جاتا ہے، لیکن عملی زندگی میں اس کا کردار نہایت کمزور ہو چکا ہے۔

مغربی فلسفے میں جمہوریت اور انسانی حقوق کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جمہوریت کا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کو مساوی حقوق حاصل ہوں، اور حکومت عوام کی مرضی کے مطابق چلائی جائے۔ لیکن مغربی معاشروں میں جمہوریت کے باوجود طبقاتی تفریق اور امتیازی سلوک کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سیاسی اور معاشی طاقت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہے، جس سے عوام کی حقیقی نمائندگی نہیں ہو پاتی اور امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کا بھی یہی حال ہے، جہاں مغربی ممالک دنیا بھر میں حقوق کے علمبردار بنتے ہیں، لیکن اپنے مفادات کے لیے دوسرے ممالک میں انسانی حقوق کی پامالی کو نظرانداز کرتے ہیں۔ اس سے مغرب کی خارجہ پالیسی میں دوہرا معیار نمایاں ہوتا ہے۔

سرمایہ داری نظام کے ساتھ مغربی فلسفے میں مادی ترقی پر زور دیا جاتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں روحانی اور اخلاقی زوال بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ مغربی معاشرے مادی خوشحالی کو انسانی زندگی کی کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں، لیکن یہ طرز فکر افراد کو روحانی پہلوؤں سے غافل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادی ترقی کے

باوجود ذہنی دباؤ، مایوسی، اور روحانی خلا مغربی معاشروں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا ایک بڑا ثبوت مغربی دنیا میں بڑھتے ہوئے ذہنی امراض اور خودکشی کے واقعات ہیں، جو اس فلسفے کی عملی ناکامی کو ظاہر کرتے ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں بھی مغربی فلسفے اور عملی زندگی کے درمیان تضاد نظر آتا ہے۔ مغربی تعلیمی نظام میں تنقیدی سوچ اور آزادانہ تحقیق پر زور دیا جاتا ہے، لیکن جب طلباء عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں، تو انہیں معاشی کامیابی کے حصول کی دوڑ میں شامل ہونا پڑتا ہے، جو تعلیمی فلسفے کے برخلاف ہے۔ تعلیم کا مقصد تنقیدی اور آزادانہ سوچ کو فروغ دینا ہونا چاہیے، لیکن عملی زندگی میں لوگ ایک محدود مادی زندگی کے دائرے میں پھنس جاتے ہیں، جہاں اخلاقیات اور روحانی اقدار کا کردار کم ہوتا جا رہا ہے۔

ماحولیاتی تحفظ کے حوالے سے بھی مغربی فلسفے میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ مغرب عالمی سطح پر ماحولیاتی تحفظ کی بات کرتا ہے اور مختلف معاہدے کرتا ہے تاکہ ماحول کو بہتر بنایا جا سکے۔ لیکن حقیقت میں، مغربی صنعتی ترقی اور صارفیت پر مبنی معاشی نظام ماحولیاتی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ بڑے پیمانے پر صنعتوں اور کارخانوں کے قیام سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہو رہا ہے، اور مغربی ممالک جو ماحولیاتی تحفظ کے علمبردار بنتے ہیں، وہی سب سے زیادہ آلودگی پیدا کرنے والے بھی ہیں۔

یہ تمام تضادات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ مغربی فلسفہ اپنے نظریات میں تو بہت طاقتور اور انقلابی ہے، لیکن جب ان نظریات کو عملی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو مادی ترقی، انفرادی آزادی، اور اجتماعی ذمہ داریوں کے درمیان تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس تضاد کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مغرب اپنے فلسفیانہ اصولوں کو عملی زندگی میں بہتر طور پر نافذ کرے، اور ایک متوازن نظریہ اپنائے جس میں انفرادیت اور اجتماعی فلاح دونوں کو مدنظر رکھا جائے۔ اس ضمن میں اسلامی تعلیمات ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں، جہاں فرد کی آزادی اور اجتماعی فلاح دونوں کو متوازن طریقے سے اہمیت دی جاتی ہے، اور جہاں اخلاقی و روحانی پہلوؤں کو مادی ترقی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تاکہ ایک متوازن اور پرامن معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔

مشرقی مکاتب فکر اور مشرقی سماج میں تضادات

مشرقی مکاتب فکر اور مشرقی سماج میں کئی اہم تضادات موجود ہیں، جو ثقافتی، مذہبی، اور سماجی سطح پر واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تضادات مختلف نظریات، روایات، اور معاشرتی تبدیلیوں کے درمیان ایک تناؤ کا باعث بنتے ہیں۔

سب سے پہلے، مشرقی مکاتب فکر میں مذہبی تعلیمات اور روایات کی اہمیت بہت زیادہ ہے، جبکہ مشرقی سماج میں جدیدیت اور سائنسی ترقی کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر، ہندوستان میں ہندو ازم اور اسلام کے مختلف مکاتب فکر میں مذہب کی بنیاد پر زندگی کے اصولوں کا تعین ہوتا ہے۔ لیکن جدید دور میں، نوجوان نسل سائنسی سوچ اور تکنیکی ترقی کی طرف مائل ہو رہی ہے، جس کے باعث روایتی مذہبی تعلیمات کی قدریں چیلنج کی جا رہی ہیں۔ یہ تضاد نوجوانوں کی سوچ میں ایک جھنجھٹ پیدا کرتا ہے، جہاں وہ مذہبی اصولوں اور جدید علم کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسرا اہم تضاد مشرقی سماج میں خاندان کی روایات اور انفرادی آزادی کے درمیان ہے۔ مشرقی ثقافتوں میں خاندان کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، جہاں مشترکہ خاندانوں کا تصور غالب ہے۔ مگر جدید دور میں، انفرادی آزادی اور خود مختاری کی خواہش بڑھ رہی ہے، خاص طور پر نوجوانوں میں۔ یہ صورت حال

خاندان کے بزرگوں اور نوجوان نسل کے درمیان تناؤ پیدا کرتی ہے، جہاں بزرگ روایتی اقدار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ نوجوان آزاد زندگی گزارنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

تیسرا تضاد تعلیم کے میدان میں پایا جاتا ہے۔ مشرقی مکاتب فکر میں علم کی قدریں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، اور یہ مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ مگر مشرقی سماج میں تعلیم کا مقصد اکثر مادی کامیابی اور نوکری حاصل کرنا ہوتا ہے، جس کے باعث روحانی اور اخلاقی تربیت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ تضاد طلبہ کو ایک طرف مادی کامیابی کی طرف مائل کرتا ہے، جبکہ دوسری طرف انہیں اپنی ثقافت اور روایات کی پاسداری کا احساس بھی ہوتا ہے۔

مشرقی سماج میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے بھی ایک تضاد موجود ہے۔ کئی مشرقی مکاتب فکر، جیسے کہ بعض اسلامی اور ہندو مکاتب فکر، میں خواتین کی حیثیت اور حقوق کو محدود کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جدید سماجی تحریکیں خواتین کے حقوق اور مساوات کی اہمیت کو فروغ دے رہی ہیں، جس کی وجہ سے خواتین اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہی ہیں۔ یہ تضاد روایتی سوچ اور جدید حقوق کی تحریکوں کے درمیان ایک کشمکش کا باعث بنتا ہے۔

ایک اور اہم تضاد مذہبی برداشت اور عدم برداشت کے درمیان ہے۔ مشرقی مکاتب فکر میں بعض اوقات مذہبی برداشت کی کمی نظر آتی ہے، خاص طور پر جب بات مختلف فرقوں یا مذاہب کی آتی ہے۔ یہ صورتحال اکثر فرقہ واریت کی

شکل میں سامنے آتی ہے، جہاں مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے نظریات کو برداشت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کے برعکس، جدید سماجی تحریکیں، جو انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کی وکالت کرتی ہیں، اس عدم برداشت کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ یہ تضاد مذہبی تعلیمات کے محافظین اور جدید انسانی حقوق کے علمبرداروں کے درمیان کشمکش پیدا کرتا ہے، جو بعض اوقات سماجی تناؤ اور خلفشار کا باعث بنتا ہے۔

ثقافتی شناخت کا مسئلہ بھی ایک اہم تضاد ہے۔ مشرقی معاشرتوں میں اپنی ثقافتی ورثے کی حفاظت اور اسے برقرار رکھنے کا جذبہ موجود ہے، لیکن عالمی سطح پر ثقافتی گلوبلائزیشن کے اثرات کی وجہ سے یہ چیلنج میں ہے۔ نوجوان نسل، خاص طور پر شہر نشین علاقوں میں، مغربی ثقافت اور طرز زندگی کو اپنانے میں دلچسپی رکھتی ہے، جو روایتی ثقافتی اقدار کے خلاف جاتی ہے۔ یہ تضاد نہ صرف ثقافتی شناخت کو متاثر کرتا ہے، بلکہ اس سے معاشرتی ہم آہنگی میں بھی خلل پیدا ہوتا ہے۔

اقتصادی میدان میں بھی تضادات موجود ہیں۔ مشرقی معاشروں میں، جہاں زیادہ تر افراد کا معیشت میں زراعت اور دستی کاری پر انحصار ہے، وہاں صنعتی اور سائنسی ترقی کی رفتار مختلف ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے اثرات اور عالمی مارکیٹ کی ضروریات نے مشرقی ممالک کو اپنے اقتصادی ڈھانچوں میں تبدیلی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر بعض روایتی مکاتب فکر اس تبدیلی کے خلاف مزاحمت کرتے

ہیں، جس کی وجہ سے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تضاد اقتصادی ترقی کے حامیوں اور روایتی طریقوں کے محافظین کے درمیان ایک جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

خود اعتمادی اور معاشرتی دباؤ کا مسئلہ بھی مشرقی سماج میں اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں ایک طرف مشرقی مکاتب فکر خود اعتمادی، محنت اور مستقل مزاجی کو سراہتے ہیں، وہاں دوسری طرف معاشرتی توقعات اور دباؤ افراد کو خود کو منوانے کی کوششوں میں محدود کر دیتے ہیں۔ نوجوانوں پر کامیابی کے بڑے بڑے معیارات کا بوجھ ہوتا ہے، جو انہیں خود کے اظہار سے روکتا ہے۔ یہ تضاد نہ صرف فرد کی نفسیاتی حالت کو متاثر کرتا ہے بلکہ سماجی ڈھانچے کی مضبوطی میں بھی رکاوٹ بنتا ہے۔

مزید برآں، مشرقی معاشروں میں سیاسی ڈھانچے اور حکومتی نظام میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ کئی مشرقی ممالک میں روایتی طور پر موروثی حکمرانی یا آمرانہ حکومتیں موجود ہیں، جو کہ جدید جمہوری اصولوں کے خلاف ہیں۔ یہ صورتحال عوامی حقوق اور آزادیوں کی کمی کا باعث بنتی ہے، جبکہ شہری حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے افراد کو سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں، عوام کی خواہشات اور حکومتی پالیسیاں ایک دوسرے کے متضاد ہو جاتی ہیں، جو کہ سماجی unrest کا سبب بنتی ہیں۔

مجموعی طور پر، مشرقی مکاتب فکر اور مشرقی سماج میں یہ تضادات ایک گہرے تبدیلی کے دور کی عکاسی کرتے ہیں، جہاں روایتی اقدار اور جدیدیت کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ یہ تضادات نہ صرف فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ معاشرتی سطح پر بھی بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں، جو مستقبل کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

آخر میں، ان تمام تضادات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشرقی مکاتب فکر اور مشرقی سماج ایک پیچیدہ اور متنوع تجربے کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ تضادات ایک جانب تو ایک تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جبکہ دوسری جانب روایتی قدروں کی حفاظت کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی ہے۔ معاشرتی، اقتصادی، اور ثقافتی تبدیلیوں کے دوران ان تضادات کو سمجھنا اور ان کا حل تلاش کرنا نہایت اہم ہے تاکہ مشرقی معاشرتیں ایک متوازن اور ترقی یافتہ مستقبل کی طرف گامزن ہو سکیں۔

ترقی یافتہ اقوام کی تیسری دنیا کیلئے دوغلی پالیسیاں

ترقی یافتہ اقوام کی تیسری دنیا کے ممالک پر عدم توجہ اور احساس محرومی کا تعلق ایک اہم مسئلے سے ہے جو عالمی سیاست، اقتصادی عدم مساوات، اور سماجی ناانصافی سے جڑا ہوا ہے۔ جب ترقی یافتہ ممالک تیسری دنیا کی ترقی، عوامی بہبود، اور بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت میں ناکام رہتے ہیں، تو اس کا نتیجہ بسا اوقات بے چینی، مایوسی، اور انتہا پسندی کی صورت میں نکلتا ہے، جو کہ دہشت گردی کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔

پہلا اہم پہلو یہ ہے کہ جب ترقی یافتہ ممالک تیسری دنیا کے مسائل پر توجہ نہیں دیتے، تو وہاں کے عوام میں احساس محرومی بڑھتا ہے۔ یہ احساس انہیں یہ باور کراتا ہے کہ عالمی نظام ان کے حقوق، ضروریات، اور خواہشات کی طرف توجہ نہیں دے رہا۔ اس عدم توجہ کی وجہ سے، لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مسائل کا حل نہ تو مقامی حکومتوں کے پاس ہے اور نہ ہی عالمی برادری کی جانب سے کوئی مدد موجود ہے۔ یہ بے بسی بعض اوقات نوجوانوں کو انتہا پسند گروہوں کی طرف مائل کر دیتی ہے، جو انہیں ایک طاقتور آواز دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔

دوسرا پہلو معاشی عدم مساوات کا ہے۔ جب ترقی یافتہ ممالک کی بڑی کارپوریشنز تیسری دنیا کے وسائل کا استحصال کرتی ہیں، تو مقامی معیشتوں میں عدم توازن

پیدا ہوتا ہے۔ یہ عدم توازن نہ صرف غربت کو بڑھاتا ہے بلکہ معاشرتی تناؤ اور مایوسی کو بھی جنم دیتا ہے۔ جب لوگ اپنی معاشی حالت سے ناخوش ہوتے ہیں اور ان کے پاس کوئی موثر راستہ نہیں ہوتا، تو وہ تشدد کا راستہ اپنانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں، دہشت گرد تنظیمیں انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔

سماجی عدم مساوات بھی ایک اہم عنصر ہے۔ جب ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ترقی پذیر ممالک کی ثقافت، روایات، اور شناخت کو نظرانداز کیا جاتا ہے، تو یہ احساس بڑھتا ہے کہ ان کی شناخت کو خطرہ لاحق ہے۔ یہ احساس نوجوانوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل سکتا ہے، جہاں وہ اپنی ثقافت کی حفاظت کے لیے سخت گیر نظریات کو اپناتے ہیں۔ یہ شدت پسند نظریات انہیں دہشت گردی کی طرف مائل کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ اسے اپنی ثقافت اور شناخت کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

علاوہ ازیں، جب ترقی یافتہ ممالک تیسری دنیا کے ممالک میں جنگوں، فوجی مداخلت، یا دیگر سخت اقدامات کے ذریعے اپنی پالیسیوں کو نافذ کرتے ہیں، تو یہ مقامی آبادیوں میں بے چینی اور انتقام کی جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں، عوامی ردعمل اکثر شدید ہوتا ہے، اور کچھ لوگ اس ردعمل کو دہشت گردی کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مشرق وسطیٰ کے ممالک

میں ہونے والے تنازعات ہیں، جہاں غیر ملکی مداخلت اور جنگوں نے انتہا پسندی کی بنیاد رکھی ہے۔

ترقی یافتہ اقوام کی تیسری دنیا کے مسائل پر عدم توجہ اور احساس محرومی، معاشی عدم مساوات، سماجی تناؤ، اور فوجی مداخلت جیسے عوامل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہ سب عوامل مل کر انتہا پسندی اور دہشت گردی کی افزائش کا باعث بنتے ہیں۔ اس صورتحال کے حل کے لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری تیسری دنیا کے مسائل کو سنجیدگی سے لے اور ان کی ترقی، خود مختاری، اور بنیادی انسانی حقوق کا احترام کرے۔ جب تک یہ بنیادی مسائل حل نہیں ہوں گے، دہشت گردی اور انتہا پسندی کا خطرہ بڑھتا رہے گا۔

پائیدار ترقی کے مقاصد کے درمیان تضادات

پائیدار ترقی کے مقاصد (SDGs) کا قیام عالمی برادری کی طرف سے ایک اہم اقدام ہے، جو 2030 تک ترقی، مساوات، اور ماحولیاتی تحفظ کے لیے ایک جامع حکمت عملی پیش کرتا ہے۔ مگر اس کے دعوے اور عملی صورتحال کے درمیان ایک واضح تضاد موجود ہے، جو کئی وجوہات کی بنا پر ابھرتا ہے۔

پہلا پہلو یہ ہے کہ SDGs کا مقصد ایک جامع عالمی ایجنڈا پیش کرنا ہے، لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے مطلوبہ مالی وسائل کی کمی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک اس مالیاتی بحران کا شکار ہیں، جس کی وجہ سے وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے درکار سرمایہ کاری نہیں کر پا رہے۔ جب عالمی طاقتیں یا مالی ادارے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں، تو یہ SDGs کے دعووں کو کمزور کر دیتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو حکومتی پالیسیوں میں تضاد ہے۔ بعض اوقات، حکومتیں اقتصادی ترقی کے نام پر ماحولیاتی تحفظ اور سماجی انصاف کے مقاصد کو نظرانداز کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، جب کسی ملک کی حکومت بڑے صنعتی منصوبوں کی حمایت کرتی ہے، تو یہ اکثر ماحولیات اور مقامی کمیونٹیز کے حقوق کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اس

تضاد کی وجہ سے، SDGs کے اصولوں کی پاسداری نہیں ہو پاتی، جس سے ان کے اثرات کمزور ہو جاتے ہیں۔

سماجی عدم مساوات بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ SDGs کا ایک بنیادی مقصد غربت کا خاتمہ اور مساوات کو فروغ دینا ہے، لیکن بہت سے ممالک میں یہ عدم مساوات بڑھتی جا رہی ہے۔ دولت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، تعلیمی اور صحت کی سہولیات تک رسائی میں تفاوت، اور سماجی انصاف کے فقدان نے اس تضاد کو جنم دیا ہے۔ جب یہ بنیادی مسائل حل نہیں ہوتے، تو SDGs کی کامیابی بھی متاثر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں، عالمی سطح پر سیاسی ارادوں کی کمی بھی اس تضاد کی ایک وجہ ہے۔ اگرچہ بہت سے ممالک نے SDGs کو اپنانے کا عزم ظاہر کیا ہے، لیکن عملی طور پر ان پر عمل درآمد میں عدم دلچسپی اور سیاسی عدم استحکام ایک بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات، اندرونی تنازعات یا بیرونی دباؤ کی وجہ سے حکومتیں SDGs کے اہداف کی طرف پیش قدمی نہیں کر پاتیں۔

ماحولیاتی تبدیلی بھی ایک اہم چیلنج ہے۔ اگرچہ SDGs میں ماحولیاتی تحفظ پر زور دیا گیا ہے، مگر صنعتی ترقی اور توانائی کے استعمال میں موجودہ طرز عمل میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جب تک عالمی برادری ماحولیاتی مسائل کے حل کے لیے ایک جامع حکمت عملی اختیار نہیں کرتی، SDGs کے دعوے عملی طور پر لاگو نہیں ہو پائیں گے۔

آخری تجزیے میں، SDGs کے دعوے اور عمل میں تضاد ایک سنگین مسئلہ ہے جو کئی وجوہات کی بنا پر ابھرتا ہے۔ مالی وسائل کی کمی، حکومتی پالیسیوں میں تضاد، سماجی عدم مساوات، سیاسی ارادوں کی کمی، اور ماحولیاتی چیلنجز ان بنیادی عوامل میں شامل ہیں جو SDGs کے موثر نفاذ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس کے حل کے لیے ضروری ہے کہ عالمی برادری، حکومتیں، اور مالی ادارے مل کر ایک جامع اور مربوط حکمت عملی تیار کریں تاکہ SDGs کے مقاصد کو حقیقت میں تبدیل کیا جا سکے۔

مشرق و مغرب کے مقابلہ کی بنیادیں

مغرب اور مشرق دونوں اپنے اپنے ثقافتی، سماجی، اور تاریخی پہلوؤں پر فخر کرتے ہیں، لیکن ان کے فخر کی بنیادیں اور وجوہات مختلف ہیں، جو دونوں کی منفرد شناخت کو اجاگر کرتی ہیں۔

مغرب کی فخر کی وجوہات میں سائنسی اور تکنیکی ترقی کی نمایاں کامیابیاں شامل ہیں۔ مغربی ممالک، خاص طور پر امریکہ اور یورپ، نے جدید سائنسی تحقیق میں بے شمار ترقیات کی ہیں، جن میں انٹرنیٹ، مصنوعی ذہانت، اور میڈیکل سائنسز شامل ہیں۔ ان ترقیات نے نہ صرف دنیا کی شکل بدل دی ہے بلکہ انسانی زندگی کی بہتری میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ، مغرب کا جمہوری نظام بھی ایک بڑی فخر کی بات ہے۔ یہاں، عوامی شمولیت، آزادی، اور انسانی حقوق کی پاسداری پر زور دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے لوگ اپنے نظریات اور طرز زندگی کے انتخاب میں آزاد ہوتے ہیں۔ مغربی معاشروں میں انفرادی آزادی کی قدریں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات، طرز زندگی، اور انتخاب میں خود مختار ہیں، جو انہیں اپنی شناخت اور خودی کو پروان چڑھانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

مزید برآں، مغرب مختلف ثقافتوں کا ایک مرکز ہے، جہاں مختلف قومیتیں اور ثقافتی پس منظر کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس ثقافتی تنوع نے مغرب کو ایک عالمی پلیٹ فارم فراہم کیا ہے جہاں خیالات، روایات، اور فنون کا تبادلہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک منفرد اور متنوع معاشرہ وجود میں آیا ہے۔

اس کے برعکس، مشرق کے پاس بھی فخر کرنے کی کئی وجوہات ہیں۔ مشرقی معاشرے، جیسے ایران، ہندوستان، اور چین، کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے اور ان کے پاس ایک عظیم ثقافتی ورثہ موجود ہے، جس میں ادب، فن، اور فلسفہ شامل ہیں۔ مشرق کی ثقافتی گہرائی اسے عالمی ثقافت کا ایک اہم حصہ بناتی ہے۔ روحانی تعلیمات کی بات کریں تو مشرق میں مختلف مذہبی اور روحانی مکاتب فکر موجود ہیں، جیسے اسلام، ہندو ازم، بدھ ازم، اور کنفیوشزم، جو انسانی زندگی کے مقصد، اخلاقیات، اور باہمی تعلقات کی گہرائی میں بصیرت فراہم کرتے ہیں۔ یہ مذہبی عقائد لوگوں کی روزمرہ زندگی اور سماجی تعلقات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مشرقی معاشروں میں خاندان کی اہمیت بھی ایک نمایاں پہلو ہے، جہاں بین النسلی تعلقات کو بڑی قدر دی جاتی ہے۔ یہاں، خاندانی ڈھانچہ مضبوط ہوتا ہے، اور افراد ایک دوسرے کی مدد کرنے اور عزت و احترام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، مشرقی ثقافت میں مہمان نوازی کا ایک خاص مقام ہے،

جہاں لوگوں کی دلجوئی، مہمانوں کی عزت، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کی روایت موجود ہے۔

تعلیم کی قدروں کی اہمیت بھی مشرقی معاشروں کی شناخت کا حصہ ہے۔ یہاں علم کی قدر کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اور طلباء عموماً مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ سائنسی علم میں بھی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ یہ تعلیم انسان کی زندگی کو بہتر بنانے اور معاشرتی ترقی کے لیے اہم ثابت ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر، مغرب اور مشرق دونوں کے پاس اپنی اپنی کامیابیاں، روایات، اور خصوصیات ہیں، جن پر وہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ مغرب کی سائنسی ترقی، جمہوری نظام، انفرادی آزادی، اور ثقافتی تنوع کی قوتیں اس کی شناخت ہیں، جبکہ مشرق کا ثقافتی ورثہ، روحانی تعلیمات، خاندانی اقدار، مہمان نوازی، اور علم کی قدر اسے ایک منفرد حیثیت فراہم کرتی ہیں۔ یہ دونوں ثقافتیں اپنی جگہ اہم ہیں اور عالمی سطح پر ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

مغرب کی ترقی میں تیسری دنیا کے استحصال کا کردار

مغرب کی ترقی میں تیسری دنیا کا استحصال ایک اہم اوراہم مسئلہ ہے، جو عالمی معیشت، سیاست، اور ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ استحصال مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، جیسے کہ اقتصادی، سیاسی، اور سماجی پہلوؤں کے ذریعے۔

سب سے پہلے اقتصادی استحصال کی بات کریں تو مغرب کی ترقی میں تیسری دنیا کے قدرتی وسائل کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی بڑی کارپوریشنز تیسری دنیا کے ممالک میں اپنی پیداوار کی بنیاد قائم کرتی ہیں، جہاں مزدوری کے اخراجات کم ہوتے ہیں۔ یہ کمپنیاں مقامی وسائل، جیسے کہ معدنیات، زراعت، اور دیگر قدرتی وسائل کا استحصال کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں مقامی معیشتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان کمپنیوں کی سرگرمیاں اکثر مقامی حکومتوں کی رضا مندی سے ہوتی ہیں، جو بدعنوانی اور سیاسی دباؤ کے باعث عوامی مفاد کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔

دوسرا اہم پہلو سوشل اور ثقافتی استحصال کا ہے۔ مغربی ممالک کی ثقافت، طرز زندگی، اور معاشرتی اقدار تیسری دنیا کے ممالک میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ یہ صورت حال کبھی کبھی مقامی ثقافتوں اور روایات کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ جب نوجوان نسلیں مغربی طرز زندگی کی طرف مائل ہوتی ہیں تو مقامی

زبانوں، رسومات، اور ثقافتی شناخت کی کمی کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ استحصال نہ صرف ثقافتی بلکہ ذہنی استحصال کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے، جہاں مغرب کی معاشرتی اقدار کو واحد معیار کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

سیاست کے میدان میں بھی استحصال کی صورتیں موجود ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں اکثر تیسری دنیا کے ممالک میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے مداخلت کرتی ہیں۔ یہ مداخلت مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے، جیسے کہ اقتصادی امداد کی صورت میں یا سیاسی دباؤ کے ذریعے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو مغربی طاقتوں کی پالیسیوں کے مطابق چلنا پڑتا ہے، جس سے ان کی خود مختاری میں کمی آتی ہے۔

مزید برآں، مغرب کی ترقی میں سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کی برتری بھی ایک اہم عنصر ہے۔ جب جدید سائنسی ترقی تیسری دنیا کے ممالک میں دستیاب نہیں ہوتی تو یہ ان کی ترقی کی رفتار کو سست کر دیتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی سائنسی تحقیق اکثر تیسری دنیا کے مسائل کے حل کی بجائے اپنے مفادات کے لیے ہوتی ہے، جس سے وہاں کی مقامی آبادیوں کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچتا۔

یہ صورتحال ایک خطرناک دائرے کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جہاں مغرب کی ترقی تیسری دنیا کے استحصال پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تیسری دنیا کے ممالک میں معاشی عدم توازن، سیاسی عدم استحکام، اور سماجی عدم مساوات پیدا

ہوتی ہے۔ اگرچہ مغربی ممالک ترقی کی بلند سطح پر پہنچتے ہیں، لیکن تیسری دنیا کے لوگ بنیادی انسانی حقوق اور وسائل سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

مغرب کی ترقی میں تیسری دنیا کے استحصال کے مسئلے کی گہرائی میں جانے کے لیے، ہمیں مختلف جہات پر توجہ دینا ہوگی۔ یہ استحصال بنیادی طور پر معاشی، سماجی، سیاسی، اور ماحولیاتی پہلوؤں میں پھیلا ہوا ہے۔

اقتصادی استحصال کی صورت میں، مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کی بڑی کارپوریشنز تیسری دنیا کے وسائل کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ یہ کمپنیاں عموماً کم مزدوری کے اخراجات کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک میں اپنی پیداوار منتقل کرتی ہیں۔ اس عمل میں وہ مقامی مزدوروں کی کم تنخواہوں، غیر محفوظ کام کے حالات، اور صحت کے کمزور نظام کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، کپڑا بنانے کی صنعت میں مزدوروں کو اکثر لمبے گھنٹوں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جبکہ انہیں معقول تنخواہ نہیں دی جاتی۔ اس کے نتیجے میں مقامی معیشتوں میں اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ غربت اور بے روزگاری کی شرح بڑھتی ہے۔

سماجی استحصال کا ایک پہلو یہ ہے کہ مغربی ثقافت تیسری دنیا کے ممالک میں مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ مغرب کی جانب سے ثقافتی مصنوعات، جیسے کہ فلمیں، میوزک، اور فیشن، مقامی ثقافتوں کو متاثر کرتی ہیں اور نوجوانوں میں مغربی طرز زندگی کی محبت پیدا کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی روایات، زبانیں، اور ثقافتی شناخت دھندلا جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ، جب مقامی ثقافتیں مغرب کی

ثقافت کے سامنے سر جھکاتی ہیں تو یہ عوامی سطح پر خود اعتمادی میں کمی کا باعث بنتی ہیں، جس کے نتیجے میں ایک ذہنی استحصال بھی پیدا ہوتا ہے۔

سیاسی پہلو بھی استحصال کی ایک اہم جہت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں تیسری دنیا کے ممالک کی سیاست میں مداخلت کرتی ہیں، اکثر اپنی اقتصادی اور سیاسی مفادات کے حصول کے لیے۔ یہ مداخلت کبھی کبھی براہ راست فوجی کارروائی کی صورت میں بھی ہوتی ہے، جیسے کہ مختلف ترقی پذیر ممالک میں جنگی حالات یا سیاسی بے چینی کے دوران۔ اس طرح کی مداخلت کے نتیجے میں مقامی حکومتوں کی خود مختاری متاثر ہوتی ہے، اور ان کے فیصلے اکثر مغربی ممالک کے مفادات کے مطابق ہوتے ہیں، نہ کہ عوام کے حقیقی مفادات کے تحت۔

ماحولیاتی استحصال بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی بڑی صنعتی کمپنیاں تیسری دنیا کے ممالک میں ماحولیات کے قوانین کو نظر انداز کرتی ہیں، جس سے مقامی آبادیوں کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ یہ کمپنیاں اکثر ایسے اقدامات کرتی ہیں جو ماحولیاتی آلودگی کو بڑھاتے ہیں، جیسے کہ زہریلے فضلے کا غیر مناسب طریقے سے تصرف۔ اس کے نتیجے میں مقامی کمیونٹیز میں صحت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں، اور زمین و پانی کی آلودگی کی وجہ سے زراعت میں مشکلات پیش آتی ہیں۔

مزید برآں، یہ استحصال بعض اوقات نئے اقسام کے استعماری نظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جہاں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک تیسری دنیا کے ممالک میں مالیاتی اداروں کے ذریعے اپنی طاقت کو بڑھاتے ہیں۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے،

جیسے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک، ترقی پذیر ممالک کو قرض دیتے ہیں، لیکن ان قرضوں کی شرائط اکثر عوامی مفاد کے بجائے مغربی مفادات کے حق میں ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں، ترقی پذیر ممالک اپنے وسائل کا بڑا حصہ قرض کی ادائیگی کے لیے مختص کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جس سے عوامی فلاح و بہبود کے منصوبے متاثر ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مغرب کی ترقی میں تیسری دنیا کا استحصال ایک سنگین مسئلہ ہے، جو عالمی معاشرتی توازن کو متاثر کرتا ہے۔ اس استحصال کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ بین الاقوامی سطح پر باہمی تعاون، شفافیت، اور انصاف کے اصولوں کو فروغ دیا جائے، تاکہ ترقی کے فوائد تمام انسانیت کے لیے مشترک ہوں اور نہ کہ صرف چند طاقتور ممالک کے لیے۔

مغرب کی ترقی کے لیے تیسری دنیا کا استحصال ایک اہم مسئلہ ہے، جو عالمی سطح پر معاشی، سماجی، سیاسی، اور ماحولیاتی عدم توازن پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ مغربی ممالک اپنی ترقی کی بلندیوں پر پہنچے ہیں، مگر تیسری دنیا کے عوام بنیادی حقوق، وسائل، اور خودمختاری سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس استحصال کو ختم کرنے کے لیے عالمی سطح پر شفافیت، انصاف، اور شراکت داری کی ضرورت ہے، تاکہ ترقی کے فوائد سب کے لیے مساوی ہوں۔ یہ ایک چیلنج ہے، لیکن ایک عادلانہ اور منصفانہ عالمی معاشرت کے قیام کے لیے یہ ناگزیر ہے۔

مغرب و مشرق کے درمیان ہم آہنگی وقت کی ضرورت

مغرب و مشرق کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کا قیام ایک اہم اور ضروری عمل ہے، جو مختلف جہات سے ممکن ہے۔ اس کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے جو صرف دعووں تک محدود نہ ہوں، بلکہ حقیقی تبدیلیوں کا باعث بنیں۔

سب سے پہلے، ثقافتی تبادلے کا فروغ ضروری ہے۔ دونوں خطوں کے لوگوں کے درمیان ثقافتی، تعلیمی، اور سماجی رابطوں کو بڑھانے کے ذریعے مشترکہ تجربات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ مختلف ثقافتی تقریبات، فنون لطیفہ، اور تعلیمی پروگرامز کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کی ثقافت، روایات، اور اقدار کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سمجھ بوجھ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

دوسرا اہم پہلو اقتصادی تعاون کا ہے۔ مغرب اور مشرق کے درمیان تجارتی معاہدے اور سرمایہ کاری کے مواقع کو فروغ دینے سے دونوں خطوں کی معیشتوں کو مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ مشترکہ ترقیاتی منصوبے، جیسے کہ انفراسٹرکچر کی بہتری، زراعت، اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں شراکت داری، دونوں جانب سے اقتصادی فوائد حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ تعاون نہ صرف اقتصادی تعلقات کو مضبوط کرتا ہے بلکہ باہمی اعتماد بھی پیدا کرتا ہے۔

سماجی انصاف اور انسانی حقوق کے معاملات میں بھی باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ مغرب کو مشرقی ممالک کی اندرونی امور میں مداخلت کے بجائے، ان کی سماجی ترقی اور حقوق کی فراہمی کے لیے حمایت فراہم کرنی چاہیے۔ اسی طرح، مشرقی ممالک کو بھی مغرب کی انسانی حقوق کی روایات کو سمجھنا اور اپنانا چاہیے۔ اس حوالے سے، عالمی فورمز اور تنظیموں کے ذریعے مشترکہ کوششیں کی جا سکتی ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں تعاون بھی اہم ہے۔ مشترکہ تعلیمی پروگرامز، طلبہ کی تبادلے کی اسکیمیں، اور تحقیقی تعاون دونوں خطوں کی علمی و فکری ترقی کے لیے مثبت ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کے اقدامات سے نوجوان نسل میں باہمی احترام اور تعاون کا جذبہ پیدا ہوگا۔

علاوہ ازیں، ماحولیاتی مسائل کے حل کے لیے مشترکہ اقدامات کی ضرورت ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی ایک عالمی مسئلہ ہے جس کا اثر دونوں خطوں پر پڑتا ہے۔ مشترکہ تحقیقی منصوبے، ٹیکنالوجی کی منتقلی، اور ماحولیات کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھنے سے مؤثر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

سیاسی سطح پر اعتماد سازی کے اقدامات ضروری ہیں۔ دونوں خطوں کے درمیان سیاسی مکالمے اور مذاکرات کے ذریعے ایک دوسرے کی تشویشات کو سمجھنے اور ان کے حل کی کوششیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ مذاکرات اور مکالمے ایک دوسرے کی ثقافت، اقدار، اور ضروریات کا احترام کرتے ہوئے کیے جانے چاہئیں۔

سب سے پہلے، بین الاقوامی فورمز اور پلیٹ فارمز کا استعمال بڑھانا ضروری ہے۔ جیسے کہ اقوام متحدہ، جی20 ، اور دیگر بین الاقوامی تنظیمیں دونوں خطوں کے ممالک کو ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رکھ سکتی ہیں۔ ان پلیٹ فارمز کے ذریعے مشترکہ مسائل، جیسے کہ غربت، صحت، اور تعلیم، پر بحث کی جا سکتی ہے، اور اس کے حل کے لیے مشترکہ منصوبے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی تعاون نہ صرف ممالک کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرتا ہے بلکہ عالمی چیلنجز کا مشترکہ حل بھی پیش کرتا ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ عوامی سطح پر تعاون کی راہ ہموار کرنا ضروری ہے۔ عوامی سطح پر رابطے، جیسے کہ نوجوانوں کے لئے مشترکہ پروگرامز، کھیل، اور فنون لطیفہ کی تقریبات، دونوں ثقافتوں کے درمیان تعلقات کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ جب لوگ ایک دوسرے کی ثقافت کو قریب سے دیکھتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی روایات اور عقائد کا احترام کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، دونوں طرف سے ایک دوسرے کے بارے میں غلط فہمیاں کم ہوں گی، جو اتحاد کے لیے اہم ہیں۔

سوشل میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے بھی باہمی رابطے کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ آن لائن پلیٹ فارمز پر مشترکہ سرگرمیاں، ویبنیارز، اور تعلیمی فورمز، دونوں خطوں کے لوگوں کو اپنی آوازوں کو سننے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ

طریقے نوجوان نسل کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کو فروغ دیتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کے خیالات، مسائل، اور تجربات کو سمجھنے کا موقع دیتے ہیں۔

مغرب اور مشرق کے درمیان فکری مکالمے کی بھی ضرورت ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے دانشوروں، علما، اور ماہرین کو ایک پلیٹ فارم پر لانے سے مشترکہ فکری مسائل پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ یہ مکالمے نہ صرف نظریاتی اختلافات کو کم کرنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ مشترکہ بصیرت پیدا کرتے ہیں جو اتحاد کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

علاوہ ازیں، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرنے والی تنظیموں کا کردار بھی اہم ہے۔ مختلف ممالک میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) عوامی سطح پر تعاون کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یہ تنظیمیں مختلف ثقافتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کے مواقع فراہم کر سکتی ہیں، جس سے دوطرفہ روابط مستحکم ہوتے ہیں۔

ان سب کے علاوہ، معاشی عدم توازن کے مسائل کا حل بھی ضروری ہے۔ مغربی ممالک کو تیسری دنیا کے ممالک میں سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں، تاکہ مقامی معیشت کو فروغ دیا جا سکے۔ جب مقامی لوگ خود کفیل ہوں گے، تو وہ عالمی سطح پر اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے قابل ہوں گے۔ اس سے نہ صرف اقتصادی استحکام حاصل ہو گا بلکہ سیاسی اور سماجی استحکام بھی ممکن ہو گا۔

آخر میں، اتحاد کا حقیقی مقصد عوام کی زندگیوں میں بہتری لانا ہونا چاہیے۔ جب دونوں خطے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، تو اس کا براہ راست اثر عوام کی فلاح و بہبود پر پڑتا ہے۔ اتحاد کا یہ عمل صرف حکومتی سطح پر نہیں بلکہ عوامی سطح پر بھی ہونا چاہیے، تاکہ سب لوگ اس کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔

ان اقدامات کے ذریعے مغرب و مشرق کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کو عملی شکل دی جا سکتی ہے، جس کے نتیجے میں ایک بہتر، مستحکم، اور پائیدار عالمی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ یہ ایک چیلنج ہے، مگر عزم اور یکجہتی کے ساتھ اس چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، تاکہ عالمی امن، استحکام، اور ترقی کو فروغ دیا جا سکے۔

مغرب و مشرق کے درمیان اتحاد کے قیام سے کچھ افراد یا گروہوں کے مفادات متاثر ہو سکتے ہیں، خاص طور پر ان طاقتوں کے جو موجودہ صورتحال سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ان مفادات کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے، جیسے کہ سیاسی، اقتصادی، یا سماجی۔

پہلا اہم پہلو طاقتور سیاسی گروہ ہیں، جنہیں اپنے اثر و رسوخ کو برقرار رکھنے میں دشواری محسوس ہو سکتی ہے۔ جب مغرب و مشرق کے ممالک آپس میں مل کر کام کرتے ہیں، تو یہ عالمی سطح پر طاقت کے توازن کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، کچھ ممالک یا سیاسی رہنما اپنی حکمرانی کو کھو سکتے ہیں، جو کہ ان کے لیے نقصان دہ ہو گا۔

دوسرا پہلو اقتصادی مفادات کا ہے۔ بڑی کارپوریشنز اور مالی ادارے موجودہ عالمی نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جہاں ترقی پذیر ممالک کے وسائل کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ اگر مغرب و مشرق کے درمیان اتحاد سے ترقی پذیر ممالک اپنے حقوق اور وسائل کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو یہ کارپوریشنز کے مفادات کو متاثر کر سکتا ہے۔ ان کے منافع میں کمی آ سکتی ہے، جس سے وہ اس اتحاد کے خلاف ہو سکتے ہیں۔

سماجی طور پر بھی کچھ افراد یا گروہ موجودہ صورتحال کو برقرار رکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ گروہ عموماً اس بات سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ اتحاد کے نتیجے میں ان کی طاقت، اثر و رسوخ، یا شناخت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس لیے، وہ اتحاد کے خلاف منفی تشہیر یا سرگرمیوں میں مصروف ہو سکتے ہیں۔

ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے چند اقدامات کیے جا سکتے ہیں:

1۔ شفافیت اور معلومات کی فراہمی :عوامی سطح پر اتحاد کے فوائد کے بارے میں آگاہی بڑھانا ضروری ہے۔ اس کے لیے معلوماتی مہمات، ورکشاپس، اور بحث و مباحثوں کا انعقاد کیا جا سکتا ہے، تاکہ لوگ اتحاد کے مثبت اثرات کو سمجھ سکیں۔

2۔ انحصار کا کم کرنا :اگر کچھ ممالک یا ادارے اتحاد کے ذریعے اپنے مفادات کو خطرے میں دیکھتے ہیں، تو ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے معاشی اور

سیاسی خود مختاری کو فروغ دینا ہو گا۔ ترقی پذیر ممالک کو اپنے وسائل کو بہتر طور پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

3۔ مفادات کا توازن :اتحاد کے مقاصد کو طے کرتے وقت یہ دیکھنا ہو گا کہ کس طرح مختلف مفادات کو متوازن کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے بات چیت اور مذاکرات کی ضرورت ہو گی، جہاں تمام فریقین کی تشویشات کو سنجیدگی سے لیا جائے۔

4۔ عوامی شرکت :عوام کو اتحاد کے عمل میں شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ جب لوگ خود کو اس عمل کا حصہ سمجھیں گے، تو وہ اس کے فوائد کے لیے زیادہ حمایت کر سکیں گے، اور ان کے خدشات کو بھی دور کیا جا سکے گا۔

5۔ بین الاقوامی تعاون :مغرب و مشرق کے ممالک کو عالمی اداروں کے ذریعے آپس میں مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ عالمی سطح پر مفادات کی حفاظت کی جا سکے۔ اس تعاون سے کمزور ممالک کی حمایت بھی ممکن ہو سکے گی۔

خلاصہ یہ کہ مغرب و مشرق کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کا قیام ممکن ہے، مگر اس کے لیے ثقافتی تبادلے، اقتصادی تعاون، سماجی انصاف، تعلیمی تعاون، ماحولیاتی مسائل، اور سیاسی مکالمے کے ذریعے حقیقی اور مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے۔ مغرب و مشرق کے درمیان اتحاد کے قیام سے خاص افراد یا گروہوں کے مفادات متاثر ہو سکتے ہیں جب تک یہ اقدامات عملی طور پر نافذ نہیں ہوں گے،

تب تک اتحاد صرف ایک خواب رہے گا۔ ان چیلنجز کا مؤثر حل تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عوامی آگاہی، شفافیت، اور مفادات کے توازن کے اصولوں پر عمل کیا جائے، تاکہ اتحاد کو ایک مستحکم اور مثبت شکل دی جا سکے۔

مذہب، دین اور سامراج

مذہب اور دین میں فرق قابل غور ہے۔ مذہب عموماً روحانی اور عباداتی پہلوؤں تک محدود سمجھا جاتا ہے، جیسے انفرادی اور اجتماعی عبادات، عقائد، اور مخصوص مذہبی رسومات، جیسے نماز، روزہ، حج، زکات وغیرہ۔ مذہب کا مقصد روحانی تسکین، ذاتی اخلاقیات، اور خدا کے ساتھ فرد کے تعلقات کو مضبوط کرنا ہے۔ جب ہم مذہب کو صرف عباداتی اور رسمی معاملات تک محدود کر دیتے ہیں تو یہ فرد کی ذاتی زندگی تک محدود ہو جاتا ہے اور سماجی، سیاسی، یا معاشی مسائل میں براہ راست مداخلت نہیں کرتا۔

دین اس کے برعکس ایک جامع نظام ہے جو نہ صرف روحانی اور عباداتی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو شامل کرتا ہے، جیسے کہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، قانونی، اور معاشی نظام۔ دین ایک مکمل طرزِ زندگی اور دنیاوی و اخروی فلاح کا ضامن ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق، دین ایک جامع نظام ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کو دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبے کو خدا کی مرضی کے مطابق ڈھال سکیں۔

اس میں عدل و انصاف، حقوق و فرائض، معیشت کا نظام، سیاست، تعلیم، اور حتیٰ کہ بین الاقوامی تعلقات کے اصول بھی شامل ہیں۔

نوآبادیاتی اور سامراجی طاقتوں نے ہمیشہ ان معاشرتی ڈھانچوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ان کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ سامراجی طاقتیں مذہب کی روحانی یا رسمی نوعیت کے فروغ میں براہ راست رکاوٹ نہیں بنتیں کیونکہ مذہب کا یہ پہلو ان کے مفادات کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں ہوتا۔ اگر مذہب کو صرف ذاتی عبادات اور رسومات تک محدود رکھا جائے، تو افراد اپنی ذاتی زندگی میں عبادات انجام دیتے رہتے ہیں اور یہ سرگرمی نظامِ حکومت، سیاست، یا معیشت کو براہ راست متاثر نہیں کرتی۔

تاہم، دین جو کہ ایک جامع نظامِ زندگی کی نمائندگی کرتا ہے، نوآبادیاتی طاقتوں کے لیے بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ جب دین انسانوں کو عدل، مساوات، اور خدا کے قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے، تو یہ موجودہ استحصالی اور مادہ پرست نظاموں کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین انسانوں کو بیدار کرتا ہے کہ وہ ظلم و ستم، ناانصافی، اور اقتصادی و سیاسی استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ دین ایک آزاد اور منصفانہ نظام کی بات کرتا ہے جو کہ نوآبادیاتی اور سامراجی مفادات کے خلاف جاتا ہے۔

اسی لیے سامراجی طاقتیں مذہب کی روحانی اور رسمی صورت کو فروغ دینے کی حمایت کرتی ہیں جبکہ دین کی سیاسی، سماجی، اور معاشی جہتوں کو محدود کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دین کا وہ پہلو جو عوام کو ان کے حقوق و فرائض کا شعور دیتا ہے، انہیں سماجی انصاف اور معاشرتی برابری کی تعلیم دیتا ہے، وہ طاقتور استحصالی طبقے کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ طاقتیں دین کی ان جہتوں کو دبانے یا ان میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

سامراجی طاقتیں چاہتی ہیں کہ لوگ مذہب کو صرف عبادات تک محدود رکھیں تاکہ وہ اپنے سیاسی، سماجی، اور معاشی حقوق کی بابت سوچنے کے قابل نہ ہوں۔ دین کا سیاسی اور معاشرتی شعور، جیسے اسلام کا نظام عدل و انصاف، معیشت کا اسلامی ماڈل، اور اسلامی سیاست کی تعلیمات ان طاقتوں کے لیے خطرناک ہیں کیونکہ یہ ان کے استحصالی نظاموں کے خلاف بغاوت کا سبب بن سکتے ہیں۔ دین اور مذہب میں الجھاؤ پیدا کر کے، یہ طاقتیں عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہیں کہ دین صرف روحانی اور عباداتی پہلو تک محدود ہے اور دنیاوی مسائل میں اس کا کوئی کردار نہیں۔

دینِ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو صرف فرد کی روحانی زندگی تک محدود نہیں بلکہ سیاست، معیشت، قانون، اور معاشرتی عدل کے ہر پہلو کو مخاطب کرتا ہے۔ سامراجی طاقتوں کا یہ مفاد ہے کہ دین کے ان پہلوؤں کو دبایا جائے تاکہ

ان کے استحصالی نظام کو کوئی چیلنج نہ کر سکے۔ اس کے برعکس، اسلامی تعلیمات کا مقصد ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا ہے جو انسانی حقوق اور انصاف کو فروغ دے اور معاشرتی استحصال کا خاتمہ کرے۔ اس لیے مسلمانوں کو دین کے ان جامع پہلوؤں کا شعور بیدار کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ممکن ہو۔ دین کا یہ شعور ہی وہ طاقت ہے جو استحصالی نظاموں کو چیلنج کر سکتا ہے اور انسانی زندگی کو بہتر اور منصفانہ طریقے سے چلانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

مشرق و مغرب کے مسائل، وجہ اور حل

مشرق میں سائنس، فلسفہ، اور عقل کو اہمیت دینے کے بجائے جذبات اور احساسات کو فوقیت دینے کے نتیجے میں کئی معاشرتی، علمی، اور فکری نقصانات سامنے آئے ہیں۔ یہ رجحان علم اور ترقی کے مختلف شعبوں میں پیچھے رہ جانے کا باعث بنا، اور معاشرتی و علمی زوال کی وجوہات میں شامل ہے۔

نقصانات:

1۔ علمی ترقی میں رکاوٹ:

جذبات اور احساسات پر مبنی سوچ کا زیادہ انحصار، عقل و منطق اور سائنسی تحقیق کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے علمی و فکری مکالمے میں دلیل و برہان کی بجائے روایات، احساسات، اور غیر سائنسی تصورات کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مشرقی معاشرے سائنسی ترقی اور فکری ارتقاء میں مغرب سے پیچھے رہ گئے۔

2۔ سائنسی سوچ کی کمی:

مشرقی معاشروں میں جذبات پر مبنی تعلیم و تربیت نے سائنسی طریقہ کار، تجربہ، اور تحقیق کو پسِ پشت ڈال دیا، جس کی وجہ سے سائنسی سوچ کو اپنانے میں مشکلات پیش آئیں۔ سائنسی طریقہ کار میں تحقیق، تنقید، اور دلیل کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، مگر مشرقی معاشروں میں غیر سائنسی عقائد اور جذباتی اپروچ غالب رہی، جو علمی ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بنی۔

3۔ معاشرتی پس ماندگی:

جب معاشرتیں احساسات اور جذبات کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہیں، تو ان میں عدل و انصاف کا معیار متاثر ہوتا ہے۔ جذبات پر مبنی فیصلے اکثر غیر متوازن اور وقتی ہوتے ہیں، جس سے سماجی ڈھانچے میں استحکام کی کمی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں قانونی اور سیاسی نظاموں میں منطقی اصولوں کی جگہ ذاتی مفادات اور جذباتی سوچ نے لے لی، جس سے معاشرتی عدم استحکام اور ناانصافی بڑھی۔

4۔ فکری جمود:

جذباتی سوچ کی غلبے کے باعث فکری ترقی اور فلسفیانہ مباحث جمود کا شکار ہو گئے۔ عقل و فلسفہ کے ذریعے سوچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان مختلف نقطہ نظر اور خیالات پر غور کرے اور سوالات پوچھے، مگر جذباتی ماحول میں سوالات کو

دبایا جاتا ہے اور روایتی خیالات کو چیلنج کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں فکری جمود اور تخلیقی سوچ میں کمی واقع ہوئی۔

5۔ تقدیر پرستی اور وہمی و افسانوی خیالات کا فروغ:

جذبات اور احساسات پر مبنی سوچ اکثر وہمی و افسانوی اور غیر منطقی خیالات کو فروغ دیتی ہے، جس کی وجہ سے معاشرتوں میں تقدیر پرستی اور غیر سائنسی عقائد نے جگہ بنا لی۔ اس سے انسان اپنی ذمہ داریوں اور عقل کے استعمال سے دور ہوتا گیا، اور عملی مسائل کے حل کے لیے علمی طریقہ کار اپنانے کی بجائے غیبی مدد کا انتظار کرنے لگا۔

تدارک:

1۔ عقل اور علم کی بحالی:

معاشرتی و علمی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ عقل و منطق کو دوبارہ مرکزی حیثیت دی جائے۔ تعلیم کے نظام میں سائنسی سوچ، تحقیق، اور تنقیدی اپروچ کو فروغ دینا چاہیے تاکہ لوگ دلیل و برہان کی اہمیت کو سمجھیں اور عملی مسائل کا منطقی حل تلاش کرنے کی عادت اپنائیں۔

2۔ سائنسی تعلیم اور ریسرچ پر زور:

مشرقی معاشروں میں سائنسی تحقیق اور ریسرچ کے لیے بہتر مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومتوں اور تعلیمی اداروں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تحقیق اور اختراع کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ نوجوان نسل سائنسی سوچ کو اپنائے اور عالمی سطح پر ترقی کی دوڑ میں شامل ہو سکے۔

3۔ تعلیمی نصاب میں اصلاحات:

جذبات پر مبنی تعلیم کے بجائے تعلیمی نظام میں عقل و منطق اور سائنسی اصولوں پر مبنی نصاب متعارف کرایا جانا چاہیے۔ فلسفے، سائنس، اور منطق کی تعلیم کو عام کیا جائے تاکہ طلبہ میں تنقیدی سوچ اور فکری گہرائی پیدا ہو۔ اس سے معاشرت میں جذباتی سوچ کی بجائے علمی بنیادوں پر فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گی۔

4۔ فکری آزادی اور مکالمے کو فروغ:

مختلف نظریات اور خیالات پر کھلے دل سے بحث و مباحثے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مشرقی معاشروں میں فکری جمود کو توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ سوالات پوچھنے، نئے خیالات کو آزمانے، اور مختلف نقطہ نظر کو سمجھنے کی ثقافت کو فروغ دیا جائے۔

5۔ جذبات اور عقل کے توازن کی تعلیم:

جذبات کو بالکل نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں، مگر عقل و جذبات کا ایک متوازن رشتہ قائم کرنا ضروری ہے۔ جذبات کو صحیح سمت میں استعمال کرنے اور ان کے ساتھ عقل و منطق کا استعمال کرنے سے فرد اور معاشرت دونوں میں استحکام اور ترقی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اسلام بھی عقل و جذبات میں توازن کا درس دیتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بار بار غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مشرق میں جذبات اور احساسات کو عقل و منطق پر فوقیت دینے کے باعث معاشرتی اور علمی سطح پر زوال کا سامنا رہا ہے۔ اس کا تدارک عقل، علم، اور سائنسی اصولوں کی بحالی کے ذریعے ممکن ہے۔ تعلیم، تحقیق، اور فکری آزادی کے ذریعے جذباتی فیصلوں کے بجائے علمی و منطقی بنیادوں پر مبنی معاشرتی نظام تشکیل دیا جا سکتا ہے، جس سے مشرقی معاشرے عالمی سطح پر ترقی کی دوڑ میں شامل ہو سکتے ہیں۔

مغربی معاشروں میں مسائل اور ان کا حل:

مغربی معاشروں میں مادیت (Materialism) کے فروغ نے کئی سنگین سماجی اور نفسیاتی مسائل کو جنم دیا ہے، جیسے ڈپریشن، تنہائی، اور خودکشی۔ مادیت انسان کو زیادہ سے زیادہ دولت، مادی آسائشوں، اور جسمانی خوشیوں کے حصول پر مرکوز

کرتی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے باطنی سکون اور روحانی تسکین سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس ماحول میں، افراد اکثر اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں، لیکن اندرونی طور پر خالی محسوس کرتے ہیں، کیونکہ مادیت انسان کی روحانی اور جذباتی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

مادیت اور سماجی مسائل:

مادیت کی دوڑ میں انسان اپنی فطری اور روحانی قدروں سے دور ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی توجہ مادی اشیاء اور دنیاوی آسائشوں پر مرکوز ہوتی ہے، تو وہ اپنی روحانی خوشیوں اور قلبی سکون کو نظرانداز کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، زندگی میں مقصد کی کمی اور وجودی بحران پیدا ہوتا ہے، جو ڈپریشن، تنہائی، اور احساسِ بے معنی پن کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مغربی معاشروں میں خودکشی کی شرح میں اضافہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مادی کامیابی کے باوجود افراد خود کو اندر سے خالی محسوس کرتے ہیں۔

مذہب کا کردار:

مذہب اس تمام بحران کا ایک مؤثر اور دیرپا حل فراہم کر سکتا ہے، کیونکہ مذہب انسان کی روحانی اور اخلاقی ضروریات کو پورا کرتا ہے، جو مادیت کے دائرے میں

ممکن نہیں۔ مذہب کا بنیادی کام انسان کو اس کے حقیقی مقصد سے روشناس کرانا ہے، جس میں روحانی تسکین، اخلاقی قدریں، اور انسانی زندگی کی معنویت شامل ہیں۔ مذہب انسان کو مادیت کی سطحی دوڑ سے نکال کر حقیقی معنوی اور قلبی سکون کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

1۔ روحانی تسکین کا ذریعہ :

مذہب انسان کو خدا سے جوڑتا ہے اور روحانی سکون عطا کرتا ہے، جو مادیت میں مفقود ہوتا ہے۔ نماز، دعا، ذکر، اور عبادات انسان کے قلب کو سکون فراہم کرتی ہیں اور اسے یہ احساس دلاتی ہیں کہ دنیاوی مادی اشیاء ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ ایک اعلیٰ اور روحانی مقصد کی طرف زندگی کی رہنمائی ہونی چاہیے۔

2۔ زندگی کا مقصد اور معنویت :

مادیت میں انسان اپنی زندگی کا مقصد دنیاوی کامیابی اور مادی اشیاء کے حصول تک محدود کر دیتا ہے، جبکہ مذہب انسان کو اس سے اوپر اٹھ کر ایک اعلیٰ مقصد دیتا ہے۔ مثلاً، اسلام میں زندگی کا مقصد اللہ کی رضا اور خدمتِ خلق ہے، جو انسان کو ایک وسیع تر کائناتی نظام کا حصہ بنا دیتا ہے، اور یہ احساس انسان کو اندرونی خوشی اور سکون بخشتا ہے۔

3۔ سماجی ربط اور تعلقات کی بحالی :

مذہب انسان کو دوسروں کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مغربی معاشروں میں تنہائی کا ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ مادیت نے انسانوں کو انفرادی مفادات کی طرف راغب کیا ہے۔ مذہب اجتماعی زندگی، معاشرتی روابط، اور انسانیت کی خدمت پر زور دیتا ہے، جس سے انسان خود کو دوسروں سے جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مثلاً اسلام میں زکوۃ، صدقہ، اور اخوت کے تصورات انسان کو اپنے معاشرتی دائرے میں فعال اور مفید بناتے ہیں۔

4۔ اخلاقی قدریں :

مادیت کی دوڑ میں اخلاقی قدریں اکثر پسِ پشت ڈال دی جاتی ہیں، جبکہ مذہب انسان کو اخلاقی اصولوں اور انسانی اقدار پر قائم رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ انصاف، دیانت، عاجزی، اور صبر جیسی اسلامی تعلیمات انسان کو ایک متوازن اور پرسکون زندگی گزارنے میں مدد دیتی ہیں۔

5۔ نفسیاتی اور ذہنی سکون :

مذہب میں موجود عبادات اور روحانی معمولات جیسے نماز اور ذکر الٰہی، ذہنی اور نفسیاتی سکون کا سبب بنتے ہیں۔ مذہب انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ مصیبتیں اور مشکلات زندگی کا حصہ ہیں اور ان کا سامنا صبر اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ کیا

جائے۔ یہ یقین کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، انسان کو مشکل حالات میں مضبوط رہنے اور نا امیدی سے بچنے کی قوت فراہم کرتا ہے۔

6۔ خودکشی کی روک تھام:

مذہب خودکشی کو ایک بڑا گناہ قرار دیتا ہے اور انسان کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھے۔ خودکشی اکثر اس وقت ہوتی ہے جب انسان اپنے وجود کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ مذہب انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے اور اسے دنیا کی مشکلات کو عارضی سمجھنا چاہیے۔

مغربی معاشروں میں مادیت کے باعث جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کا حل روحانی اور معنوی زندگی کی طرف رجوع کرنے میں ہے۔ مذہب انسان کو نہ صرف مادی دوڑ سے نکال کر ایک روحانی اور اخلاقی زندگی کی طرف بلاتا ہے بلکہ اسے اندرونی سکون، زندگی کی معنویت، اور اجتماعی خوشحالی کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔ مغربی دنیا میں ڈپریشن، تنہائی، اور خودکشی جیسے مسائل کے حل کے لیے مذہب ایک مضبوط اور مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ لوگ اپنی مادی خواہشات کے ساتھ ساتھ روحانی ضروریات کو بھی اہمیت دیں۔

مشرق و مغرب کی دو انتہاؤں کے درمیان کی راہ:

مشرق کا عقل کو ترک کرنا اور مغرب کا جذبات اور مذہب کو پس پشت ڈالنا دونوں ہی بڑے فکری اور معاشرتی نقصانات کا باعث بنے ہیں۔ ان دونوں رویوں نے دنیا کے دو اہم خطوں، مشرق اور مغرب، کو متوازن ترقی سے دور کر دیا ہے، اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دونوں معاشرتیں فکری انتہاؤں کا شکار ہوئیں۔ مشرق نے جہاں جذبات اور روایات پر مبنی نظام کو فوقیت دی، وہاں مغرب نے صرف مادی اور سائنسی سوچ کو اپنانے کے نتیجے میں جذبات اور مذہب کو ترک کر دیا، جس کے منفی اثرات دونوں خطوں میں دیکھنے کو ملے۔

مشرق میں عقل و منطق اور سائنسی تحقیق کو نظرانداز کرنے سے علمی و سائنسی ترقی میں رکاوٹ آئی۔ فلسفہ، سائنس، اور جدید فکر کی جگہ جذباتی، روایتی، اور غیر سائنسی عقائد نے لے لی، جس کی وجہ سے مشرق جدید دنیا کی سائنسی ترقی سے پیچھے رہ گیا۔ جب عقل اور تحقیق کو ترک کیا گیا تو غیر سائنسی عقائد اور رسومات کا فروغ ہوا، جس کی وجہ سے لوگوں نے مادی دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے جذباتی اور غیبی مدد پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ یہ رویہ معاشرتی ترقی اور علمی پیش رفت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بنا۔ تقلیدی ذہنیت کے غلبے نے نئی سوچ اور تحقیق کی حوصلہ شکنی کی، جس کے نتیجے میں فکری جمود پیدا ہوا اور تخلیقی سوچ کی کمی رہی۔

مغرب نے سائنس اور مادی ترقی کی خاطر مذہب، روحانیت اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کیا۔ اس کے نتیجے میں روحانی و اخلاقی زوال دیکھنے کو ملا، جہاں لوگ مادی کامیابیوں کے باوجود اندرونی طور پر خالی اور تنہا محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ڈپریشن، ذہنی مسائل، اور خودکشی کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ مغربی معاشرتوں میں مادیت اور مادی ترقی کی خاطر انسانی جذبات اور روحانی ضرورتوں کو نظر انداز کیا گیا، جس سے زندگی کا مقصد صرف دنیاوی کامیابیاں اور مالی مفادات بن گئے، جس نے انسانی تعلقات، خوشی، اور سکون کو متاثر کیا۔ مذہبی اور روحانی اصولوں کو نظر انداز کرنے کے باعث مغربی معاشرتوں میں اخلاقی اقدار کی کمی ہوئی۔ معاشرتی تعلقات کمزور پڑ گئے، اور فردیت پسندی نے سماجی ہم آہنگی کو ختم کر دیا۔

دنیا کو عقل اور جذبات دونوں کے درمیان ایک متوازن راستہ اپنانا ہو گا۔ مشرق کو سائنسی اور فکری ترقی کی طرف واپس آنا ہو گا، اور مغرب کو روحانیت اور جذباتی توازن کو دوبارہ اپنانا ہو گا۔ دونوں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انسان صرف مادی یا روحانی نہیں بلکہ ایک متوازن زندگی میں دونوں کی اہمیت ہے۔ مشرق کو عقل و منطق، سائنسی تعلیم اور تحقیق کی بحالی پر زور دینا ہو گا۔ سائنسی طریقہ کار اور تنقیدی سوچ کو تعلیمی نظام کا حصہ بنایا جانا چاہیے تاکہ نئی نسل جدید سائنس اور فلسفے میں اپنا مقام بنا سکے۔ مذہبی اصولوں اور روحانیت کو عقل

کے ساتھ جوڑنا ضروری ہے تاکہ مذہب محض جذبات اور رسومات تک محدود نہ رہے بلکہ عملی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

مغرب کو روحانیت، مذہب، اور اخلاقی اصولوں کو اپنی زندگی میں دوبارہ شامل کرنا ہوگا تاکہ مادیت پرستی کے باعث پیدا ہونے والے خلاء کو بھر سکیں۔ اخلاقی و روحانی تعلیم کو دوبارہ معاشرتی اور تعلیمی ڈھانچوں میں جگہ دی جائے۔ مغربی معاشرتوں کو فردیت پسندی سے باہر نکل کر اجتماعی ذمہ داری اور انسانی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا ہوگا تاکہ معاشرتی ہم آہنگی بحال ہو سکے۔

دونوں خطوں کے درمیان علمی و فکری مکالمے کی ضرورت ہے تاکہ تجربات کا تبادلہ کیا جا سکے اور سیکھا جا سکے کہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ مشرق کو مغرب سے سائنسی ترقی اور تحقیق کی اہمیت سیکھنی چاہیے، جبکہ مغرب کو مشرق سے روحانیت، جذبات، اور اخلاقی اصولوں کو دوبارہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دونوں خطوں میں تعلیمی نظام کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ وہ ایک متوازن شخصیت کی تعمیر کرے۔ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ جذباتی اور روحانی تربیت بھی دی جائے تاکہ طلباء میں متوازن شخصیت اور بہتر معاشرتی رویوں کا فروغ ہو سکے۔

دنیا کے بڑے مسائل، جیسے ماحولیاتی تبدیلی، غربت، اور جنگ، کا حل ایک متوازن، عقل و جذبات دونوں کو شامل کرنے والی اپروچ سے ممکن ہے۔ اگر دنیا کو حقیقی خوشحالی اور مسرت حاصل کرنی ہے، تو مادی اور روحانی پہلوؤں کے درمیان توازن پیدا کرنا ہوگا۔

مشرق اور مغرب دونوں ہی فکری انتہاؤں کا شکار رہے ہیں۔ مشرق نے عقل و سائنس کو چھوڑا، اور مغرب نے مذہب اور جذبات کو ترک کیا۔ اس سے دونوں معاشرتوں میں زوال اور عدم توازن پیدا ہوا۔ دنیا کے لیے ایک متوازن لائحہ عمل وہی ہو سکتا ہے جو دونوں خطوں کی خوبیوں کو یکجا کرے: مشرق میں سائنسی سوچ اور عقل کی بحالی، اور مغرب میں روحانیت اور جذباتی توازن کی اہمیت۔ یہ متوازن رویہ انسانیت کو ایک نئی راہ دکھا سکتا ہے، جس سے حقیقی خوشحالی اور اندرونی سکون حاصل ہو سکتا ہے، اور دنیا کے بڑے مسائل کو دانشمندی اور شعور کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔

سائنسی ترقی اور تیسری دنیا کی محرومیاں

سائنسی ترقی، عالمی دنیا کی ٹھیکیداری، اور تیسری دنیا کی محرومیاں اور استحصال ایک اہم موضوع ہے جس میں کئی مختلف پہلو شامل ہیں۔ سائنسی ترقی نے جہاں دنیا کے مختلف حصوں میں معاشرتی، اقتصادی، اور صحت کے لحاظ سے بہتری لانے کی کوششیں کی ہیں، وہیں اس ترقی کی شروعات اور ترقی کی رفتار میں عالمی طاقتوں کے کردار نے تیسری دنیا کے ممالک میں بے شمار چیلنجز پیدا کیے ہیں۔

سائنسی ترقی کے فوائد میں صحت کے شعبے میں انقلاب شامل ہے، جہاں ویکسینیشن، جدید علاج، اور ٹیکنالوجی نے متعدد بیماریوں کے خلاف مؤثر جنگ میں مدد فراہم کی ہے۔ مگر یہ ترقی اکثر ان ممالک کے لیے محدود رہی ہے جو جدید سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری نہیں کر سکتے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں بنیادی ڈھانچے کی کمی، مالی وسائل کی عدم دستیابی، اور تعلیم کی محدود رسائی نے ان کی ترقی کو سست کر دیا ہے۔

عالمی دنیا کی ٹھیکیداری کی بات کریں تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی طاقت اور اثر و رسوخ نے عالمی معاشی نظام پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ بہت

سی بین الاقوامی تنظیمیں، جیسے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک، نے ترقی پذیر ممالک کے اقتصادی پروگراموں کی منصوبہ بندی میں اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن اکثر یہ پروگرام مقامی ضروریات اور حالات کو مد نظر نہیں رکھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں معاشی استحصال اور عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔

تیسری دنیا کی محرومیاں بھی سائنسی ترقی کے تناظر میں اہم ہیں۔ ان ممالک کے لوگ نہ صرف جدید ٹیکنالوجی سے محروم ہیں بلکہ ان کے پاس اس کی تعلیم اور استعمال کی سہولیات بھی کم ہیں۔ یہاں کی حکومتیں اکثر سیاسی عدم استحکام، بدعنوانی، اور اقتصادی مشکلات کا شکار ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے عوام کو صحت، تعلیم، اور بنیادی سہولیات فراہم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

استحصال کے پہلوؤں کی بات کریں تو یہ زیادہ تر عالمی کمپنیوں کے ذریعے ہوتا ہے، جو تیسری دنیا کے وسائل کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مثلاً، زراعت، معدنیات، اور دیگر قدرتی وسائل کی کھدائی میں عالمی کمپنیوں کی دلچسپی نے مقامی آبادیوں کے حقوق اور وسائل کی چوری کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف معاشی عدم مساوات کو بڑھاتی ہے بلکہ مقامی ثقافت اور روایات کو بھی متاثر کرتی ہے۔

مزید برآں، سائنسی ترقی کے کچھ نتائج، جیسے کہ جینیاتی تبدیلی کی تکنیکیں، بھی تیسری دنیا کے ممالک میں عوام کی صحت اور معیشت پر منفی اثر ڈال سکتے ہیں۔ جب بڑی کارپوریشنز اپنی مصنوعات کو ان مارکیٹس میں پہنچتی ہیں، تو یہ اکثر مقامی فصلوں اور طریقوں کو متاثر کرتی ہیں، جس سے مقامی کسان اور کاروبار متاثر ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ سائنسی ترقی، اگرچہ اہم ہے، مگر اس کی راہ میں عالمی ٹھیکیداری اور تیسری دنیا کی محرومیاں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر ترقی پذیر ممالک اپنی سائنسی ترقی کی رفتار کو بڑھانا چاہتے ہیں تو انہیں بین الاقوامی تعاون، مقامی حکومتوں کی اصلاحات، اور عوامی تعلیم پر توجہ دینا ہوگی۔ اس کے بغیر، تیسری دنیا کے ممالک ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے، جبکہ عالمی طاقتیں ان کے وسائل کا استحصال کرتی رہیں گی۔ یہ صورتحال ایک عادلانہ اور مستحکم عالمی معاشرت کے قیام کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے، جس کا حل صرف عالمی سطح پر باہمی تعاون اور شراکت داری کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

یہ سوچ کہ تیسری دنیا کے ممالک کے لوگ کاہل، سست، بدعنوان، اور جاہل ہیں، ایک گمراہ کن اور غیر منصفانہ تاثر ہے۔ اس طرح کی سوچ نہ صرف حقیقت سے بہت دور ہے بلکہ یہ سامراجی اور استحصالی بیانیے کا تسلسل ہے، جس کے تحت ترقی یافتہ ممالک اپنی پوزیشن کو جائز اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک کی ترقی میں حائل رکاوٹیں محض عوامی رویے یا ثقافت کی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ اس کے پیچھے تاریخی، سیاسی، اقتصادی، اور سماجی عوامل کا ایک جال ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کا موجودہ حالت میں ہونا تاریخی نوآبادیاتی دور کی وجہ سے ہے۔ جب مغربی سامراجی طاقتوں نے ان ممالک پر قبضہ کیا تو ان کی معیشت، سماج، اور سیاسی ڈھانچوں کو بری طرح متاثر کیا۔ انہوں نے ان ممالک کے وسائل کا استحصال کیا، مقامی ثقافتوں کو کمتر سمجھا، اور لوگوں کو غلامی، غربت، اور محرومی کی دلدل میں دھکیل دیا۔ اس کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں، کیونکہ نوآبادیاتی نظام نے ان ممالک کی خود انحصاری اور اقتصادی ترقی کی بنیادوں کو تباہ کر دیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ بدعنوانی، سیاسی عدم استحکام، اور کمزور ادارے صرف تیسری دنیا کے مسائل نہیں ہیں بلکہ یہ مسائل ترقی یافتہ دنیا میں بھی موجود ہیں۔ تاہم، جب تیسری دنیا کے ممالک کی بات آتی ہے تو ان مسائل کو خاص طور پر نمایاں کیا جاتا ہے، تاکہ ان کی ناکامی کا ذمہ دار انہیں ہی ٹھہرایا جا سکے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عالمی طاقتوں کے اقدامات، جیسا کہ غیر منصفانہ تجارتی معاہدے، سیاسی مداخلت، اور قرضوں کے بوجھ نے بھی ان مسائل کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔

تیسری دنیا کے عوام میں محنت، تخلیقی صلاحیت، اور ترقی کی خواہش کی کوئی کمی نہیں۔ ان ممالک میں لوگ اکثر انتہائی مشکل حالات میں بھی بہترین کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ تیسری دنیا کی عوام اکثر محدود وسائل اور مشکلات کے باوجود نہ صرف اپنی بلکہ پوری دنیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ بہت سی کامیاب شخصیات، سائنسدان، اور ماہرین انہی ممالک سے آئے ہیں، جنہوں نے عالمی سطح پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کے لوگ کاہل یا سست نہیں، بلکہ وہ مواقع کی کمی، نظام کی خرابی، اور عالمی استحصالی نظام کے باعث پیچھے ہیں۔

بدعنوانی اور جاہلیت کی جڑیں بھی اکثر استحصالی نظام میں ہوتی ہیں۔ جب لوگوں کو بنیادی ضروریات سے محروم رکھا جاتا ہے، تعلیم تک رسائی نہیں ہوتی، اور روزگار کے مواقع محدود ہوتے ہیں، تو بدعنوانی اور جاہلیت کا فروغ ہونا لازمی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ان ممالک پر عائد کردہ غیر منصفانہ اقتصادی پابندیاں، قرضوں کی شرائط، اور بین الاقوامی تنظیموں کی پالیسیوں نے ان ممالک کی اقتصادی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔

تیسری دنیا کے لوگوں کو ایک جامع اور منصفانہ نظام کی ضرورت ہے، جس میں تعلیم، صحت، اور روزگار کے مواقع یکساں طور پر دستیاب ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں بین الاقوامی سطح پر برابری اور احترام کا حق دیا جائے، نہ کہ انہیں

کمتر یا ناکام سمجھا جائے۔ عالمی طاقتوں کو بھی اپنی پالیسیوں کا از سرنو جائزہ لینا ہوگا، تاکہ ان ممالک کو خود انحصاری اور ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

خلاصہ یہ کہ تیسری دنیا کی ناکامی کا الزام صرف وہاں کے لوگوں پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس کے پیچھے عالمی نظام کی ناانصافی، نوآبادیاتی اثرات، اور استحصالی پالیسیاں بھی ذمہ دار ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان مسائل کو عالمی تناظر میں دیکھا جائے اور ان کے حل کے لیے عالمی تعاون اور اصلاحات کو فروغ دیا جائے۔ ترقی یافتہ دنیا کو چاہیے کہ وہ ان ممالک کے لوگوں کو محض کاہل یا ناکام کہنے کے بجائے ان کی ترقی کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں مدد فراہم کرے، تاکہ پوری دنیا کی ترقی اور خوشحالی ممکن ہو سکے۔

تیسری دنیا کو ماضی کے استعماری استحصال کے نتیجے میں ردعمل دینے کے لیے نہایت دانشمندانہ، منصفانہ، اور حکمت عملی پر مبنی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی قانون عدالت کے تناظر میں یہ ردعمل ایک منصفانہ، اخلاقی، اور انصاف پر مبنی معاشرتی و اقتصادی نظام کی بنیاد پر ہونا چاہیے، جو ظلم، استحصال، اور ناانصافی کی ہر شکل کو ختم کرنے پر زور دیتا ہے۔

سب سے پہلے، اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم اور شعور کی بیداری انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ علم حاصل کرنا ہر

مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ علم کے ذریعے ہی ایک قوم اپنی تاریخی غلطیوں، حقوق کی پامالی، اور عالمی طاقتوں کے استحصالی نظام کا ادراک کر سکتی ہے۔ تیسری دنیا کو اپنے عوام میں تعلیم اور شعور کی بیداری پر توجہ دینی چاہیے تاکہ انہیں اپنے حقوق اور عالمی نظام کے خدوخال کی مکمل سمجھ حاصل ہو۔

دوسری جانب، اسلامی تعلیمات کے مطابق، ایک خود انحصار معاشرہ ہی حقیقی آزادی اور استحکام حاصل کر سکتا ہے۔ سورہ رعد، آیت 11 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اپنی اقتصادی اور سائنسی ترقی کے لیے خود انحصاری کی طرف قدم بڑھانا ہو گا۔ صنعتی، سائنسی، اور اقتصادی میدان میں ترقی کے لیے اپنے وسائل اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہو گا تاکہ عالمی طاقتوں پر انحصار کم سے کم ہو۔

انصاف کے قیام کی بات کی جائے تو اسلامی قانون عدالت میں انصاف کا اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سورہ النساء، آیت 58 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کو پہنچاؤ، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ تیسری دنیا کو اپنے داخلی نظام عدل و انصاف کو مضبوط کرنا ہو گا تاکہ بدعنوانی، ناانصافی، اور استحصال کا

خاتمہ ہو سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی و سماجی نظام میں اصلاحات کی جائیں، قانون کی بالادستی ہو، اور عدالتوں میں انصاف بلا امتیاز فراہم کیا جائے۔

عالمی سطح پر ایک منصفانہ اقتصادی نظام کے قیام کی ضرورت بھی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں زکوٰۃ، صدقات، اور معاشرتی فلاح و بہبود کے اصولوں کی خاصی اہمیت ہے۔ اسی طرح، تیسری دنیا کے ممالک کو عالمی سطح پر ایک منصفانہ اقتصادی نظام کے قیام کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے، جہاں سودی نظام کی بجائے شراکت داری اور منصفانہ تجارت کے اصولوں کو فروغ دیا جائے۔ عالمی مالیاتی اداروں کی جانب سے عائد کردہ ظالمانہ شرائط اور قرضوں کے بوجھ کے خلاف اسلامی بنیادوں پر معیشت کا نظام لانے کی کوشش کی جائے تاکہ تیسری دنیا کے ممالک اقتصادی آزادی حاصل کر سکیں۔

اتحاد و اتفاق کا اصول بھی اسلامی تعلیمات میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ سورہ آل عمران، آیت 103 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے عالمی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کرنا ہوگا۔ یہ اتحاد سیاسی، اقتصادی، اور ثقافتی سطح پر ہونا چاہیے، تاکہ استحصالی طاقتوں کا مقابلہ کیا جا سکے اور عالمی مسائل کا حل اسلامی اصولوں کے مطابق تلاش کیا جا سکے۔

ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا بھی اسلامی اصولوں کے تحت نہایت اہم ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا قول ہے کہ ظالم کے خلاف اور مظلوم کی مدد کے لیے نکلنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ تیسری دنیا کو عالمی فورمز پر ظلم، ناانصافی اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ انہیں اقوام متحدہ، او آئی سی اور دیگر بین الاقوامی تنظیموں میں اپنا موقف مضبوطی سے پیش کرنا چاہیے، اور استحصالی نظام کے خلاف اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔

قدرتی وسائل کا تحفظ اور ان کا انصاف پر مبنی استعمال بھی اسلامی قانون کے مطابق نہایت اہم ہے۔ زمین اور اس کے وسائل اللہ کی امانت ہیں اور ان کا استعمال انصاف اور توازن کے ساتھ ہونا چاہیے۔ سورہ الاعراف، آیت 31 میں فرمایا گیا کہ کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے قدرتی وسائل کو عالمی استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے مؤثر پالیسی بنانی ہوگی اور ان وسائل کے استعمال کو مقامی عوام کی فلاح کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔

اسلامی اصولوں کے مطابق ایک منصفانہ سیاسی اور سماجی نظام بھی ضروری ہے، جس میں عوام کے حقوق کا تحفظ ہو اور ان کے فیصلوں کا احترام کیا جائے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے نظام حکومت میں اسلامی اصولوں کے مطابق

اصلاحات کرنی ہوں گی، تاکہ عوام کی حقیقی نمائندگی ہو اور عوامی فلاح و بہبود کو مد نظر رکھا جائے۔

خلاصہ یہ کہ تیسری دنیا کو اپنے ردعمل میں اسلامی اصولوں کی روشنی میں منصفانہ، حکمت عملی پر مبنی، اور خود انحصاری کی طرف قدم بڑھانا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ، عالمی سطح پر انصاف کے قیام اور ظالمانہ نظام کے خاتمے کے لیے اتحاد اور مؤثر حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی، تاکہ ان کے حقوق کا تحفظ ہو اور انہیں عالمی ترقی کی دوڑ میں برابری کے مواقع حاصل ہوں۔ اس طرح نہ صرف تیسری دنیا کے ممالک خود کو استحکام اور ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں گے بلکہ عالمی معاشرے میں بھی ایک منصفانہ اور مستحکم نظام کے قیام میں اہم کردار ادا کر سکیں گے۔

انفلیشن ٹیکس ,کاغذی کرنسی اور اسلام

انفلیشن ٹیکس (Inflation Tax) ایک مالیاتی عمل ہے جس کے ذریعے حکومت یا مرکزی بینک نوٹ چھاپ کر معیشت میں پیسے کی مقدار بڑھاتے ہیں، جس سے اشیاء و خدمات کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور کرنسی کی قدر گر جاتی ہے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کے پاس موجود پیسے کی حقیقی خریداری طاقت کم ہو جاتی ہے، یعنی وہ اپنی موجودہ دولت سے پہلے جتنا سامان یا خدمات خرید سکتے تھے، اب اتنی نہیں خرید سکتے۔ اس طرح، عوام کی دولت کی قدر کم ہو کر حکومت یا مرکزی بینک کے لیے اضافی وسائل پیدا ہو جاتے ہیں، جیسے کہ نئے نوٹ چھاپنے سے حاصل ہونے والی آمدنی۔ اس کو" ٹیکس "اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک غیر محسوس طریقے سے عوام کی دولت سے حکومت کو مالی فائدہ پہنچاتا ہے، حالانکہ اسے روایتی ٹیکس کی طرح براہ راست وصول نہیں کیا جاتا۔

نیو کالونیل طاقتوں کے زیر اثر بینکنگ سسٹم، خصوصاً مرکزی بینک، انفلیشن ٹیکس کے ذریعے جو منافع کماتے ہیں، اسے اسلامی نقطہ نظر سے ربا) سود (کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی معیشت میں ربا کی ممانعت کا مقصد لوگوں کے

درمیان مالیاتی استحصال کو روکنا ہے، اور انفلیشن ٹیکس بھی بالواسطہ طور پر اسی نوعیت کا استحصالی عمل ہے۔

انفلیشن ٹیکس ایک ایسا میکانزم ہے جس کے ذریعے حکومتیں یا مرکزی بینک زیادہ نوٹ چھاپ کر قیمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں کرنسی کی قدر گر جاتی ہے اور عوام کے پاس موجود پیسے کی حقیقی خریداری طاقت کم ہو جاتی ہے۔ اس کا فائدہ حکومت اور مرکزی بینک کو ہوتا ہے کیونکہ نئے چھاپے گئے نوٹوں کے ذریعے وہ اپنی مالی ضروریات پوری کرتے ہیں، جبکہ عوام کی دولت کی حقیقی قدر کم ہو جاتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے، ربا ایک ایسا مالیاتی عمل ہے جس میں قرض دینے والے کو بلا محنت اور بلا خطرہ منافع کمانے کا موقع ملتا ہے، جبکہ مقروض یا دوسرا فریق نقصان اٹھاتا ہے۔ انفلیشن ٹیکس اسی طرح کا ایک عمل ہے جس میں مرکزی بینک اور حکومت بلا کسی حقیقی محنت کے منافع کماتے ہیں اور عوام پر بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ جس طرح سود میں قرض دینے والے کو بغیر کسی خطرے یا نقصان کے منافع حاصل ہوتا ہے، اسی طرح انفلیشن کے ذریعے مرکزی بینک اور حکومت اپنے مالیاتی فوائد بڑھاتے ہیں، جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ربا کی ممانعت اس بنیاد پر ہے کہ کسی بھی غیر منصفانہ اضافہ کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اگرچہ انفلیشن براہ راست قرض پر سود نہیں ہے، لیکن یہ ایک مالیاتی عمل ہے جس میں عوام کی دولت کی قدر کو کم کیا جاتا ہے اور اس سے حکومت یا مرکزی بینک کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔ یہ سود کی طرح ہی ایک غیر منصفانہ عمل ہے، کیونکہ اس میں عوام کی دولت کی حقیقی قیمت کو زائل کر دیا جاتا ہے۔

اسلامی معیشت کا بنیادی مقصد معاشی انصاف اور استحصال سے پاک معیشت کی تشکیل ہے۔ انفلیشن ایک ایسا مالیاتی ہتھیار ہے جس کے ذریعے نیو کالونیل طاقتیں اور مرکزی بینک عوام کی دولت کو خاموشی سے کم کرتے ہیں۔ یہ عمل اسلامی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ اس میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور غریب عوام اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

اسلامی معیشت میں ایسے استحصالی میکانزم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سود سے پاک مالیاتی نظام کے ذریعے معاشی استحکام اور دولت کی منصفانہ تقسیم کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں سونے اور چاندی پر مبنی کرنسی کی اہمیت ہے جو کرنسی کی قدر کو مستحکم رکھتی ہے اور افراط زر جیسے مسائل کو روکنے میں مدد دیتی ہے۔

انفلیشن ٹیکس، جو نیو کالونیل بینکنگ سسٹم کا ایک اہم حصہ ہے، اسلامی ربا کی طرح ایک استحصالی میکانزم ہے کیونکہ اس میں عوام کی دولت کی قدر کو کم کیا جاتا ہے اور حکومت یا مرکزی بینک کو بلا محنت منافع حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی معیشت ایسے میکانزم کو ناپسندیدہ اور غیر شرعی سمجھتی ہے اور ایک شفاف اور منصفانہ نظام کے قیام پر زور دیتی ہے جس میں ہر فرد کو مساوی مواقع ملیں اور استحصال کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

مثال سے سمجھیں, انفلیشن ٹیکس کے ذریعے عوام کا استحصال اس طرح ہوتا ہے کہ جب حکومت یا مرکزی بینک معیشت میں پیسے کی مقدار بڑھاتے ہیں، تو اس سے اشیاء اور خدمات کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ نتیجتاً، لوگوں کی خریداری طاقت کم ہو جاتی ہے اور ان کی دولت کی حقیقی قدر زائل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک غیر محسوس طریقہ ہوتا ہے جس میں حکومت عوام سے بلاواسطہ طور پر دولت حاصل کرتی ہے، جیسے کہ ایک پوشیدہ ٹیکس۔

مثال کے طور پر فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس 100,000 روپے ہیں اور وہ اس سے ایک سال میں 10 مہینے کا راشن خرید سکتا ہے۔ اب حکومت یا مرکزی بینک نوٹ چھاپ کر معیشت میں پیسے کی مقدار بڑھا دیتے ہیں، جس سے افراط زر (Inflation) پیدا ہوتا ہے اور راشن کی قیمتیں 20 فیصد بڑھ جاتی ہیں۔ اب وہی شخص 100,000 روپے سے صرف 8 مہینے کا راشن خرید سکے گا کیونکہ

راشن کی قیمت بڑھ چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کی خریداری طاقت 2 مہینے کی راشن کے برابر کم ہو گئی ہے۔

اس طرح، حکومت یا مرکزی بینک نے بغیر کسی براہِ راست ٹیکس لگائے عوام کی دولت کا کچھ حصہ حاصل کر لیا، کیونکہ نئے پیسے چھاپنے سے ان کی مالی ضروریات پوری ہوئیں جبکہ عوام کی دولت کی حقیقی قدر کم ہو گئی۔ یہ عمل عوام کے استحصال کی ایک پوشیدہ شکل ہے کیونکہ وہ اپنی بچت یا آمدنی سے وہی چیزیں نہیں خرید سکتے جو وہ پہلے خرید سکتے تھے، اور یہ سارا فائدہ حکومت یا مرکزی بینک کو ہو رہا ہوتا ہے۔

سیاسی اسلام اور علمی اسلام

سیاسی اسلام اور علمی اسلام دو مختلف نظریاتی زاویے ہیں، جن کے نتیجے میں بنیادی اسلامی موضوعات کی متنوع تعبیریں پیدا ہوتی ہیں۔ ان اختلافات کو علم نفسیات کے حوالے سے سمجھنے کے لیے انسانی ذہن اور سماجی رویوں کے پس منظر میں تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں دونوں کے مابین فرق اور اس کی نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے:

1۔ سیاسی اسلام کا نفسیاتی تجزیہ:

سیاسی اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسلامی احکام اور اصولوں کو حکومت، قانون، اور سماج کے نظم و ضبط کے لیے عملی طور پر نافذ کیا جائے۔ اس نقطہ نظر کا مقصد دین کو زندگی کے ہر پہلو میں نافذ کرنا اور معاشرتی انصاف کے ساتھ ساتھ ایک جامع اسلامی ریاست قائم کرنا ہوتا ہے۔ نفسیات میں، اس رویے کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے:

-کنٹرول اور اختیار کا احساس :سیاسی اسلام کے پیروکار افراد یا گروہ عموماً ایک طاقتور اختیار یا اثرورسوخ کا حامل بننا چاہتے ہیں تاکہ وہ اسلامی اقدار کو نافذ کر

سکیں۔ نفسیاتی طور پر یہ رویہ طاقت، کنٹرول، اور قیادت کی ضرورت سے جڑا ہوا ہوتا ہے، جس میں معاشرتی نظم و ضبط کو دین کی روشنی میں قائم کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔

-اجتماعی شناخت :سیاسی اسلام کے ماننے والے اکثر اجتماعی شناخت کی تلاش میں ہوتے ہیں، جہاں مذہبی عقائد اور سیاسی طاقت کو ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ نفسیات میں اس کو گروہی شناخت (group identity) کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے، جہاں افراد اپنی ذات کو ایک بڑے دینی اور سیاسی مقصد کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں، جس سے انہیں مقصدیت اور سماجی قبولیت کا احساس ملتا ہے۔

-عقائد کی حفاظت کا خوف :سیاسی اسلام کا نفسیاتی پہلو ایک دفاعی میکانزم کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مغربی اثرات، لبرل ازم، اور سیکولرزم کے مقابلے میں اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے یہ ایک ردعمل ہوسکتا ہے۔ یہ خوف پر مبنی ردعمل ہوتا ہے جس کا مقصد اپنے عقائد کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔

2۔ علمی اسلام کا نفسیاتی تجزیہ:

علمی اسلام زیادہ تر فکری، فلسفیانہ، اور نظریاتی پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔ یہ اسلام کی تعبیریں، فکر، اجتہاد، اور علم کی روشنی میں پیش کرتا ہے، اور دینی موضوعات

پر گہرے غور و فکر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر اس کے چند پہلو یوں سمجھے جا سکتے ہیں:

-خود شناسی اور انفرادی ترقی :علمی اسلام کے پیروکار زیادہ تر افراد انفرادی سطح پر خود کو بہتر بنانے اور اپنی دینی فہم کو گہرائی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر یہ رویہ خود شناسی (self-actualization) اور انفرادی شناخت کی تلاش سے منسلک ہوتا ہے، جس میں فرد اپنی روحانی ترقی اور فکری بالیدگی پر زور دیتا ہے۔

-غیر یقینی صورتحال کا سامنا :علمی اسلام میں سوالات اور اختلافی نظریات کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے، جو بعض افراد کے لیے غیر یقینی صورتحال (uncertainty tolerance)کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر، یہ رویہ ایک کھلے ذہن اور علمی فکر کی نشوونما کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں فرد مختلف نظریات اور تعبیروں کو برداشت کرنے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

-فکری آزادی کی تلاش :علمی اسلام کا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ماننے والے فکر اور اجتہاد کے ذریعے آزادی اور انفرادی شعور کی طرف مائل

ہوتے ہیں۔ یہ فلسفیانہ یا ذہنی آزادی کی نفسیات کے ساتھ جڑا ہوا ہے، جس میں فرد خود کو علمی بحث اور تحقیق کے ذریعے بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

3۔ نفسیاتی اختلافات اور ان کے نتائج:

-طاقت اور تسلیم کیے جانے کی ضرورت :سیاسی اسلام میں افراد زیادہ تر سماجی قبولیت اور طاقت کے حصول میں دلچسپی رکھتے ہیں، جبکہ علمی اسلام میں زیادہ زور انفرادی ترقی اور اندرونی سکون پر ہوتا ہے۔ سیاسی اسلام کے ماننے والے افراد اکثر سماج میں اپنے مذہبی نظریات کو نافذ کر کے اپنا وجود تسلیم کرانا چاہتے ہیں، جبکہ علمی اسلام کے پیروکار فکر و دانش کے ذریعے تسلیم کیے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

-عقائد کا دفاع بمقابلہ عقائد کی تحقیق :سیاسی اسلام زیادہ تر اپنی مذہبی شناخت کے دفاع پر زور دیتا ہے، جبکہ علمی اسلام میں عقائد کی مسلسل تحقیق اور ان کی نئی تشریح کی اہمیت ہوتی ہے۔ نفسیات میں دفاعی ردعمل اور تجزیاتی ردعمل کے درمیان یہی فرق دیکھا جاتا ہے۔

4۔ ممکنہ تصادم اور ہم آہنگی:

نفسیاتی اعتبار سے، جب دو مختلف نظریاتی رویے—سیاسی اسلام اور علمی اسلام—آپس میں ٹکراتے ہیں، تو اس سے سماجی اور فکری تصادم پیدا ہو سکتا ہے۔ تاہم،

اگر دونوں رویے ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں اور ایک توازن قائم کیا جائے، تو سماجی اور دینی ترقی میں اہم پیشرفت ہو سکتی ہے۔

علم نفسیات کے تناظر میں، اس تجزیے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دونوں روایات کے پیچھے مختلف ذہنی اور فکری تقاضے کام کرتے ہیں، اور انہیں سمجھنے کے لیے انفرادی اور سماجی نفسیات کی روشنی میں غور و فکر ضروری ہے۔

علمی اسلام اور سیاسی اسلام کی روشوں پر چلنے والے افراد یا تحریکیں مختلف تاریخی اور عصری حوالوں میں نمایاں رہی ہیں۔ ان کی مثالیں دونوں رویوں کے نظریاتی فرق اور عملی اطلاق کو واضح کرتی ہیں۔

1۔ علمی اسلام کی مثالیں:

علمی اسلام کے پیروکار زیادہ تر اسلامی تعلیمات اور فلسفے پر زور دیتے ہیں، اور اجتہاد، علمی مباحث اور نظریات کی گہرائی میں جاکر اسلامی فکر کی نئی تشریحات پیش کرتے ہیں۔

مثالیں:

-امام محمد غزالی :(1058-1111) امام غزالی نے فلسفہ، تصوف، اور اسلامی فقہ میں گہرا کام کیا اور اسلامی فکر کی ایک گہری تشریح کی۔ ان کی کتاب احیاء علوم

الدین علمی اسلام کی ایک عظیم مثال ہے، جس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کو تصوف اور روحانیت کے ساتھ جوڑا۔

-مولانا جلال الدین رومی :(1273-1207) رومی کے افکار تصوف اور روحانیت پر مبنی ہیں، جو اسلامی تعلیمات کی گہری روحانی تعبیر پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اور تصانیف میں اسلامی عقائد کو فرد کی روحانی ترقی سے منسلک کیا گیا ہے۔

-علامہ محمد اقبال :(1938-1877) اقبال نے علمی اسلام کی روش پر چلتے ہوئے اجتہاد اور اسلامی فکر کی نئی تعبیریں پیش کیں۔ ان کی شاعری اور فلسفہ اسلام کی فکر کو جدید دور میں لانے کی کوشش کرتا ہے، اور وہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

-آیت اللہ مرتضی مطہری :(1979-1920) مطہری ایک ایرانی اسلامی فلسفی تھے جنہوں نے اسلامی نظریات کو جدید فلسفیانہ مباحث میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان کی کتابیں اور دروس علمی اسلام کی بہترین مثالیں ہیں، جو اسلامی تعلیمات کی گہرائی کو عصری مسائل سے جوڑتے ہیں۔

-فضل الرحمن :(1919-1988) ایک پاکستانی نژاد اسلامی اسکالر، فضل الرحمن نے اسلامی اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا اور اسلامی فکر کو جدید انسانی علوم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

2۔ سیاسی اسلام کی مثالیں:

سیاسی اسلام کے پیروکار دین کو ایک سماجی اور سیاسی نظام کے طور پر نافذ کرنے پر زور دیتے ہیں اور اسلامی اصولوں کے تحت حکومت اور معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل کے خواہاں ہوتے ہیں۔

مثالیں:

-امام خمینی :(1902-1989) امام خمینی سیاسی اسلام کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ انہوں نے ایران میں اسلامی انقلاب کی قیادت کی اور ولایت فقیہ کے نظریے کی بنیاد پر اسلامی جمہوری ریاست قائم کی۔ ان کا مقصد اسلامی قوانین کو حکومت کے تمام شعبوں میں نافذ کرنا تھا۔

-سید قطب :(1906-1966) سید قطب مصر میں اخوان المسلمون کے ایک نمایاں نظریاتی رہنما تھے۔ ان کی کتاب معالم فی الطریق میں انہوں نے اسلامی حکومت کے قیام کی اہمیت پر زور دیا اور مغربی سیکولرزم اور جدیدیت کے خلاف

سخت موقف اختیار کیا۔ سید قطب کا نظریہ عالمی سطح پر سیاسی اسلام کی تحریکوں پر اثر انداز ہوا۔

-مولانا مودودی:(1903-1979) مولانا مودودی نے سیاسی اسلام کے نظریات پیش کیے اور جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ وہ اسلامی حکومت اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے قائل تھے اور انہوں نے مغربی جمہوریت کے برخلاف اسلامی نظام حکومت کا ایک واضح خاکہ پیش کیا۔

-اخوان المسلمون :(Muslim Brotherhood) یہ مصر میں قائم ہونے والی ایک اسلامی سیاسی جماعت ہے جو پورے عرب دنیا میں اسلامی قوانین اور اصولوں کو سماجی اور سیاسی نظام میں نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

-طالبان :طالبان کی تحریک بھی سیاسی اسلام کی ایک مثال ہے، جس میں وہ اسلامی قوانین کو حکومتی سطح پر نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی حکومت کا بنیادی مقصد شریعت کی بنیاد پر ایک اسلامی ریاست قائم کرنا تھا۔

3۔ نفسیاتی تجزیہ:

-علمی اسلام کے پیروکار :علمی اسلام پر چلنے والے افراد زیادہ تر خود شناسی، روحانی ترقی، اور فکری آزادگی پر زور دیتے ہیں۔ ان کی نفسیات میں مذہبی تعلیمات کا گہرا فہم، تحقیق اور کھلے ذہن سے قبولیت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

- سیاسی اسلام کے پیروکار :سیاسی اسلام کے پیروکار زیادہ تر اجتماعی طاقت، قیادت، اور اسلامی اصولوں کو سماجی نظم و ضبط میں نافذ کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیات میں اجتماعی شناخت، کنٹرول کی خواہش، اور اپنی مذہبی شناخت کو سماجی سطح پر نافذ کرنے کی شدید طلب پائی جاتی ہے۔

دونوں روشوں کی پیروی کرنے والے افراد اپنے مخصوص دائرہ کار میں اسلامی نظریات کو عملی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کی مثالیں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ کیسے اسلامی فکر کے مختلف زاویے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں میں اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔

سیاسی اسلام اور علمی اسلام کے علماء کے مابین اختلافات:

سیاسی اسلام اور علمی اسلام کے علماء کے مابین اختلافات کو دور کرنے اور انہیں انتہا پسند ہونے سے بچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو فکری مکالمے، رواداری، اور تعمیری گفتگو کو فروغ دیں۔ یہ تدابیر اسلامی تعلیمات کی گہرائی میں جاکر یکجہتی، فکری وسعت، اور انسانی خدمت کے اصولوں پر مبنی ہو سکتی ہیں۔ چند اہم روشیں درج ذیل ہیں:

1۔ فکری مکالمے اور مباحثے کا فروغ:

علمی اور سیاسی اسلام کے علماء کو باہمی مکالمے اور مباحثے میں شامل کرنا ایک ضروری قدم ہے۔ جب علماء ایک دوسرے کے نظریات کو سنجیدگی سے سنتے اور سمجھتے ہیں، تو فکری انتہاپسندی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

-مذاکرے کے فورمز :اسلامی جامعات اور دیگر علمی ادارے ایسے فورمز اور کانفرنسیں منعقد کریں جہاں دونوں گروہوں کے علماء ایک دوسرے کے ساتھ بحث و مباحثہ کر سکیں۔ اس سے غلط فہمیاں دور ہوں گی اور اختلافات کے باوجود احترام کی فضا پیدا ہو گی۔

- علمی بحث کو تشدد سے دور رکھنا :علماء کو تاکید کی جائے کہ فکری اختلافات کو تشدد، انتہاپسندی یا جبر کے ذریعے حل نہ کریں، بلکہ فکری بنیادوں پر بحث کو آگے بڑھائیں۔

2۔ مشترکہ دینی مقاصد پر زور دینا:

سیاسی اور علمی اسلام کے علماء کو ایک ایسے مشترکہ پلیٹ فارم پر لایا جا سکتا ہے جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں اور مقاصد پر متفق ہوں، جیسے:

- انصاف، امن، اور انسانی حقوق :دونوں گروہوں کے درمیان مکالمے میں اسلامی اصولوں جیسے انصاف، مساوات، انسانی حقوق، اور فلاح و بہبود پر زور دیا جائے تاکہ معاشرتی ترقی اور عالمی سطح پر مثبت کردار ادا کیا جا سکے۔

- خدمت خلق اور معاشرتی بہبود :علماء کو اس بات پر زور دینا چاہیے کہ اسلام کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہے، جس میں غربت کا خاتمہ، تعلیم کا فروغ، اور انسانی خدمت شامل ہے۔ یہ مشترکہ مقاصد انہیں ایک دوسرے کے قریب لا سکتے ہیں۔

3۔ انتہاپسندی کی نفسیاتی وجوہات پر تحقیق اور آگاہی:

انتہاپسندی کو روکنے کے لیے اس کی نفسیاتی اور سماجی وجوہات کو سمجھنا ضروری ہے۔

-نفسیاتی مشاورت اور تربیت :علماء کے لیے ایسے پروگرام منعقد کیے جائیں جہاں انہیں نفسیاتی طور پر تربیت دی جائے کہ وہ فکری لچک، برداشت، اور مختلف نقطہ نظر کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ اس سے انتہاپسندی اور جزمیت میں کمی آئے گی۔

-سماجی مسائل کو بہتر طور پر سمجھنا :بعض اوقات علماء معاشرتی، اقتصادی، یا سیاسی مسائل کو دین کے ساتھ جوڑ کر ان کا انتہاپسندانہ حل پیش کرتے ہیں۔ انہیں ان مسائل کا بہتر فہم حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کا حل تشدد یا شدت پسندی کے بغیر نکالا جا سکے۔

4۔ اسلامی تعلیمات کے درست فہم کی حوصلہ افزائی:

بعض اوقات فکری انتہاپسندی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو غلط طور پر سمجھا جاتا ہے یا ان کی تشریح سخت اور محدود انداز میں کی جاتی ہے۔ علماء کو اسلامی تعلیمات کی صحیح اور متوازن تفہیم کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

-روحانی تعلیمات کا فروغ :علماء کو یہ سکھانا ضروری ہے کہ اسلام نہ صرف سیاسی و معاشرتی نظام ہے بلکہ یہ روحانی طور پر انسان کی فلاح کا دین بھی ہے۔ تصوف اور روحانیت کی اہمیت کو اجاگر کر کے علماء کو متوازن دینی نظریات کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔

-اجتہاد کی اہمیت :اجتہاد کے تصور کو فروغ دینا ضروری ہے تاکہ علماء وقت کے ساتھ ساتھ نئے مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں حل کر سکیں اور جامد سوچ سے بچ سکیں۔

5۔ تعلیمی نظام میں اصلاحات:

تعلیمی نظام دونوں مکاتب فکر کے درمیان پل کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ مدارس اور جامعات میں ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو سیاسی اور علمی اسلام دونوں کے نظریات کو متوازن انداز میں پیش کرے۔

-جامع تعلیمی نصاب :اسلامی تعلیمی اداروں میں ایسا نصاب پڑھایا جائے جس میں فقہ، اصولِ فقہ، تصوف، اسلامی تاریخ، اور جدید علوم کا امتزاج ہو۔ اس سے علماء میں تنگ نظری کم ہوگی اور وہ مسائل کو مختلف زاویوں سے دیکھ سکیں گے۔

-علمی اور تحقیقی تربیت :علماء کو علمی تحقیق، تنقیدی سوچ، اور جدید دنیا کے مسائل کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی تربیت دی جائے۔ اس سے فکری وسعت پیدا ہوگی اور وہ ایک دوسرے کے نظریات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

6۔ تعلقات اور تعاون کا فروغ:

علماء کے درمیان ذاتی تعلقات کو فروغ دینا بھی انتہاپسندی کو کم کر سکتا ہے۔ جب مختلف مکاتب فکر کے علماء ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں اور ذاتی طور پر تعلقات استوار کرتے ہیں، تو اس سے ایک دوسرے کے نظریات اور شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

-مشترکہ منصوبے :سیاسی اور علمی اسلام کے علماء کو ایک ساتھ ایسے منصوبوں پر کام کرنے کی ترغیب دی جائے جن کا مقصد اسلامی تعلیمات کو عملی طور پر نافذ کرنا ہو، جیسے غربت کا خاتمہ، تعلیم کا فروغ، یا بین المذاہب ہم آہنگی۔

7۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کے کردار کا مؤثر استعمال:

میڈیا اور سوشل میڈیا علماء کے درمیان نظریاتی مکالمے کو فروغ دینے اور شدت پسندانہ بیانیے کو کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

-مثبت پیغام رسانی :میڈیا کو ایسی مثبت بحثوں اور مکالمات کو فروغ دینا چاہیے جو سیاسی اور علمی اسلام کے پیروکاروں کو ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ علماء کو ذمہ داری سے میڈیا کا استعمال سکھایا جائے تاکہ وہ اختلافی مسائل کو معاشرتی فلاح و بہبود کے تناظر میں پیش کریں۔

سیاسی اور علمی اسلام کے علماء کو قریب لانے اور انتہاپسندی سے دور کرنے کے لیے فکری مکالمے، مشترکہ مقاصد پر زور، نفسیاتی تربیت، تعلیمی اصلاحات، اور مثبت میڈیا کے استعمال جیسی روشیں انتہائی اہم ہیں۔ ان اقدامات سے علماء میں فکری لچک اور رواداری پیدا ہو سکتی ہے، اور وہ مختلف نظریات کو برداشت اور سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں، جس سے امت میں اتحاد و اتفاق کا فروغ ممکن ہو گا۔

علمی اور سیاسی علماء کی شناخت:

سیاسی اسلام اور علمی اسلام کے علماء کے درمیان دلچسپی کے موضوعات اور ان کے نقطۂ نظر سے ان کی شناخت ممکن ہے۔ ہر مکتب فکر مخصوص موضوعات پر زور دیتا ہے، اور ان کے نظریات و دلچسپیاں ان کے علمی یا سیاسی رجحان کو ظاہر

کرتی ہیں۔ ذیل میں مختلف موضوعات کے حوالے سے دونوں مکاتب فکر کے علماء کی دلچسپیاں اور نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے:

1۔ فلسفہ:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے پیروکار فلسفے کو اہمیت دیتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کو عقلی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فلسفے اور اجتہاد کو اسلامی فکر کا حصہ سمجھتے ہیں اور ارسطو، افلاطون، اور جدید فلسفیانہ نظریات پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں۔

- مثالیں :علامہ اقبال، آیت اللہ مطہری، امام محمد غزالی۔

- سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء فلسفے کو بعض اوقات غیر ضروری یا پیچیدہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عملی سیاست اور اسلامی حکومت کے قیام پر زور دینا زیادہ اہم ہے۔ وہ فلسفیانہ مباحث میں بہت زیادہ دخل نہیں دیتے، بلکہ اسلامی تعلیمات کو سادہ اور عملی انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

- مثالیں :سید قطب، مولانا مودودی۔

2۔ عرفان (تصوف):

-علمی اسلام: علمی اسلام کے علماء عرفان اور تصوف کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس پر گہری تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے لیے عرفان اسلامی تعلیمات کا ایک لازمی جزو ہے اور اس کے ذریعے انسان کے دل کی صفائی اور خدا کی قربت حاصل کی جا سکتی ہے۔

- مثالیں: مولانا رومی، ابن عربی، علامہ طبا طبائی۔

-سیاسی اسلام: سیاسی اسلام کے علماء عام طور پر عرفان یا تصوف کو نظرانداز کرتے ہیں یا اسے ثانوی حیثیت دیتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت اور سماجی انصاف کو قائم کرنا زیادہ اہم ہے۔ عرفان کو بعض اوقات عملی سیاست کے میدان سے غیر متعلق سمجھا جاتا ہے۔

- مثالیں: امام خمینی کے ابتدائی خیالات میں عرفان کی بجائے عملی سیاست پر زیادہ زور تھا، حالانکہ بعد میں ان کے نظریات میں عرفان شامل ہو گیا۔

3۔ اصول (اصولِ فقہ):

-علمی اسلام: اصولِ فقہ علمی اسلام کے علماء کا اہم موضوع ہوتا ہے کیونکہ یہ اسلامی قوانین اور اجتہاد کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ وہ اصولِ فقہ کو اسلامی قوانین کی تخلیق اور نفاذ میں ایک لازمی عنصر سمجھتے ہیں اور اس میں گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔

- مثالیں :آیت اللہ باقر الصدر، آیت اللہ خوئی۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء اصولِ فقہ کو عملی طور پر اسلامی حکومت کے قیام کے لیے اہم سمجھتے ہیں، لیکن ان کی توجہ زیادہ تر اسلامی قوانین کے نفاذ پر ہوتی ہے، نہ کہ اصولی مباحث پر۔ ان کے لیے اصولِ فقہ کا مطالعہ زیادہ تر اس وقت ہوتا ہے جب اسے اسلامی نظام حکومت کے عملی پہلو سے جوڑا جائے۔

- مثالیں :مولانا مودودی، سید قطب۔

4۔ کلام (عقائد):

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء کلامی مباحث میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسلامی عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایمان، خدا، نبوت، اور معاد جیسے موضوعات پر غور و فکر کرتے ہیں اور ان پر مباحثے کرتے ہیں۔

- مثالیں :امام محمد غزالی، علامہ طوسی۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء کلامی مسائل کو عوام میں رائج کرنے یا ان پر بحث کرنے کی بجائے اسلامی عقائد کو سادہ اور قابلِ عمل طور پر پیش کرنے

کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا زور زیادہ تر اس بات پر ہوتا ہے کہ ایمان کے عملی پہلوؤں کو سماجی اور سیاسی نظام میں کیسے نافذ کیا جائے۔

- مثالیں :امام خمینی، سید قطب۔

5۔ فقہی مباحث:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء فقہی مسائل پر گہرے علمی مطالعے اور بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ وہ نئے مسائل پر اجتہاد اور تحقیق کو اہمیت دیتے ہیں اور فقہی احکام کی تفصیل میں جاتے ہیں۔

- مثالیں :آیت اللہ سیستانی، آیت اللہ محمد باقر الصدر۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء زیادہ تر فقہ کو عملی سیاست اور اسلامی حکومت کے قوانین کے نفاذ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا زور اسلامی فقہ کو عوامی اور حکومتی سطح پر نافذ کرنے پر ہوتا ہے، نہ کہ پیچیدہ علمی مباحث پر۔

- مثالیں :مولانا مودودی۔

6۔ سماجی مسائل:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء سماجی مسائل کو زیادہ تر اخلاقیات اور دینی تعلیمات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور ان مسائل کا روحانی یا فلسفیانہ حل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

- مثالیں :علامہ طبا طبائی، ڈاکٹر فضل الرحمان۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء سماجی مسائل کو عملی سطح پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے غربت کا خاتمہ، عدل و انصاف کا قیام، اور اسلامی قوانین کا نفاذ۔ ان کا زیادہ تر زور سماجی اصلاحات اور اسلامی حکومت کے قیام پر ہوتا ہے۔

- مثالیں :امام خمینی، سید قطب۔

7۔ کتابیں و کتب خانے:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء کتابوں اور علمی تحقیق میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اسلامی اور غیر اسلامی کتب خانوں کو ایک قیمتی علمی ورثہ سمجھتے ہیں اور اسلامی لائبریریوں کی ترویج پر زور دیتے ہیں۔

- مثالیں :آیت اللہ مطہری، ابن سینا۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء کتابوں اور علمی تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کا زور اسلامی کتابوں کو عوامی اور عملی سطح پر استعمال کرنے پر ہوتا ہے، خاص طور پر ان کتب پر جو سیاسی اور سماجی اصلاحات سے متعلق ہوں۔

- مثالیں :سید قطب۔

8۔ نماز جماعت و فرادیٰ:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء فرد کی روحانی ترقی پر زور دیتے ہیں اور نمازِ فرادیٰ کو ایک گہری ذاتی عبادت کے طور پر اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی انفرادی عبادات اور خدا کے ساتھ تعلق بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

- مثالیں :مولانا رومی، ابن عربی۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء نماز جماعت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ اجتماعیت، اتحاد، اور اسلامی معاشرتی نظم و ضبط کی علامت ہے۔ ان کے لیے نمازِ جماعت سیاسی اور سماجی مقاصد کے فروغ کا ایک ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔

- مثالیں : امام خمینی۔

9۔ رسومات:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء رسومات میں جدت اور عقل کا عنصر شامل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ اسلامی رسومات کی فکری بنیادوں کو جانچتے ہیں اور ان میں ضروری تبدیلیاں کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

- مثالیں :علامہ اقبال۔

-سیاسی اسلام :سیاسی اسلام کے علماء رسومات کو زیادہ تر روایتی انداز میں نافذ کرنے پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ سماجی اتحاد اور اسلامی شناخت کا حصہ ہیں۔

- مثالیں :مولانا مودودی۔

10۔ سائنس اور جدیدیت:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء سائنس اور جدیدیت کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سائنسی ترقیات کو اسلامی نقطہ نظر سے قبول کرنے کے حق میں ہیں۔

- مثالیں :ڈاکٹر فضل الرحمن، علامہ اقبال۔

-سیاسی اسلام:سیاسی اسلام کے علماء سائنس اور جدیدیت کو بعض اوقات اسلامی اقدار کے لیے ایک چیلنج کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جدیدیت کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جائے۔

- مثالیں :سید قطب۔

11۔ قدامت پسندی:

-علمی اسلام :علمی اسلام کے علماء قدامت پسندی کو اکثر چیلنج کرتے ہیں اور نئے اجتہاد اور علمی تحقیق کی حمایت کرتے ہیں۔

- مثالیں :آیت اللہ مطہری، فضل الرحمن۔

-سیاسی اسلام:سیاسی اسلام کے علماء قدامت پسندی کی حمایت کر سکتے ہیں، خاص طور پر جہاں وہ اسلامی روایات اور قوانین کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

- مثالیں :مولانا مودودی۔

ان موضوعات کی روشنی میں علماء کی دلچسپیاں اور نقطہ نظر ان کے علمی یا سیاسی رجحانات کو ظاہر کرتی ہیں۔ علمی اسلام کے علماء عموماً فکری گہرائی، فلسفہ، اور روحانی ترقی پر زور دیتے ہیں، جب کہ سیاسی اسلام کے علماء اسلامی حکومت، سماجی انصاف، اور سیاسی جدوجہد پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

علمی اور سیاسی دلچسپیوں میں زمانے کا فرق:

فطری طور پر سیاسی اور علمی عالم کے درمیان زمانے کا فرق اور مختلف مراحل پر مختلف دلچسپیاں و رویے ہوتے ہیں۔ یہ فینامینا ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں فرد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اثر ہوتا ہے، خاص طور پر تعلیم، تجربات، اور حالات کے تناظر میں۔

1۔ طالب علمی کا مرحلہ:

طالب علمی کے دور میں انسان عموماً نظریاتی علم حاصل کرتا ہے۔ اس مرحلے پر ایک طالب علم مختلف علوم، نظریات، اور خیالات کا مطالعہ کرتا ہے، جس میں فلسفہ، کلام، فقہ، اور دیگر علوم شامل ہوتے ہیں۔

-علمی دلچسپیاں :اس دوران طالب علم کی توجہ زیادہ تر علمی مباحث، فلسفیانہ سوالات، اور نظریاتی تحقیق پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے نظریات کو گہرائی سے سمجھنے اور ان کی بنیاد پر خود کو علمی طور پر مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

-سماجی و سیاسی فہم :تاہم، طالب علمی کے دوران سماجی مسائل، سیاسی حالات، اور معاشرتی تبدیلیوں کی شعوری سمجھ بھی فروغ پاتی ہے۔ یہ دور ایک طالب علم کو سماجی انصاف، انسانی حقوق، اور اسلامی فلسفے کے تحت عالمی مسائل کے بارے میں آگاہی فراہم کرتا ہے۔

2۔ عملی میدان میں قدم رکھنا:

جب فرد عملی میدان میں قدم رکھتا ہے، تو اس کی دلچسپیاں، رویے، اور اہداف تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس کے تجربات، مشاہدات، اور موجودہ حالات کے اثرات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

۔عملی چیلنجز : عملی زندگی میں داخل ہوتے ہی فرد کو مختلف چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ سیاست میں شامل ہونا، سماجی مسائل کے حل کی کوشش کرنا، یا معاشرتی تبدیلیوں میں اپنا کردار ادا کرنا۔ ان چیلنجز کے باعث فرد کی توجہ علمی پہلوؤں سے عملی مسائل کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

-سیاست کی طرف رجحان : عملی میدان میں آنے کے بعد فرد کا رجحان سیاست کی طرف بڑھتا ہے، جہاں وہ اسلامی اصولوں کے تحت عملی طور پر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مرحلہ عام طور پر فکری بحثوں کی بجائے عملی اقدامات، تحریکات، اور سیاسی جدوجہد میں مشغول ہونے کا ہوتا ہے۔

3۔ علمی اور سیاسی عناصر کا امتزاج:

فرد کی زندگی میں یہ دونوں عناصر—علمی اور سیاسی—کبھی بھی مکمل طور پر الگ نہیں ہوتے، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ اس امتزاج کی کئی جہات ہیں:

-علمی بصیرت : عملی میدان میں کامیابی کے لیے علمی بصیرت اور نظریاتی فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم کے بغیر عملی اقدام ناقص ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح، سیاسی تجربات علمی ترقی کا بھی سبب بنتے ہیں۔

-سیاسی علم کا اثر :ایک علمی عالم جب سیاسی میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی علمی بصیرت اس کے سیاسی اقدامات کو متوازن اور سمجھ دار بناتی ہے۔ وہ نظریات اور اصولوں کی بنیاد پر عملی حل تلاش کرتا ہے۔

4۔ مکالمہ اور تعامل:

علمی اور سیاسی علوم کے درمیان ایک صحت مند مکالمہ اور تعامل ضروری ہے:

-علمی مکالمے کی ضرورت :سیاست میں شامل افراد کو علمی مباحث اور تحقیق کو جاری رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے فیصلوں اور اقدامات میں بصیرت حاصل کر سکیں۔

-عملی تجربات کی اہمیت :اسی طرح، علمی شخصیات کو بھی سیاسی میدان میں شامل ہونے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی تحقیق کے نتائج کو عملی طور پر نافذ کر سکیں اور معاشرتی مسائل کے حل کی جانب گامزن ہوں۔

5۔ ہدف اور مقصد:

زندگی کا بنیادی ہدف دونوں عناصر کو متوازن انداز میں استعمال کرنا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ فرد اپنی علمی بصیرت کو عملی زندگی میں نافذ کرے اور ساتھ ہی سیاسی مقاصد کو اسلامی اصولوں کے مطابق آگے بڑھائے۔

-اجتہاد اور فکری ارتقاء:اس عمل میں اجتہاد کا کردار اہم ہے، جہاں فرد کو نئے حالات کے مطابق اپنی سوچ کو اپنانا پڑتا ہے اور اپنے علمی نظریات کی بنیاد پر سیاسی موقف اختیار کرنا پڑتا ہے۔

-معاشرتی تبدیلیوں کا اثر :عالمی اور مقامی تبدیلیوں کے مطابق انسان کی دلچسپیاں اور توجہ تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اس سے ایک فطری توازن پیدا ہوتا ہے جو علمی اور عملی دنیا کے مابین مربوط رابطہ قائم کرتا ہے۔

فرد کی زندگی میں سیاسی اور علمی عناصر کا یہ امتزاج ایک اہم حقیقت ہے۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک مکمل شخصیت کے لیے ضروری ہیں۔ اس فینامینا کا مقصد اسلامی اصولوں کے مطابق ایک متوازن زندگی گزارنا ہے، جہاں علم اور عمل دونوں کا اہم کردار ہو۔ یہ توازن نہ صرف فرد کی ترقی میں مددگار ہوتا ہے بلکہ اسلامی معاشرت کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اہم ہے۔

کیا اسلام میں سیاست اور علم دو الگ روشیں ہیں؟

یہ کہنا کہ جو سیاسی ہوتا ہے وہ علمی نہیں ہوتا یا جو علمی ہوتا ہے اس کی سیاست میں دلچسپی نہیں ہوتی، ایک سادہ اور محدود نقطۂ نظر ہے جو کہ حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا۔ اسلام میں علم اور سیاست دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا ہے، اور دونوں کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلمہ ہے۔

اسلامی تعلیمات میں علم کا حصول ایک بنیادی فریضہ ہے، اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمان کو علم حاصل کرتے رہنا چاہیے، چاہے وہ علم دینی ہو یا دنیاوی۔ علم کی یہ تلاش انسان کو نہ صرف اپنی روحانی ترقی کی راہنمائی کرتی ہے بلکہ اسے اپنے معاشرتی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بھی شعور دیتی ہے۔ اس تناظر میں، ایک عالم جو علمی موضوعات پر توجہ مرکوز کرتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی مسائل کی حقیقت سے بھی واقف ہو۔ یہی علم اس کی علمی حیثیت کو مزید مستحکم کرتا ہے اور اس کے نظریات کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔

دوسری طرف، سیاسی افراد کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ علمی بنیادوں پر اپنی سیاست کو استوار کریں۔ سیاست میں دخل اندازی کرنے والے افراد اگر علمی بصیرت سے عاری ہوں تو وہ صرف سطحی یا عارضی مسائل پر توجہ مرکوز کر

سکتے ہیں، جو کہ ایک مکمل اور مستقل تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے بہت سے سیاسی رہنما موجود ہیں جنہوں نے علمی تربیت حاصل کی اور پھر اپنی علم کی بنیاد پر سیاسی مسائل کے حل کے لیے مؤثر کردار ادا کیا۔

چناں چہ، یہ کہنا درست نہیں کہ ایک سیاسی عالم علمی نہیں ہوتا یا ایک عالم کی سیاست میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور ایک کامیاب اور مؤثر عالم وہ ہے جو علم کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں بھی سیاسی بصیرت رکھتا ہو۔ اس طرح کی شمولیت نہ صرف فرد کی شخصیت کو متوازن کرتی ہے بلکہ اسلامی معاشرت کے استحکام اور فلاح و بہبود کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ علم اور سیاست کا یہ امتزاج ایک جامع اسلامی شخصیت کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے، جو کہ اسلامی معاشرت کے نظریات اور عملی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔

نظام کا ٹھیک ہونا ہی اصل حل ہے

(نظام کے ذریعے پیدا کی ہوئی بھوک کبھی بھی این جی اوز، دسترخوان اور ویلفیئر ٹرسٹ سے ختم نہیں ہو سکتی۔ نظام کا ٹھیک ہونا ہی اصل حل ہے)

اس کہاوت میں ایک گہرے اور جامع سماجی مسئلے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں جو غربت، بھوک اور افلاس ہے، وہ دراصل کسی مخصوص نظام کی ناکامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگرچہ این جی اوز، دسترخوان، اور ویلفیئر ٹرسٹ جیسے فلاحی ادارے ضرورت مندوں کی وقتی مدد کرتے ہیں اور ان کی فوری ضروریات پوری کرتے ہیں، لیکن یہ اقدامات مستقل حل فراہم نہیں کرتے۔ اصل مسئلہ جس نے بھوک اور غربت کو جنم دیا ہے، وہ اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے اور لوگوں کی حالت جوں کی توں رہتی ہے۔

بھوک، غربت، اور سماجی ناانصافی ایک ایسے نظام کی پیداوار ہیں جو وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، بدعنوانی، اور عدم مساوات پر مبنی ہے۔ اس نظام میں چند لوگ وسائل، دولت اور اختیارات پر قابض ہوتے ہیں جبکہ عام لوگ بنیادی ضروریات زندگی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں فلاحی ادارے عارضی

ریلیف فراہم کرتے ہیں، لیکن وہ نظام کو بدلنے یا اس کی بنیادی خرابیوں کو درست کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ نتیجتاً، بھوک، افلاس اور سماجی مسائل کی جڑیں مضبوط رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر، جب کسی معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہو اور دولت کا بڑا حصہ چند ہاتھوں میں مرکوز ہو، تو وہاں وسائل کی کمی نہیں ہوتی بلکہ وسائل کی تقسیم میں بے نظمی ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں این جی اوز اور خیراتی ادارے وقتی طور پر بھوکوں کو کھانا فراہم کر سکتے ہیں، مگر وہ غربت کی بنیادی وجوہات کو ختم نہیں کر سکتے۔ غربت کی جڑیں سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام میں پیوست ہوتی ہیں۔ اگر ان نظامی خرابیوں کو دور نہ کیا جائے، تو فلاحی کاموں کے باوجود غربت اور بھوک اپنی جگہ قائم رہتی ہیں۔

فلاحی ادارے اور خیراتی ادارے لوگوں کو وقتی ریلیف دے کر ان کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کا اثر محدود ہوتا ہے۔ یہ ادارے ایک طرح سے نظام کی ناکامی کو چھپانے کا کام بھی کرتے ہیں، کیونکہ جب لوگوں کو خیرات اور دسترخوان کے ذریعے خوراک مہیا کی جاتی ہے، تو نظام کی خامیاں اور ناانصافیاں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ، فلاحی اداروں کا وجود اکثر حکومتوں کو اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

حکومتیں، جو کہ دراصل نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کی ذمہ دار ہیں، فلاحی اداروں کے ذریعے ہونے والے کاموں کو اپنی ناکامیوں کا جواب سمجھ لیتی ہیں۔

اصل حل یہ ہے کہ نظام کو درست کیا جائے، اس میں موجود عدم مساوات، بدعنوانی، اور ظلم و ناانصافی کو ختم کیا جائے۔ جب تک نظام میں اصلاحات نہیں کی جاتیں اور دولت اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کو یقینی نہیں بنایا جاتا، بھوک اور غربت کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ معاشی اور سماجی نظام کی اصلاحات میں دولت کی منصفانہ تقسیم، روزگار کے مواقع کی فراہمی، تعلیم و صحت کی سہولیات کی رسائی، اور سماجی انصاف کا قیام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ، سیاسی نظام میں بھی ایسی تبدیلیاں لانا ضروری ہیں جن سے عوام کی حقیقی نمائندگی ہو اور ان کی آواز سنی جائے۔

لہٰذا، اس کہاوت کا نچوڑ یہ ہے کہ بھوک اور افلاس کے خاتمے کے لیے بنیادی نظام کو درست کرنا ضروری ہے۔ فلاحی ادارے وقتی ریلیف فراہم کر سکتے ہیں، لیکن نظام کی خرابیوں کو درست کرنے کے بغیر مستقل حل ممکن نہیں۔ جب تک سماج میں انصاف، مساوات، اور انسانی حقوق کا احترام نہیں کیا جاتا، تب تک بھوک اور غربت جیسے مسائل کا مکمل خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم فلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ نظام کی اصلاحات پر بھی توجہ دیں تاکہ ایک

منصفانہ اور متوازن معاشرہ قائم ہو سکے، جہاں ہر شخص کو عزت، وقار، اور وسائل کی منصفانہ رسائی حاصل ہو۔

نظریۂ امامت، جو شیعہ اسلامی عقائد میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، نظام کی تبدیلی میں ایک کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے۔ امامت کا نظریہ قرآن و سنت کی بنیاد پر ایک جامع، عادلانہ، اور الٰہی قیادت کے اصولوں کو پیش کرتا ہے جو کہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس نظریے کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کے بعد بارہ اماموں کی قیادت پر ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا ہے تاکہ وہ امت کی رہنمائی کریں، اس کی حفاظت کریں، اور اسلامی اصولوں کے مطابق معاشرتی نظام کو قائم کریں۔

نظریۂ امامت کا کردار نظام کی تبدیلی میں:

.1 الٰہی قیادت کا نظام : نظریۂ امامت ایک الٰہی قیادت کا تصور پیش کرتا ہے جس میں امام نہ صرف روحانی رہنما ہوتے ہیں بلکہ معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی معاملات میں بھی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ قیادت اللہ کی طرف سے منتخب ہوتی ہے اور معصوم ہوتی ہے، اس لیے وہ ہمیشہ عدل و انصاف پر مبنی فیصلے کرتی ہے۔ یہ تصور ایک ایسے معاشرے کے قیام کی بنیاد فراہم کرتا ہے جہاں حکمرانی کے اصول اللہ کے احکامات اور نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ہوتے ہیں۔

.2عدل و انصاف کا قیام :امامت کا مقصد ایک عادلانہ نظام کا قیام ہے جہاں ہر شخص کو اس کے حقوق ملیں اور ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ امام علی) ع (نے اپنی حکومت کے دوران عدل و انصاف کو فروغ دیا اور ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد کی۔ اسی طرح، امام مہدی)عج (کا قیام بھی عدل و انصاف کے قیام اور ظلم و ستم کے خاتمے کے لیے ہوگا۔ اس نظریے کے تحت، نظام کی تبدیلی کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جہاں کسی بھی قسم کے استحصال یا ظلم کی گنجائش نہ ہو۔

.3اصلاحات اور تربیت : نظریۂ امامت صرف حکمرانی تک محدود نہیں بلکہ اس کا مقصد معاشرتی، اخلاقی، اور روحانی تربیت بھی ہے۔ امام کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کرے اور انہیں اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی ترغیب دے۔ اس نظریے کے تحت، نظام کی تبدیلی کے لیے عوام کی فکری اور روحانی اصلاح ضروری ہے۔

.4اخوت و وحدت : نظریۂ امامت میں امت کی وحدت اور اخوت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ امام کا کردار امت کو متحد رکھنا اور باہمی اختلافات کو ختم کرنا ہے۔ اس تصور کے تحت، نظام کی تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرت میں اتحاد اور اتفاق پیدا کیا جائے اور فرقہ واریت اور تنازعات کو ختم کیا جائے۔

.5ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد : نظریۂ امامت میں ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد کو اہمیت دی گئی ہے۔ امام حسین) ع (کی کربلا میں قربانی اسی اصول کی بہترین مثال ہے۔ اس نظریے کے تحت، جب بھی نظام ظلم و استبداد پر مبنی ہو تو اس کے خلاف کھڑے ہونا اور حق کی آواز بلند کرنا واجب ہے۔ یہ تصور نظام کی تبدیلی کے لیے عوام کو متحرک کرنے اور انہیں ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔

قیام امامت کی شرائط:

نظریۂ امامت کے مطابق، امام کا قیام اور اس کی حکمرانی بعض شرائط کے تحت ممکن ہوتی ہے، جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

1۔ الٰہی انتخاب اور معصومیت :امام کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ اور خطا سے پاک ہوتے ہیں اور اللہ کے احکامات کی پیروی میں کبھی لغزش نہیں کرتے۔

2۔ علم و حکمت :امام کو علم و حکمت کا ایسا درجہ حاصل ہوتا ہے جو عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ شریعت کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی رہنمائی کے بغیر اسلامی نظام کی صحیح تشریح اور تطبیق ممکن نہیں۔

3۔ قیام کے لیے مناسب حالات :امام کا قیام اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب حالات سازگار ہوں اور لوگ ان کی قیادت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ امام مہدی)عج (کے ظہور کی ایک بڑی شرط بھی یہی ہے کہ دنیا ظلم و ستم سے بھر جائے اور لوگ عدل و انصاف کے قیام کے لیے تیار ہوں۔

4۔نصرت و حمایت :امام کے قیام کے لیے عوام کی نصرت و حمایت ضروری ہے۔ امام کا مقصد لوگوں کو عدل و انصاف پر مبنی نظام فراہم کرنا ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگ ان کی قیادت کو قبول کریں اور ان کے ساتھ کھڑے ہوں۔

5۔ اللہ کا اذن :امام کے قیام کے لیے اللہ کا اذن ضروری ہے۔ امام اپنی مرضی سے قیام نہیں کرتے بلکہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام مہدی)عج (کا ظہور بھی اللہ کے اذن کے بعد ہی ہوگا۔

نظریۂ امامت اسلامی معاشرے میں ایک جامع اور عادلانہ نظام کے قیام کا تصور پیش کرتا ہے، جس میں امام کی قیادت میں عدل و انصاف کا قیام، ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد، اور عوام کی فکری و روحانی تربیت شامل ہیں۔ اس نظریے کے تحت، نظام کی تبدیلی کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو اللہ کے احکامات اور نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ہو اور جہاں ہر شخص کو اس کے

حقوق و فرائض کے مطابق انصاف ملے۔ قیام امامت کی شرائط میں الٰہی انتخاب، معصومیت، علم و حکمت، مناسب حالات، عوام کی نصرت، اور اللہ کا اذن شامل ہیں۔ جب یہ شرائط پوری ہوں گی، تو امام کا قیام ممکن ہو گا اور ایک مثالی اسلامی نظام کا قیام عمل میں آئے گا۔

نظریۂ امامت پر مبنی ایک اسلامی انقلاب کی کامیابیت کے لیے چند اہم عناصر اور اقدامات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ ان عناصر میں فکری بیداری، عوامی حمایت، اور ایک مضبوط قیادت کا وجود شامل ہے جو امامت کے اصولوں پر مبنی ہو اور اس کی قیادت میں معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی اصلاحات عمل میں لائی جائیں۔

ایک اسلامی انقلاب کا پہلا اور بنیادی قدم معاشرت میں فکری بیداری پیدا کرنا ہے۔ عوام کو ان کے حقوق، دینی اصولوں، اور امامت کے تصور سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرتی اور تعلیمی نظام کو اس طرح سے تشکیل دیا جائے کہ لوگ امامت کے نظام اور اس کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ یہ فکری بیداری عوام میں ان کے حقیقی اسلامی تشخص کا شعور بیدار کرے گی اور انہیں موجودہ نظام کی خامیوں اور استحصالی رویوں کے خلاف اٹھنے کی ترغیب دے گی۔

امامت پر مبنی انقلاب کا کامیاب ہونا عوام کی وسیع حمایت پر منحصر ہے۔ عوام کی اکثریت کو اس بات پر قائل کیا جائے کہ امامت کے اصولوں پر مبنی نظام ہی ان کے معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا حقیقی حل پیش کرسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو ان کے روزمرہ کے مسائل، جیسے غربت، بے روزگاری، اور عدل و انصاف کی عدم موجودگی، کے حل کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رہنمائی فراہم کی جائے۔ اجتماعی قیام کے لیے عوام میں اتحاد اور یکجہتی کو فروغ دینا ضروری ہے تاکہ وہ ایک مضبوط قیادت کے تحت یکجا ہو کر انقلاب کے لیے تیار ہوں۔

نظریۂ امامت پر مبنی انقلاب کے لیے ایک مضبوط اور مخلص قیادت کا ہونا ناگزیر ہے جو اسلامی اصولوں پر کاربند ہو اور عوام کو متحد کرکے نظام کی تبدیلی کے لیے راہ ہموار کرے۔ یہ قیادت امامت کے اصولوں کی عملی تشریح اور تطبیق میں مہارت رکھتی ہو اور اسے عوام کی مشکلات اور ان کے حل کا واضح ادراک ہو۔ اس قیادت کے تحت ایک مضبوط تنظیم کی تشکیل دی جائے جو انقلاب کے نظریات کو عوام تک پہنچانے، انہیں متحرک کرنے، اور نظام کے خلاف جدوجہد میں ان کی رہنمائی کرے۔

امامت کے اصولوں کے مطابق، انقلاب کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جہاں عدل و انصاف، مساوات، اور حقوق کی پاسداری ہو۔ انقلاب کے بعد قائم

ہونے والے نظام میں عدالتی، معاشی، اور سیاسی شعبوں میں وسیع پیمانے پر اصلاحات لائی جائیں تاکہ عوام کو ان کے حقوق مل سکیں اور ظلم و استبداد کا خاتمہ ہو۔ اس نظام میں امامت کے اصولوں کے تحت قیادت اور حکومت کی تمام سطحوں پر اہل اور دیانتدار افراد کو تعینات کیا جائے تاکہ وہ شریعت کے اصولوں کے مطابق عدل و انصاف کا نفاذ کر سکیں۔

امامت کے اصولوں پر مبنی انقلاب کے تحت ایک اہم قدم معاشی خود کفالت کا حصول ہے۔ اقتصادی میدان میں اصلاحات کے ذریعے ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے عوام کی فلاح و بہبود ممکن ہو سکے۔ مقامی وسائل کا بہترین استعمال، زرعی اور صنعتی ترقی، اور عوامی فلاح کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا معاشی استحکام کے لیے ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، اقتصادی پالیسیوں کو اس طرح سے تشکیل دیا جائے کہ غربت اور بیروزگاری کا خاتمہ ہو اور عوامی خوشحالی کے امکانات بڑھیں۔

انقلاب کے بعد اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو ان قوانین کی روح اور ان کے فائدے سے آگاہ کیا جائے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عوام کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ وہ اسلامی نظام کی قدروں کو سمجھ سکیں اور ان پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس کے لیے تعلیمی

اداروں اور مساجد کے نظام کو منظم کیا جائے اور ایسے نصاب کی تشکیل کی جائے جو نوجوان نسل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں تربیت فراہم کرے۔

امامت کے اصولوں پر مبنی اسلامی انقلاب کے بعد ایک اہم مسئلہ بین الاقوامی تعلقات کا ہوتا ہے۔ ایک اسلامی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی کو حکمت اور بصیرت کے ساتھ ترتیب دے تاکہ عالمی سطح پر اپنے مقاصد کو حاصل کیا جا سکے اور ملک کی خود مختاری کو محفوظ رکھا جا سکے۔ عالمی استعماری طاقتوں کی طرف سے دباؤ اور پابندیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عوامی اتحاد، داخلی مضبوطی، اور خود کفالت کو ترجیح دی جائے۔

نظریۂ امامت پر مبنی انقلاب کے ذریعے نظام کی تبدیلی ایک جامع اور دیرپا عمل ہے جس کے لیے عوامی شعور، مضبوط قیادت، اور اسلامی اصولوں پر مبنی عدل و انصاف کے نظام کا قیام ضروری ہے۔ اس انقلاب کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جہاں ہر فرد کو اس کے حقوق ملیں، ظلم و استبداد کا خاتمہ ہو، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی ترقی کی راہیں ہموار ہوں۔ اس کے لیے عوامی حمایت، اقتصادی خود کفالت، اور اسلامی قوانین کا نفاذ بنیادی شرائط ہیں۔ اس طرح کے نظام کے قیام کے ذریعے ہی ایک حقیقی اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے جو کہ معاشرے کو ظلمت سے نکال کر عدل و انصاف کے نور میں لے آئے۔

اہل بیت علیہم السلام اور اہلسنت

اہل بیت علیہم السلام اھلسنت کے ساتھ رواداری کا حکم دیتے ہیں۔

اہلِ بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور معاشرتی ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ شیعہ اور اہل سنت کے درمیان معاشرت اور باہمی تعلقات کے حوالے سے متعدد احادیث ملتی ہیں جن میں معصومین علیہم السلام نے شیعوں کو اھلسنت کے ساتھ حسن سلوک، اتحاد، اور اخوت پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے۔

.1 امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

" كونوا زينًا ولا تكونوا شينًا، حببونا إلى الناس ولا تبغضونا إليهم ".

وسائل الشیعہ، ج16 ، ص 146

" ہمارے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے لیے زینت بنیں، نہ کہ ان کے لیے رسوائی کا باعث۔ لوگوں میں ہماری محبت پیدا کرو، اور ہمیں ان کی نظروں میں برا نہ بناو۔"

اس حدیث میں امام علیہ السلام شیعوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے رویے سے اہل سنت سمیت دیگر مسلمانوں کے دلوں میں محبت اور احترام پیدا کریں، اور ایسا عمل نہ کریں جو دوسروں کو اہل بیت علیہم السلام سے دور کرے۔

.2 امام علی علیہ السلام کا خط مالک اشتر کو:

امام علی علیہ السلام نے جب مالک اشتر کو مصر کا گورنر مقرر کیا تو انہیں ایک خط میں ہدایت کی:

سُوَرَةٌ أَشْعِرْ قَلْبَكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ، وَالْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَاللُّطْفَ بِهِمْ، وَلاَ تَكُونَنَّ عَلَيْهِمْ سَبُعاً ضَارِياً تَغْتَنِمُ أَكْلَهُمْ، فَإِنَّهُمْ صِنْفَانِ: إِمَّا أَخٌ لَكَ فِي الدِّينِ، وَإِمَّا نَظِيرٌ لَكَ فِي الْخَلْقِ ".

نہج البلاغہ، خط 53

" اپنے دل کو رعایا کے لیے رحمت، محبت، اور شفقت سے بھرو، اور ان پر ایسا نہ بنو جیسے شکاری ان پر حملہ کرتا ہے۔ وہ لوگ یا تو تمہارے دینی بھائی ہیں یا تخلیق میں تمہارے جیسے انسان ہیں۔"

اس خط میں امام علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو نصیحت کی کہ لوگوں کے ساتھ چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، عدل اور محبت کا برتاو کریں، اور انہیں انسانی بھائی چارے کی بنیاد پر دیکھیں۔

.3 امام جعفر صادق علیہ السلام کا اہل سنت کے جنازے میں شرکت کرنا:

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک سنی مسلمان کا جنازہ ہو رہا تھا، تو امام علیہ السلام نے نہ صرف اس جنازے میں شرکت کی، بلکہ خود بھی جنازے کو کندھا دیا اور اہل سنت کے دیگر افراد کے ساتھ مل کر دعا کی۔

" علی بن یقطین کہتے ہیں :میں نے امام صادق علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ اہل سنت کے جنازے میں شریک ہوئے اور فرمایا کہ جنازے میں شرکت کرنا اور دعا کرنا مسلمانوں کے درمیان اخوت اور محبت کا ذریعہ بنتا ہے۔ "(وسائل الشیعہ)

.4 امام علی رضا علیہ السلام کا فرمان:

امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا:

" مَنْ صَلَّى مَعَهُمْ فِي الصَّفِّ الأَوَّلِ، كَانَ كَمَنْ صَلَّى خَلْفَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ و آلہ فی الصفِّ الأَوَّلِ ".

وسائل الشیعہ، ج8 ، ص 301

" جو شخص اہل سنت کے ساتھ صف اول میں نماز پڑھے، تو وہ ایسا ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے صف اول میں نماز ادا کر رہا ہو۔"

یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اخوت کو فروغ دینے کے لیے مشترکہ عبادات جیسے نماز میں شرکت کرنا، اسلامی بھائی چارے کو مضبوط کرتا ہے۔

.5 امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان:

امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو معاشرتی اخوت اور اتحاد پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

" صِلُوا عَشَائِرَكُمْ وَاشْهَدُوا جَنَائِزَهُمْ وَعُودُوا مَرْضَاهُمْ وَأَدُّوا حُقُوقَهُمْ فَإِنَّ الرَّجُلَ مِنْكُمْ إِذَا وَرِعَ فِي دِينِهِ وَصَدَقَ فِي حَدِيثِهِ وَأَدَّى الأَمَانَةَ وَحَسُنَ خُلُقُهُ مَعَ النَّاسِ، قِيلَ هَذَا شِيعِيٌّ، فَيَسُرُّنِي ذَلِكَ ".

الکافی، ج2 ، ص 468

" اپنے قبیلوں سے تعلقات رکھو، ان کے جنازوں میں شرکت کرو، ان کے بیماروں کی عیادت کرو، اور ان کے حقوق ادا کرو۔ کیونکہ جب آپ میں سے کوئی

دینداری اختیار کرے، سچ بولے، امانت داری کرے، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے، تو کہا جاتا ہے کہ یہ شیعہ ہے، اور یہ بات مجھے خوش کرتی ہے۔"

اس حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام نے شیعوں کو ہدایت کی کہ وہ اہل سنت اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہیں، ان کے حقوق کا خیال رکھیں اور ان کے ساتھ نیک سلوک کریں۔

غرض معصومین علیہم السلام کی تعلیمات میں مسلمانوں کے درمیان معاشرتی اخوت، اتحاد، اور حسن سلوک کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیعوں کو اہل سنت اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ محبت، احترام، اور بھائی چارے کے ساتھ رہنا چاہیے۔ معصومین علیہم السلام نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ مسلمان اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں اور باہمی اتحاد کو فروغ دیں۔

انسان کب تک انقلابی رہتا ہے؟!!

کیا یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر ذہین شخص اس وقت تک انقلابی ہے جب تک اس کے پاس اچھی نوکری یا کاروبار نہ آجائے؟؟

یہ بات عمومی طور پر درست ہو سکتی ہے، لیکن اسے ہر ذہین شخص پر لاگو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بعض لوگ واقعی انقلابی خیالات رکھتے ہیں اور جب تک ان کے پاس وسائل یا مواقع نہیں ہوتے، وہ اپنے نظریات پر زور دیتے ہیں۔ تاہم، جب انہیں ایک مستحکم زندگی مل جاتی ہے، تو کچھ لوگ اپنے نظریات کو ترک کر دیتے ہیں یا ان میں نرمی لے آتے ہیں۔

دوسری جانب، کچھ افراد ایسی نوکری یا کاروبار کے باوجود اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہیں اور انقلابی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ فرد کی ذاتی ترجیحات اور اس کی نظریاتی وابستگی اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ وہ اپنے خیالات میں کس حد تک مستقل رہے گا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو انقلابی سوچ کو ہمیشہ دنیاوی فوائد کے مطابق نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اخلاص، ایمان اور اللہ کی رضا کے لیے جدوجہد کو اہمیت دینی چاہیے، چاہے زندگی کے حالات کچھ بھی ہوں۔

اسلامی تاریخ میں ایسے کئی عظیم شخصیات کی مثالیں ملتی ہیں جو بہترین دنیاوی حیثیت اور مقام حاصل کرنے کے باوجود اپنے انقلابی خیالات اور اصولوں پر قائم رہے اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

1۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

حضرت محمد ﷺ کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ آپ ﷺ کو مکہ کے قریش نے بہترین تجارتی پیشکشیں، مال و دولت اور دنیاوی فوائد دیے تاکہ آپ ﷺ اپنی دعوت اور انقلابی پیغام کو ترک کر دیں، لیکن آپ ﷺ نے اپنے اصولوں اور اللہ کے دین کو کسی دنیاوی فائدے پر ترجیح نہیں دی اور آخری دم تک اسلام کا پیغام پھیلانے کی کوشش کرتے رہے۔

2۔ حضرت علی علیہ السلام

حضرت علی(علیہ السلام) کو بھی انقلابی فکر اور اسلامی اصولوں کی پاسداری کی نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی، آپ علیہ السلام نے ہمیشہ عدل و انصاف کو ترجیح دی اور کبھی بھی دنیاوی لالچ یا فائدے کی

خاطر اپنے اصولوں کو ترک نہیں کیا۔ آپ علیہ السلام نے ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیا اور دنیاوی اقتدار کے بجائے اللہ کی رضا کو اہمیت دی۔

3۔ حضرت امام حسین علیہ السلام

حضرت امام حسین علیہ السلام کی قربانی سب سے بڑی مثال ہے۔ آپ کو دنیاوی بادشاہت کی پیشکش کی گئی اور یزید کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا، لیکن آپ نے اسلام کی حفاظت اور ظلم کے خلاف قیام کو ترجیح دی۔ کربلا میں آپ نے اپنی جان قربان کر دی لیکن حق کے راستے سے پیچھے نہیں ہٹے۔

4۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی زندگی بھی ایک انقلابی شخصیت کی بہترین مثال ہے۔ آپ نے مختلف تہذیبوں اور مذاہب کی تلاش کے بعد اسلام قبول کیا اور اسلامی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اپنی پوری زندگی گزار دی۔ دنیاوی طاقت اور عہدوں کے باوجود، آپ نے اسلامی اصولوں اور تعلیمات کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔

5۔ امام زین العابدین علیہ السلام

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے یزید کے ظلم کے بعد انتہائی مشکلات کے باوجود اپنے انقلابی افکار اور اسلامی اصولوں کو زندہ رکھا۔ آپ علیہ السلام نے دعا اور علم کے ذریعے اسلامی تعلیمات کی تجدید کی اور اپنی زندگی کو دینی اور انقلابی مقاصد کے لیے وقف کیا۔

یہ تمام مثالیں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ دنیاوی مقام و دولت حاصل ہونے کے باوجود انقلابی اصولوں پر قائم رہنا ممکن ہے، بشرطیکہ انسان کا مقصد اخلاص، اللہ کی رضا اور دین کی سربلندی ہو۔

عمومی تاریخ میں بھی کئی ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے دنیاوی ترقی یا بلند مقام حاصل کرنے کے باوجود اپنے انقلابی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے معاشرتی، سیاسی، یا فکری تبدیلیوں کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔

1۔ مہاتما گاندھی (Mahatma Gandhi)

گاندھی جی نے برطانوی راج کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لیے تحریک چلائی۔ دنیاوی طور پر ان کا مقام بہت بلند ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی انقلابی فکر یعنی عدم تشدد (Non-violence) اور سادگی پر مبنی زندگی کو کبھی ترک نہیں کیا۔ ان کے پاس اختیار اور طاقت تھی، لیکن وہ ہمیشہ اپنے

اصولوں پر ڈٹے رہے اور آزادی کے بعد بھی اپنی زندگی کو عوام کی خدمت کے لیے وقف رکھا۔

2۔ نیلسن منڈیلا(Nelson Mandela)

جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا نے نسلی امتیاز (Apartheid) کے خلاف اپنی پوری زندگی جدوجہد کی۔ 27 سال تک جیل میں رہنے کے باوجود ان کے انقلابی خیالات کبھی ماند نہ پڑے۔ وہ صدر بنے لیکن اس کے باوجود ہمیشہ نسلی مساوات اور انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرتے رہے، اور اقتدار کو ذاتی فائدے کے بجائے عوام کی بہتری کے لیے استعمال کیا۔

3۔ چی گویرا(Che Guevara)

چی گویرا ایک انقلابی رہنما تھے جنہوں نے کیوبا میں فیدل کاسترو کے ساتھ مل کر انقلاب برپا کیا۔ دنیاوی طور پر کامیاب ہونے کے بعد بھی انہوں نے اپنی انقلابی سوچ کو ترک نہیں کیا اور ہمیشہ غریبوں اور مظلوموں کے حق کے لیے لڑتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو دنیاوی فائدوں کے بجائے انقلابی مقاصد کے لیے وقف کیا۔

4۔ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر(Martin Luther King Jr.)

مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے امریکہ میں شہری حقوق کی تحریک کی قیادت کی اور نسلی مساوات کے لیے جدوجہد کی۔ دنیاوی طور پر ان کا مقام بڑھ گیا تھا، لیکن وہ ہمیشہ عدم تشدد کے ذریعے انصاف اور برابری کے اصولوں پر قائم رہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ راستہ مشکل ہے، لیکن ان کے اصولوں نے انہیں کسی دنیاوی لالچ یا خوف کے بغیر کام کرنے کی ترغیب دی۔

5۔ توماس جفرسن(Thomas Jefferson)

امریکی انقلاب کے قائدین میں سے ایک، توماس جفرسن نے امریکہ کی آزادی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ وہ امریکی آئین کی تشکیل میں پیش پیش تھے اور صدر بننے کے بعد بھی اپنے جمہوری اور انقلابی اصولوں پر قائم رہے۔ ان کے لیے آزادی، برابری، اور جمہوریت کے اصول ہمیشہ دنیاوی فائدے اور اقتدار سے زیادہ اہم رہے۔

6۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ

سکھ سلطنت کے بانی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی سلطنت قائم کرنے کے بعد بھی انصاف، مساوات، اور رواداری کے اصولوں پر عمل کیا۔ ان کے پاس دنیاوی طاقت اور دولت تھی، لیکن انہوں نے اپنی حکومت میں تمام مذاہب کے لوگوں

کے ساتھ انصاف اور برابری کا رویہ اختیار کیا اور ہمیشہ عوامی خدمت کو ترجیح دی۔

یہ مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ دنیاوی کامیابی کے باوجود، ایسے افراد اپنے انقلابی اصولوں پر قائم رہے اور ان کے لیے ذاتی فائدے یا آرام سے زیادہ اہمیت ان کے نظریات اور عوام کی فلاح و بہبود کی تھی۔

ایرانی انقلاب (1979) سے متعلق کئی اہم شخصیات کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جنہوں نے دنیاوی ترقی یا بلند مقام حاصل کرنے کے باوجود اپنے انقلابی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ایرانی معاشرے اور حکومت میں تبدیلیاں لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

1۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی

آیت اللہ خمینی ایرانی انقلاب کے روح رواں تھے اور انہوں نے پہلوی حکومت کے خلاف قیادت کی۔ دنیاوی طاقت حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی انقلابی فکر یعنی اسلامی حکومت کا قیام اور عوامی حقوق کی حفاظت ان کی اولین ترجیح رہی۔ انہوں نے دنیاوی اقتدار کو ذاتی فائدے کے لیے استعمال نہیں کیا، بلکہ اسلامی نظام کو نافذ کرنے اور ایران کو استعماری طاقتوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

ان کی قیادت میں ایک اسلامی جمہوریہ قائم ہوئی، جس نے اسلامی قوانین اور اصولوں کی بنیاد پر حکومت کی۔

2۔ شہید ڈاکٹر علی شریعتی

ڈاکٹر علی شریعتی ایک معروف انقلابی دانشور اور مفکر تھے جنہوں نے ایرانی عوام کو استبدادی نظام کے خلاف ابھارا۔ ان کی تحریریں اور تقریریں نوجوانوں میں انقلاب کی روح کو بیدار کرنے کا سبب بنیں۔ شریعتی نے اسلامی فکر کو جدید سوشیالوجی اور سیاسی نظریات کے ساتھ ملا کر ایک نئی انقلابی فکر دی۔ ان کی مقبولیت کے باوجود، انہوں نے کبھی ذاتی فائدے یا دنیاوی مفاد کی طرف مائل نہیں ہوئے اور ہمیشہ اپنے انقلابی نظریات کے ساتھ کھڑے رہے۔

3۔ آیت اللہ مرتضی مطہری

آیت اللہ مطہری اسلامی فلسفے اور انقلاب کے اصولوں کے ایک بڑے مفکر اور عالم تھے۔ انہوں نے ایرانی انقلاب کے فکری اور نظریاتی پہلو کو مضبوط کیا اور اسلامی نظریات کو جدید دور کے مسائل کے مطابق پیش کیا۔ انقلاب کے بعد بھی ان کا کردار ایک انقلابی مفکر کے طور پر رہا اور انہوں نے دنیاوی مناصب کو اپنے اصولوں پر قربان نہیں کیا۔

4۔شہید مصطفیٰ چمران

مصطفیٰ چمران ایک معروف انقلابی رہنما اور جنگجو تھے جنہوں نے انقلاب کے دوران اور بعد میں فوجی قیادت میں اہم کردار ادا کیا۔ انقلاب کے بعد انہیں وزیرِ دفاع بنایا گیا، لیکن انہوں نے ہمیشہ سادگی اور عوامی خدمت کو ترجیح دی۔ دنیاوی طاقت اور مقام حاصل کرنے کے باوجود، انہوں نے اپنی زندگی کو اسلامی انقلاب کی خدمت اور مظلومین کی حمایت کے لیے وقف کیا اور کبھی بھی ذاتی فائدے کو ترجیح نہیں دی۔

5۔شہید عباس بابائی

عباس بابائی ایک اعلیٰ فوجی افسر تھے جو ایرانی انقلاب اور اس کے بعد ایران عراق جنگ میں ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ وہ دنیاوی ترقی اور فوجی عہدوں پر ترقی کے باوجود انتہائی سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور ہمیشہ اسلامی اصولوں پر قائم رہتے تھے۔ ان کے اندر اسلامی انقلاب کی خدمت کا جذبہ ہمیشہ غالب رہا اور انہوں نے اپنی زندگی کو اسی مقصد کے لیے وقف کیا۔

6۔ شہید محمد حسین بہشتی

محمد حسین بہشتی ایک اہم انقلابی رہنما اور اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین سازوں میں سے ایک تھے۔ وہ انقلاب کے بعد عدلیہ کے سربراہ بنے اور اسلامی قوانین

کو نافذ کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے دنیاوی عہدے اور طاقت حاصل کرنے کے باوجود ہمیشہ اپنے انقلابی اور اسلامی اصولوں پر عمل کیا اور اسلامی نظام کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

7۔یت اللہ سید علی خامنہ ای

آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے انقلاب کے بعد ایران میں مختلف اہم مناصب سنبھالے، جیسے صدرِ ایران اور پھر رہبر معظم انقلاب اسلامی بنے۔ انہوں نے انقلاب کے دوران بھی اور اس کے بعد بھی اسلامی اصولوں اور انقلابی نظریات کی پیروی کی۔ حتیٰ کہ دنیاوی اقتدار کے حصول کے باوجود، انہوں نے کبھی بھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ اسلامی قوانین اور عوامی فلاح و بہبود کو فوقیت دی۔ ان کی قیادت میں ایران نے استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمت کی اور اسلامی خودمختاری کو برقرار رکھا۔

ایرانی انقلاب کی یہ شخصیات نہ صرف انقلاب کے دوران بلکہ انقلاب کے بعد بھی اپنے انقلابی اصولوں پر قائم رہیں اور دنیاوی مفاد یا اقتدار کی طلب کے بغیر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کیا۔

علم فلسفہ، سائنس و ٹیکنالوجی اور صیہونی طاقتیں

علم فلسفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں صیہونی سامراجی طاقتوں کا اثر نہایت گہرا اور جامع ہے۔ ان طاقتوں نے فلسفیانہ خیالات، سائنسی تحقیق، اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ذریعے مختلف معاشروں پر اپنا تسلط قائم کیا ہے۔ یہ تسلط براہِ راست حکمرانی کے بجائے علمی، نظریاتی اور ٹیکنالوجی کے ذریعے قائم ہوتا ہے، جس کے باعث دنیا کے دیگر ممالک کی خود مختاری اور ثقافتی شناخت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

فلسفے کے میدان میں صیہونی سامراجی طاقتوں نے مغربی فکر کو غالب کیا ہے۔ مغربی فلسفہ، خاص طور پر لبرل ازم، سیکولرازم، اور مابعد جدیدیت کے نظریات کو دنیا بھر میں تعلیمی اداروں اور علمی تحقیق کے ذریعے فروغ دیا گیا ہے۔ یہ نظریات اکثر غیر مغربی ثقافتوں اور ان کی فکری روایات کو یا تو نظرانداز کرتے ہیں یا ان کو کم تر سمجھا جاتا ہے۔ مغربی فلسفہ کو تعلیم اور تحقیق میں نمایاں حیثیت دی گئی ہے جس کی وجہ سے غیر مغربی فکری روایات، مثلاً اسلامی، چینی اور افریقی فلسفے کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی دور میں فلسفے کو نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنے زیرتسلط علاقوں میں اپنے مفادات کے مطابق ڈھالا اور یہ اثرات آج

بھی برقرار ہیں۔ اس نظام کے تحت مغربی فکری تصورات کو اعلیٰ اور درست سمجھا جاتا ہے جبکہ مقامی فلسفیانہ روایات کو قدیم یا غیر معقول قرار دیا جاتا ہے۔

سائنس اور تحقیق کے میدان میں بھی صیہونی سامراجی طاقتوں کا غلبہ ہے۔ سائنسی تحقیق کی مالی معاونت زیادہ تر مغربی ممالک کے ادارے فراہم کرتے ہیں، جس کے باعث تحقیق کے موضوعات اور ایجنڈے ان کے مفادات کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان اکثر اپنی تحقیق کے لیے مغربی اداروں پر انحصار کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کی تحقیق کی سمت بھی مغربی مفادات کے مطابق ہوجاتی ہے۔ جدید سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی پر پیٹنٹس اور انٹلیکچوئل پراپرٹی کے حقوق کا کنٹرول مغربی ممالک کے پاس ہے۔ یہ حقوق ترقی پذیر ممالک کو جدید ٹیکنالوجی اور ایجادات تک رسائی سے محروم رکھتے ہیں، جس کے باعث سائنسی ترقی میں بھی عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ سائنسی تعلیم اور تحقیق کا عالمی معیار بھی مغربی اداروں نے طے کیا ہے، جس کے نتیجے میں ترقی پذیر ممالک کی جامعات اور تحقیقی ادارے مغربی معیار اور ماڈلز کو اپنانے پر مجبور ہیں، جس سے ان کے اپنے سائنسی نظام کی ترقی متاثر ہوتی ہے۔

ٹیکنالوجی کے میدان میں صیہونی سامراجی طاقتوں کا تسلط سب سے نمایاں ہے۔ جدید ٹیکنالوجی، خاص طور پر ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ پر مغربی ممالک کا کنٹرول ہے، جس کے ذریعے وہ دنیا کے دیگر ممالک کی معیشت، سیاست، اور

معاشرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی پر کنٹرول رکھنے والی بڑی ٹیکنالوجی کمپنیز، جیسے گوگل، فیس بک، ایپل، اور مائیکروسافٹ مغربی ممالک میں قائم ہیں۔ یہ کمپنیاں ڈیٹا، پرائیویسی، اور معلومات کے بہاؤ پر کنٹرول رکھتی ہیں، جس سے ترقی پذیر ممالک کی خود مختاری متاثر ہوتی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی تک رسائی اور استعمال میں بھی عدم مساوات پائی جاتی ہے، جس کے باعث ترقی پذیر ممالک عالمی معیشت میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مغربی ممالک اپنی ٹیکنالوجی کو محفوظ رکھنے کے لیے انٹلیکچوئل پراپرٹی کے حقوق کو سختی سے نافذ کرتے ہیں، جس سے دیگر ممالک کو جدید ٹیکنالوجی کے استعمال اور ترقی میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر ٹیکنالوجی کی بڑی صنعتوں پر مغربی ممالک کا تسلط ہے، جو کہ ترقی پذیر ممالک کی صنعتی ترقی اور معیشت کو بھی متاثر کرتا ہے۔

علمی تحقیق، سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کے ذریعے صیہونی سامراجی طاقتیں علمی تسلط قائم کرتی ہیں، جس سے دیگر ممالک کی خود مختاری کمزور ہوتی ہے۔ علمی تحقیق اور سائنسی علم کے میدان میں مغربی معیار اور اصول عالمی سطح پر غالب ہیں، جس سے ترقی پذیر ممالک کو اپنی علمی روایات اور نظریات کے فروغ میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔

اس سارے غلبے کے نتیجے میں ترقی پذیر ممالک کو مغربی نظریات، معیار، اور ٹیکنالوجی کو اپنانا پڑتا ہے، جس سے ان کی مقامی ثقافت، فکری روایات، اور خود مختاری متاثر ہوتی ہے۔ صیہونی سامراجیت کے اس علمی اور سائنسی غلبے سے بچنے کے لیے ترقی پذیر ممالک کو اپنے تعلیمی، سائنسی، اور تکنیکی نظام کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ عالمی سطح پر خود مختاری حاصل کر سکیں۔

سامراجی سازشوں کے نجی زندگی میں اثرات

صیہونی سامراجی طاقتوں کا فساد نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ طاقتیں براہ راست حکومتی یا ادارہ جاتی سطح پر اثر انداز ہونے کے بجائے انفرادی اور نجی زندگی کی سطح پر اپنا تسلط قائم کرتی ہیں۔ اس اثرات کی مختلف جہتیں ہیں، جن میں سے چند نمایاں پہلو ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔

صیہونی سامراجی طاقتیں اپنی ثقافت، طرز زندگی، اور اقدار کو فروغ دینے کے ذریعے مقامی ثقافتوں اور روایات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مغربی ثقافتی مصنوعات، جیسے کہ فلمیں، ٹی وی شوز، اور فیشن، مقامی معاشرت میں اپنا اثر ڈالتی ہیں، جس کے نتیجے میں مقامی لوگ اپنی ثقافت اور روایات کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ثقافتی نقلی سے مقامی شناخت کمزور ہوتی ہے، اور لوگوں کو مغربی طرز زندگی کے مطابق ڈھالنے کا دباؤ ہوتا ہے۔ مغربی معیار کو اعلیٰ سمجھا جانے کی وجہ سے لوگ اپنی مقامی شناخت اور روایات کو کمتر تصور کرنے لگتے ہیں۔

صیہونی سامراجی طاقتوں کے زیر اثر ثقافتی تبدیلیاں اور معاشرتی دباؤ لوگوں کی ذہنی اور جذباتی حالت پر منفی اثر ڈالتے ہیں۔ مغربی ثقافت کی پیروی کرنے والے افراد اکثر شناخت کے بحران کا شکار ہو جاتے ہیں، کیونکہ انہیں اپنی ثقافت اور

مغربی نظریات میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ اس فرق کی وجہ سے وہ اپنی پہچان اور شناخت میں عدم توازن محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ان میں ذہنی صحت کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، جیسے کہ دباؤ، اضطراب، اور افسردگی، جو ثقافتی دباؤ اور سماجی تضادات کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔

صیہونی سامراجی طاقتیں عالمی معیشت پر بھی غلبہ رکھتی ہیں، جس کے نتیجے میں مقامی لوگوں کی معاشی حالت متاثر ہوتی ہے۔ عالمی اقتصادی نظام میں شراکت داری کی کمی اور عدم مساوات کی وجہ سے مقامی افراد غربت اور بے روزگاری کا سامنا کرتے ہیں۔ عالمی سطح پر مغربی معیشت کی بالا دستی کی وجہ سے مقامی کاروبار اور چھوٹے صنعت کار عالمی کارپوریشنز کے ساتھ مقابلہ نہیں کر پاتے، اور معاشی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔

صیہونی سامراجی طاقتیں تعلیمی اور پیشہ ورانہ مواقع کے نظام کو بھی کنٹرول کرتی ہیں۔ ان طاقتوں نے اپنے تعلیمی معیار اور نصاب کو دنیا بھر میں رائج کیا ہے، جس کے نتیجے میں مقامی تعلیمی ادارے اور نصاب نظر انداز ہوتے ہیں۔ تعلیمی میدان میں مغربی معیار کو اپنانے کا دباؤ مقامی تعلیمی نظام کی ترقی کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی، بین الاقوامی معیار کے مطابق تربیت اور مواقع کی کمی کی وجہ سے مقامی افراد کو اپنی پیشہ ورانہ ترقی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

صیہونی سامراجی طاقتیں خاندانی اور ذاتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ مغربی طرز زندگی اور اقدار کی پیروی کے نتیجے میں مقامی خاندانی روایات اور اقدار میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ خواتین کے حقوق کے نام پر مغربی ممالک نے مقامی معاشرتی اصولوں میں تبدیلی کی کوششیں کی ہیں، جو کبھی کبھار مقامی ثقافت اور روایات کے خلاف ہوتی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے خاندانی نظام اور روایتی اقدار متاثر ہوتی ہیں۔

صیہونی سامراجی طاقتیں صحت اور فلاح و بہبود کے نظام کو بھی کنٹرول کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں مقامی لوگوں کی صحت اور فلاح و بہبود پر اثر پڑتا ہے۔ عالمی صحت کی پالیسیوں اور معیار کو مغربی ممالک کے ادارے طے کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں مقامی صحت کے نظام کو نظرانداز کیا جاتا ہے اور لوگوں کو مناسب صحت کی سہولتیں نہیں ملتیں۔ مغربی ممالک کی طرف سے فراہم کردہ فلاحی امداد اور پروگرامز اکثر مقامی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق نہیں ہوتے، جس سے مقامی فلاح و بہبود کی کوششیں محدود ہوتی ہیں۔

صیہونی سامراجی طاقتیں میڈیا اور معلومات پر بھی قابض ہیں، اور ان کے ذریعے نجی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ عالمی میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات کا بہاؤ مغربی نظریات اور خیالات کے مطابق ہوتا ہے، جو مقامی لوگوں کی سوچ اور نظریات کو متاثر کرتا ہے۔ مغربی میڈیا کے غلبے کے باعث مقامی میڈیا اور

معلوماتی مواد کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، جس سے مقامی لوگوں کو اپنے مسائل اور کہانیاں دنیا تک پہنچانے میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں کے نتیجے میں صیہونی سامراجی طاقتوں کا فساد نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان طاقتوں کے زیر اثر مقامی لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آتی ہے، اور وہ اپنی ثقافت، شناخت، اور معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے میں مشکلات محسوس کرتے ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے مقامی ثقافتوں کی حفاظت، خود مختاری کے فروغ، اور مقامی مسائل کے حل کے لیے جامع پالیسیوں کی ضرورت ہے، تاکہ لوگ اپنی ثقافتی، معاشرتی، اور انفرادی شناخت کو محفوظ بنا سکیں۔

غیبت امام مہدی عج اور صیہونی سامراجی طاقتیں

غیبت امام مہدی علیہ السلام اور صیہونی سامراجی طاقتوں کا موضوع تاریخی، سیاسی، اور مذہبی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ان دونوں موضوعات کا تعلق ایک دوسرے سے ممکنہ طور پر کیسے ہو سکتا ہے، اس کا تجزیہ عالمی سیاست، مذہبی عقائد، اور معاشرتی تبدیلیوں کی بہتر سمجھ فراہم کرتا ہے۔

غیبت امام مہدی علیہ السلام کے تصور کو شیعہ اسلام میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ عقیدہ ہے کہ امام مہدی علیہ السلام وہ امام ہیں جو آخر الزمان میں قیام کریں گے اور دنیا میں عدل و انصاف قائم کریں گے۔ امام مہدی علیہ السلام کی غیبت دو ادوار میں تقسیم کی گئی ہے :غیبت صغریٰ اور غیبت کبریٰ۔ غیبت صغریٰ کا دور 869عیسوی میں شروع ہوا اور 941 عیسوی تک جاری رہا۔ اس دوران امام مہدی علیہ السلام نے اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنے پیروکاروں سے رابطہ برقرار رکھا اور ان کے مسائل کا حل فراہم کیا۔ یہ دور امام کی حفاظت اور ان کے پیغام کو محفوظ رکھنے کے لیے تھا۔ اس کے بعد غیبت کبریٰ کا دور شروع ہوا، جس میں امام نے براہ راست رابطہ ختم کر دیا اور مکمل غیبت میں چلے گئے۔ اس دور میں مسلمانوں کو امام کے ظہور کے انتظار میں خودی اور اخلاقی و روحانی ترقی کی تعلیم دی گئی۔

دوسری طرف، صیہونی سامراجی طاقتیں ایک نوآبادیاتی طرز کی نئی شکل کو فروغ دیتی ہیں، جسے نیو کالونیلزم کہا جاتا ہے۔ نیو کالونیلزم میں ترقی پذیر ممالک کے قدرتی، انسانی، اور مالیاتی وسائل کا استحصال کیا جاتا ہے، جس سے یہ ممالک اپنی معیشت اور خودمختاری سے محروم ہوتے ہیں۔ صیہونی سامراجی طاقتیں ان ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے اپنے مفادات کے مطابق ان کی سیاست کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں ان ممالک میں سیاسی عدم استحکام، بدعنوانی، اور ناانصافی کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ طاقتیں مغربی ثقافت اور اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہیں، جس سے مقامی ثقافتوں اور روایات کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ مغربی ثقافتی اثرات مقامی معاشرتی ڈھانچوں کو تبدیل کر دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ثقافتی تنوع کمزور ہوتا ہے۔

غیبت امام مہدی علیہ السلام اور صیہونی سامراجی طاقتوں کے درمیان تعلق کوئی پہلوؤں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ امام مہدی علیہ السلام کی غیبت اور ان کے ظہور کی توقع اسلامی معاشرت میں ایک روحانی مزاحمت کا باعث بنتی ہے، جو سامراجی طاقتوں کے استعماری مظالم کے خلاف ایک حوصلہ افزا اخلاقی و روحانی طاقت فراہم کرتی ہے۔ امام مہدی علیہ السلام کا تصور ظلم و استحصال کے خلاف جدوجہد کی امید کو برقرار رکھتا ہے اور لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ایک دن عدل و انصاف قائم ہو گا۔

غیبت امام مہدی علیہ السلام کا دور مسلمانوں کو اپنی اخلاقی اور روحانی ذمہ داریوں پر توجہ دینے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ بیداری نیو کالونیل طاقتوں کے ظلم و استحصال کے خلاف ایک اخلاقی و اجتماعی مزاحمت کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اس دوران، مسلمانوں کو اپنے حقوق اور انصاف کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی امید لوگوں کے اندر عالمی سطح پر عدل و انصاف کی تلاش کے ایک اہم مظہر کے طور پر موجود رہتی ہے۔ نیو کالونیل طاقتوں کے ذریعہ کیے جانے والے ظلم و استحصال کے باوجود، امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی امید، دنیا میں عدل و انصاف کے قیام کے ایک وعدے کو قائم رکھتی ہے، جو ان طاقتوں کے مظالم کا مقابلہ کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔

امام مہدی علیہ السلام کی غیبت کے دوران مسلمان اپنی روحانی اور اجتماعی اخلاقی بیداری کو مزید مستحکم کرتے ہیں، جو کہ معاشرتی تبدیلی اور شعور میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس بیداری کی بدولت لوگ ان سامراجی طاقتوں کے خلاف ایک منظم اور اصولی ردعمل فراہم کرتے ہیں، اور مقامی ثقافتوں اور روایات کی حفاظت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ غیبت امام مہدی علیہ السلام کا تصور، مقامی ثقافتوں اور روایات کی حفاظت کے ایک روحانی و اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے، جس سے لوگوں کو اپنے تشخص اور ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے کی تحریک ملتی ہے۔

غیبت امام مہدی علیہ السلام کی حالت میں اسلامی معاشرت میں امید اور پائیداری کا ایک احساس برقرار رہتا ہے، جو سامراجی طاقتوں کے ظلم و استحصال کے باوجود ایک مضبوط روحانی و اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی امید، عالمی سطح پر عدل و انصاف کی تلاش اور معاشرتی تبدیلی کا ایک مظہر ہے، جو سامراجی طاقتوں کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس طرح مذہبی عقائد اور عالمی سیاست کے یہ مختلف پہلو باہم جڑے ہوتے ہیں، اور ایک ایسا راستہ فراہم کرتے ہیں جس سے عالمی سطح پر انصاف اور اخلاقی ترقی کو فروغ دیا جا سکے۔ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی توقع صیہونی سامراجی طاقتوں کے خلاف ایک روحانی و اخلاقی مزاحمت کا ذریعہ بنتی ہے، جو کہ ایک منظم اور پرعزم شعور کی بنیاد پر مبنی ہوتا ہے۔

جدید سامراجی طاقتیں اسلام دشمنی سے کیا چاہتی ہیں؟

سامراجی اور نیو کالونیل طاقتیں اسلام کو ایک ایسا نظام سمجھتی ہیں جو ان کے استعماری عزائم کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک مضبوط عقیدہ اور جامع معاشرتی نظام پیش کرتا ہے جو عدل، اخوت، اور خود مختاری کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ تعلیمات سامراجی طاقتوں کے مفادات کے برعکس ہیں۔ نیو کالونیل طاقتیں چاہتی ہیں کہ دنیا کے انسان ایک ایسی زندگی گزاریں جس میں مغربی اور سامراجی اقدار کو اختیار کیا جائے۔ ان میں مادیت، انفرادیت اور مغربی اقتصادی و سیاسی نظام کی بالا دستی شامل ہے۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ لوگ اپنی ثقافت، مذہب اور خود مختاری کو ترک کر کے ان کے تابع ہو جائیں تاکہ وہ اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کو آگے بڑھا سکیں اور عالمی سطح پر طاقت کا توازن اپنے حق میں برقرار رکھ سکیں۔

سامراجی اور نیو کالونیل طاقتیں اسلام کو اس لیے بھی خطرہ سمجھتی ہیں کہ اسلام نہ صرف مذہبی تعلیمات دیتا ہے بلکہ ایک جامع ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ یہ نظام سیاسی، اقتصادی اور سماجی رہنمائی فراہم کرتا ہے جو کہ ان طاقتوں کے استحصالی اور غیر منصفانہ نظام کو چیلنج کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں عدل و

انصاف، انسانی حقوق، مساوات اور حلال و حرام کی واضح ہدایات موجود ہیں جو سامراجی طاقتوں کے مفادات کے لیے ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

نیو کالونیل طاقتیں چاہتی ہیں کہ دنیا ایک صارفیت پسندانہ طرز زندگی اختیار کرے جہاں ہر چیز کی قیمت ہو اور اخلاقی اصولوں کی جگہ صرف مالیاتی مفادات کو ترجیح دی جائے۔ اس مقصد کے تحت وہ لوگوں کی ذہنی نشو و نما کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ وہ مغربی ثقافت، میڈیا اور سرمایہ دارانہ نظام کے تابع ہو جائیں۔ یہ طاقتیں اسلامی ممالک میں اختلاف اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ مسلمانوں کو تقسیم کر کے ان کی قوت کو کمزور کیا جا سکے اور ان کے وسائل اور زمین پر اپنا کنٹرول برقرار رکھا جا سکے۔

اسلامی وحدت، جس کا مرکز قرآن و سنت ہیں، نیو کالونیل طاقتوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر مسلمان اپنے عقیدے کے مطابق متحد ہو جائیں تو وہ اپنی خود مختاری واپس حاصل کر سکتے ہیں اور سامراجی طاقتوں کی اجارہ داری کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طاقتیں اسلامی نظام کو حوصلہ شکنی کا نشانہ بناتی ہیں اور مسلمانوں کو سیکولرزم، لبرل ازم اور مادیت کی طرف مائل کرتی ہیں تاکہ ان کی اصل شناخت اور طاقت کو کمزور کیا جا سکے۔

سامراجی اور نیو کالونیل طاقتیں اسلام کے دونوں بڑے فرقوں، یعنی اہل تشیع اور اہل سنت، کے نظریات اور مزاحمتی کلچر سے خوفزدہ ہیں، لیکن دونوں کو مختلف وجوہات کی بنا پر چیلنج سمجھتی ہیں۔ اہل تشیع کے اندر موجود مزاحمتی روح اور امام حسین) علیہ السلام (کی قربانی سے منسوب کربلا کا پیغام ان طاقتوں کے لیے خاص طور پر خطرناک ہے۔ تشیع میں ظلم کے خلاف جدوجہد اور عدل و انصاف کے قیام پر زور دیا جاتا ہے، اور یہ تعلیمات اہل بیت) علیہم السلام (کی روایات اور انقلابی تحریکوں پر مبنی ہیں۔ شیعہ دنیا بھر میں ظلم اور استحصال کے خلاف مزاحمت کی ایک تاریخ رکھتے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے اس مزاحمتی کلچر کو اجاگر کیا اور سامراجی طاقتوں کے مفادات کو چیلنج کیا، اسی بنا پر اہل تشیع کو سامراجی طاقتوں کے لیے خاص خطرہ سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل سنت کے اندر بھی ایسے گروہ اور تحریکیں موجود ہیں جو سامراجی طاقتوں کے لیے چیلنج ہیں، جیسے اخوان المسلمون اور صوفیانہ تحریکیں جو سماجی اور روحانی بیداری کا پیغام دیتی ہیں۔ اہل سنت کے مزاحمتی کلچر میں بھی سامراج مخالف جدوجہد کی روایات ہیں، جیسا کہ فلسطین کی آزادی کی تحریک، جس کی قیادت زیادہ تر سنی مزاحمت کار کر رہے ہیں۔

مجموعی طور پر، سامراجی طاقتیں شیعہ مزاحمتی کلچر کو زیادہ خطرناک سمجھتی ہیں، خاص طور پر اس کی سیاسی اور انقلابی تحریکوں کی وجہ سے۔ تاہم، وہ سنی مزاحمتی تحریکوں سے بھی خطرہ محسوس کرتی ہیں، خاص طور پر جب وہ مسلم وحدت کے نظریے کو اپنا کر سامراجی طاقتوں کے خلاف تحریکوں میں شامل ہو جائیں۔

نیو کالونیل طاقتیں اسلام کے کسی بھی ایسے ماڈل سے خوفزدہ ہیں جو ان کے استحصالی نظام کو چیلنج کرے، چاہے وہ شیعہ ہو یا سنی۔ اسلام کا مزاحمتی پہلو، جو ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور انصاف کے قیام کی کوشش کرتا ہے، نیو کالونیل طاقتوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس وجہ سے یہ طاقتیں مسلمانوں کی وحدت اور اسلامی بیداری کو روکنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں تاکہ ان کی اجارہ داری برقرار رکھی جا سکے۔

تعلیم و تربیت اور جدید تعلیمی رجحانات

اسلام میں تعلیم و تربیت کا فلسفہ قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں نہایت جامع، ہمہ جہت اور روحانی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ فلسفہ انسان کی مجموعی نشوونما، اخلاقی ترقی اور علم کے حصول کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس، جدید تعلیمی رجحانات اکثر مخصوص مقاصد، مارکیٹ کی ضروریات اور معیشتی عوامل کے تحت تشکیل پاتے ہیں، جو کہ عمومی طور پر روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے ہم اسلامی تعلیمات اور جدید رجحانات کو الگ الگ زیرِ بحث لاتے ہیں۔

قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں علم کی اہمیت کو بہت زیادہ فوقیت دی گئی ہے۔ قرآن میں علم کی طلب کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ العلق میں ارشاد ہوتا ہے" :پڑھ !اپنے رب کے نام سے جو تخلیق کرتا ہے"۔ یہ آیت اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ علم کا حصول ہر مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اہل بیت علیہم السلام نے بھی علم کو ایک قیمتی دولت قرار دیا ہے جو انسان کو صحیح راستے پر گامزن کرتی ہے اور اسے زندگی کے مسائل کا حل

فراہم کرتی ہے۔ علم کو صرف معلوماتی یا دنیاوی فائدہ کے لیے نہیں بلکہ ہدایت اور اخروی کامیابی کے لیے بھی اہم سمجھا گیا ہے۔

تعلیم کا ایک اور اہم مقصد انسان کی اخلاقی تربیت ہے۔ اسلام میں علم اور عمل کا آپس میں گہرا تعلق بتایا گیا ہے۔ امام علی علیہ السلام کا قول ہے" :علم کے بغیر کوئی عمل نہیں اور عمل کے بغیر کوئی علم نہیں"۔ یہ قول اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ علم اور اخلاقی عمل ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں نیک کردار، سچائی، اور انصاف کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے انسان کو اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار کی راہ پر گامزن کیا جاتا ہے، جس کا مقصد معاشرت میں انصاف اور امن کا قیام ہے۔

اسلامی تعلیمات میں معاشرتی ذمہ داریوں کا شعور بھی دیا گیا ہے۔ قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ ہمیں اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہیے اور ہمیں معاشرتی بہتری کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ انسان کو نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے گرد و نواح کے لوگوں کی فلاح کے لیے بھی کام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس معاشرتی شعور کی بناء پر ایک فرد اپنے آپ کو معاشرے کے لیے مفید اور ضروری سمجھتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو انسانیت کے فائدے کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔

تعلیم کا ایک اور اہم پہلو روحانی نشوونما ہے۔ اسلامی تعلیمات میں تعلیم کے ذریعے روحانی ترقی پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ علم کا مقصد صرف دنیاوی فلاح یا مادی ترقی نہیں ہونا چاہیے بلکہ انسان کی روحانی حالت کو بہتر بنانا اور اللہ کی قربت حاصل کرنا بھی ہونا چاہیے۔ اسلام میں علم و معرفت کی تعلیمات انسان کو اللہ سے جوڑتی ہیں اور اسے اپنی تخلیق کے اصل مقصد کا شعور فراہم کرتی ہیں۔

دوسری طرف، جدید تعلیمی رجحانات میں تعلیم کا مقصد عام طور پر معلوماتی بنیاد پر مرکوز ہوتا ہے۔ اس میں طلبہ کو مختلف شعبوں میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں، لیکن اکثر روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ جدید تعلیمی نظام کی تشکیل زیادہ تر مارکیٹ کی ضروریات اور روزگار کی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کو مخصوص مہارتیں فراہم کرنا ہے تاکہ وہ کاروبار اور معیشت میں کامیاب ہو سکیں، مگر اس دوران ان کی روحانی اور اخلاقی تربیت پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ یوں یہ نظام عموماً انسان کی شخصیت سازی کے ان پہلوؤں کو نظرانداز کرتا ہے جو اسے ایک متوازن اور ذمہ دار انسان بنانے میں مددگار ہوتے ہیں۔

عصرِ حاضر کی تعلیم میں تکنیکی مہارتوں کی تعلیم پر بھی خاص زور دیا جاتا ہے، جیسا کہ کمپیوٹر، انجینئرنگ، اور سائنس کی تعلیم۔ ان علوم کا مقصد انسان کو جدید

ترقیات اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے قابل بنانا ہے، لیکن یہ تعلیم بعض اوقات انسان کو اپنی روحانی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے دور کر دیتی ہے۔ جدید تعلیمی رجحان میں مخلوط تعلیم کا بڑھتا ہوا رجحان بھی شامل ہے، جہاں طلبہ کو مشترکہ ماحول میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ نظام اکثر اسلامی اقدار کے مطابق نہیں ہوتا اور بعض اوقات نوجوانوں کی اخلاقیات پر منفی اثرات ڈال سکتا ہے۔

مجموعی طور پر قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کے نزدیک تعلیم کا فلسفہ ایک متوازن اور جامع نقطۂ نظر پیش کرتا ہے جو علم، اخلاقیات، معاشرتی ذمہ داریوں اور روحانی نشوونما کو یکجا کرتا ہے۔ اس فلسفے میں تعلیم کا مقصد انسان کو نیک، خود مختار اور معاشرتی ذمہ داریوں سے واقف بنانے کے ساتھ ساتھ اللہ کی قربت حاصل کرنا ہے۔ جبکہ معاصر تعلیمی رجحانات اکثر مخصوص مقاصد اور مارکیٹ کی ضروریات پر مرکوز ہوتے ہیں، جس میں روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

ضروری ہے کہ ہم معاصر تعلیمی نظام میں قرآن اور اہل بیت) علیہم السلام (کے فلسفہ تعلیم کو شامل کریں تاکہ ایک متوازن، اخلاقی اور روحانی تربیت فراہم کی جا سکے۔ اس طرح طلبہ نہ صرف کامیاب پیشہ ور بنیں گے بلکہ ایک نیک اور متوازن انسان بھی بنیں گے جو معاشرتی بہتری کے لیے کام کرنے کے قابل ہوں گے۔

سامراجی نظام سے مقابلے کیلئے حکمت عملی

سامراجی طاقتوں کے استحصالی نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو مختلف سطحوں پر جامع حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس حکمت عملی میں تعلیمی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی، اور انفرادی سطحیں شامل ہیں، جن کا مقصد قومی خود مختاری اور خود کفالت کو فروغ دینا ہے تاکہ قوم سامراجی اثرات سے محفوظ رہے۔ ان مختلف سطحوں کے اقدامات اور حکمت عملی کو درج ذیل انداز میں وضاحت سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

تعلیمی حکمت عملی کے حوالے سے معیاری تعلیم فراہم کرنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ قوم کو ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے جو نہ صرف جدید سائنسی اور تکنیکی علوم کی تعلیم دے بلکہ ان کی ثقافت، تاریخ، اور مذہب سے بھی روشناس کروائے۔ اس تعلیمی نظام کو اس طرح سے ترتیب دینا ضروری ہے کہ طلبہ میں تنقیدی سوچ اور تجزیاتی صلاحیتیں پیدا ہوں۔ یہ مہارتیں انہیں سامراجی اثرات کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے میں مدد فراہم کریں گی۔ اس کے علاوہ، نصاب میں ایسی تبدیلیاں لانا بھی ضروری ہے جو قومی شناخت، ثقافتی ورثے، اور حقیقی تاریخ کی عکاسی کریں تاکہ طلبہ کو اپنی تہذیب اور ورثے پر فخر ہو۔

سیاسی حکمت عملی میں عوامی سطح پر سیاسی شعور بیدار کرنا اہمیت رکھتا ہے۔ جب عوام کو اپنے حقوق اور فرائض کا شعور حاصل ہو گا تو وہ سامراجی طاقتوں کے استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل ہوں گے۔ قوم کو متحد کرنے کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے درمیان اتحاد کی ضرورت ہے تاکہ مشترکہ مفادات کے لیے ایک مؤثر آواز پیدا کی جا سکے۔ داخلی سیاسی نظام کی اصلاح بھی ضروری ہے، جس میں شفافیت، انصاف، اور شمولیت کو فروغ دیا جائے تاکہ عوام کا اعتماد بحال ہو اور سامراجی مداخلت کا راستہ روکا جا سکے۔

سماجی حکمت عملی کے حوالے سے عوام میں سماجی مسائل جیسے غربت، بے روزگاری، اور تعلیم کی کمی کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا اہم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی کمیونٹیز کی ترقی کے منصوبے شروع کیے جائیں تاکہ وہ خود کفیل بن سکیں اور سامراجی طاقتوں کی مداخلت سے محفوظ رہ سکیں۔ نسلی اور مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینا بھی ضروری ہے تاکہ اندرونی اختلافات کو کم کیا جا سکے اور قوم کے تمام طبقات متحد ہو کر سامراجی اثرات کا مقابلہ کر سکیں۔

ثقافتی حکمت عملی میں ثقافت، زبان، اور روایات کے تحفظ کے لیے مؤثر اقدامات کرنا لازمی ہے تاکہ سامراجی اثرات کو کم کیا جا سکے۔ مقامی فنون، ادب، اور روایات کو فروغ دینا ضروری ہے تاکہ قوم کی شناخت مضبوط ہو۔ عالمی سطح پر قومی شناخت کو برقرار رکھنے اور پیش کرنے کے لیے دوسرے ممالک کے ساتھ

ثقافتی تبادلوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے، جس سے عالمی سطح پر قوم کا مثبت تشخص ابھرتا ہے اور سامراجی ثقافتی غلبے کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔

معاشی حکمت عملی میں سب سے اہم پہلو معاشی خود کفالت ہے۔ مقامی صنعتوں اور کاروبار کی ترقی کے لیے خصوصی اقدامات کیے جانے چاہییں تاکہ قوم معاشی طور پر خود کفیل ہو سکے اور سامراجی طاقتوں کی اقتصادی مداخلت سے بچ سکے۔ قومی وسائل کا بہتر استعمال کرنا اور وسائل کی بچت کے طریقے اپنانا بھی ضروری ہے تاکہ مقامی معیشت مضبوط ہو اور بیرونی طاقتوں کا انحصار کم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ، کمزور طبقات کے لیے معاشرتی ترقی کے منصوبے شروع کرنا بھی ضروری ہے، جس سے معاشرتی انصاف اور استحکام کا قیام ممکن ہو گا۔

انفرادی حکمت عملی کے تحت افراد کی ذاتی ترقی پر توجہ دینا ضروری ہے۔ اس کے لیے تربیت، تعلیم، اور پیشہ ورانہ مہارتوں کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ قومی بہتری میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ افراد میں نیک کردار، اخلاقیات، اور قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو اعلیٰ مقاصد کے لیے وقف کر سکیں۔ لوگوں میں خود اعتمادی اور خود انحصاری کا احساس پیدا کیا جانا چاہیے تاکہ وہ اپنی قوم کی بہتری کے لیے دلجمعی سے کام کریں اور سامراجی طاقتوں کے خلاف مضبوط رہ سکیں۔

سامراجی طاقتوں کے استحصالی نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو تعلیمی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی، اور انفرادی سطح پر ایک جامع حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ ایسی حکمت عملی نہ صرف قوم کی شناخت کو مضبوط بنائے گی بلکہ انہیں خود انحصاری کی طرف لے جائے گی، جو کہ ایک مضبوط اور خود مختار قوم کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح کی جامع حکمت عملی قوم کو سامراجی اثرات سے محفوظ رکھے گی اور ان کی ترقی، خوشحالی، اور خود مختاری کی راہ ہموار کرے گی۔

ناکام و کامیاب کون؟

اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ قدرتی قوانین کائنات اور انسانی زندگی کے نظام میں ایک خاص ترتیب سے کام کرتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کامیاب افراد وہ ہیں جو اخلاقی اور روحانی اقدار کو اختیار کرتے ہیں اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، جس سے ان کی روحانی ترقی ہوتی ہے اور وہ اللہ کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف ناکام افراد وہ ہوتے ہیں جو ان قدرتی قوانین کی مخالفت کرتے ہیں اور تکبر، ظلم، اور خود غرضی جیسے منفی رویوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ افراد بظاہر دنیاوی اعتبار سے کامیاب دکھائی دے سکتے ہیں، مگر ان کی یہ کامیابی عارضی ہوتی ہے اور انجام کار وہ اپنی تباہی کی طرف بڑھتے ہیں۔

شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق، قدرتی قوانین کے پس منظر میں کامیاب شخص وہ ہے جو اللہ کے احکام کی پیروی کرتا ہے، زندگی کی مشکلات کا صبر و استقامت سے سامنا کرتا ہے، اور ایمان کو مضبوطی سے تھامے رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو آخرت میں دائمی کامیابی نصیب ہوتی ہے اور اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، ناکام شخص وہ ہے جو اللہ کی رہنمائی سے منہ موڑ لیتا ہے، دنیاوی خواہشات میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں اللہ کی ناراضگی کا سامنا کرتا ہے، چاہے وہ بظاہر دنیا میں کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو۔ اس کا انجام دونوں جہانوں میں ناکامی اور خسارے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک متوازن اور مرتب نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس میں ہر شے اپنے فطری اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ ان قدرتی اصولوں کا دائرہ صرف مادی کائنات تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی، اخلاقیات، اور روحانیت میں بھی ان اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ انسان کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے فطری نظام کو سمجھے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے۔

کامیاب شخص وہ ہوتا ہے جو اللہ کے احکام کو اپنی زندگی کا محور بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر عمل کے پیچھے ایک مقصد اور حکمت ہے، اور اس مقصد کو سمجھ کر عمل کرتا ہے۔ اس کا کردار صبر، تحمل، اور شکر کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، اور وہ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی میں اللہ کی محبت اور رضامندی کو اولین ترجیح حاصل ہوتی ہے، اور وہ دنیوی آسائشوں یا وقتی کامیابیوں کو اصل مقصد نہیں سمجھتا۔ اللہ کے رسول ﷺ اور اہل بیت علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، وہ اللہ کی رضا کی جستجو میں اپنے اخلاق،

عبادات، اور معاملات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے شخص کی آخرت میں کامیابی یقینی ہوتی ہے اور وہ جنت کی ابدی نعمتوں کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

اس کے برعکس، ناکام شخص وہ ہے جو اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے اور دنیا کی چکاچوند میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ شخص اللہ کی رہنمائی کو چھوڑ کر اپنی عقل اور خواہشات کو فوقیت دیتا ہے، اور اکثر مادی وسائل کے پیچھے بھاگتا ہے۔ وہ اپنے مفادات کے لئے جھوٹ، فریب، اور ظلم کا سہارا لیتا ہے اور اسے دنیا میں وقتی کامیابیاں حاصل بھی ہو سکتی ہیں، مگر اس کے اندرونی سکون اور اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ ایسے فرد کی زندگی میں جب مشکلات آتی ہیں، تو وہ بے چینی، مایوسی اور ناشکری کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ اس نے اللہ پر توکل اور صبر کی روحانی دولت کو نہیں اپنایا ہوتا۔ ایسے شخص کا انجام اللہ کے عذاب اور ناراضی کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور آخرت میں وہ خسارے اور ندامت کا شکار ہوتا ہے۔

شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق، امامان معصومین علیہم السلام نے بھی کامیابی اور ناکامی کے اصولوں کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق حقیقی کامیابی اللہ کی معرفت اور اس کی رضا میں پنہاں ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں" :کامیابی وہ ہے جس میں انسان اپنی روح کو پاکیزہ اور اللہ کے قریب کرتا ہے۔ "ان کے اقوال کے مطابق، دنیاوی مال و دولت، شہرت، اور عہدے سب وقتی چیزیں ہیں، اور اصل

کامیابی وہ ہے جو انسان کو اللہ کے قریب کر دے اور اس کی آخرت سنوار دے۔

اس طرح، قدرتی قوانین کے مطابق کامیاب وہ ہے جو اپنی زندگی کو اللہ کے احکام اور امامان معصومین علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق گزارتا ہے، جبکہ ناکام وہ ہے جو ان رہنمائیوں کو پس پشت ڈال کر خود کو وقتی اور فانی دنیاوی خواہشات کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔

غربت کی وجہ سستی، کاہلی یا طاقتوروں کا استحصال؟!

دنیا میں غربت کی بلند شرح ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہیں، خاص طور پر نوآبادیاتی طاقتوں کے ذریعے استحصال۔ یہ کہنا کہ غربت میں زندگی گزارنے والے افراد اتنی محنت نہیں کرتے کہ خود کو سنبھال سکیں، ایک سطحی اور محدود نظریہ ہے جو اس پیچیدہ صورت حال کو نظر انداز کرتا ہے۔

سب سے پہلے، غربت کے پیچھے تاریخی استحصال کا عنصر اہم ہے۔ نوآبادیاتی دور میں طاقتور ممالک نے کمزور قوموں کے وسائل کو بے دردی سے لوٹا۔ ان طاقتور اقوام نے ان علاقوں کے قدرتی وسائل، زمین اور محنت کشوں کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی قومیں اپنی معیشت کو مستحکم کرنے اور ترقی کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ جب نوآبادیاتی حکمرانی ختم ہوئی تو ان ممالک کو ایک بنیادی ڈھانچے اور اداروں کی کمی کا سامنا تھا جو ترقی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ بہت سے ممالک آج بھی ان نقصانات کے اثرات بھگت رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں غربت کی سطح بلند ہے۔

دوسرا اہم عنصر نوآبادیاتی طرز عمل کا تسلسل ہے۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے باوجود عالمی طاقتوں نے اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھا، جس کی وجہ سے عالمی معیشت کے معاملات میں ترقی پذیر ممالک کی خودمختاری کو محدود کیا گیا۔ کثیر القومی کمپنیاں اب بھی ان ممالک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں، لیکن یہ سرمایہ کاری اکثر مقامی معیشتوں کے فائدے کی بجائے اپنے مفادات کے لئے ہوتی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے، جیسے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک، ترقی پذیر ممالک کو قرض فراہم کرتے ہیں، مگر ان قرضوں پر سخت شرائط عائد ہوتی ہیں۔ ان شرائط کی وجہ سے مقامی حکومتیں اپنے وسائل کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے میں ناکام رہتی ہیں، جس سے ترقی پذیر ممالک کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

تیسرا عنصر تعلیم کی عدم رسائی ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں تعلیمی نظام مضبوط نہیں ہے، جس کی وجہ سے نوجوان نسل کو معیاری تعلیم حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم کی کمی کا مطلب یہ ہے کہ لوگ بہتر ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے، اور کم معاوضے والی ملازمتوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، جو انہیں غربت سے نکالنے میں ناکام رہتی ہیں۔ یوں تعلیم کی کمی ان افراد کو معاشی استحکام حاصل کرنے سے روکتی ہے۔

چوتھا اہم پہلو صحت کی سہولیات کی کمی ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں صحت کی بنیادی سہولیات کا فقدان ہے یا وہ غیر معیاری ہیں، جس کی وجہ سے لوگ مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بیماریاں نہ صرف ان کی جسمانی قوت کو متاثر کرتی ہیں بلکہ انہیں کام کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑتیں، جس کے نتیجے میں وہ غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں۔

ایک اور اہم عنصر ثقافتی اور سماجی عوامل ہیں۔ غربت میں رہنے والے افراد بعض اوقات سماجی چالوں کا سامنا کرتے ہیں، جیسے کہ صنفی امتیاز، نسلی تفریق یا دیگر سماجی عدم مساوات۔ یہ عوامل ان کی ترقی کی راہ میں مزید مشکلات پیدا کرتے ہیں اور انہیں غربت کے شکنجے میں جکڑے رکھتے ہیں۔

ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ غربت میں مبتلا افراد محنت نہیں کرتے، حقیقت کے خلاف ہے۔ غربت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو ساختی عدم مساوات، تاریخی استحصال اور موجودہ عالمی طاقت کے نظام کا نتیجہ ہے۔ اس کی جڑیں سماجی، اقتصادی اور ثقافتی حالات میں ہیں، اور اس مسئلے کا حل محض انفرادی کوششوں سے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عالمی سطح پر جامع اقدامات اٹھائے جائیں اور عوامی تعاون حاصل کیا جائے تاکہ ان ساختی مسائل کو جڑ سے ختم کیا جا سکے۔

حقیقی تشیع

تشیع کی حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ان افراد تک محدود نہیں ہے جو پیدائشی طور پر شیعہ کہلاتے ہیں، بلکہ دنیا میں لاکھوں ایسے دانشمند اور عقل مند لوگ بھی موجود ہیں جو فکری طور پر اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے متفق ہیں، لیکن ظاہری طور پر تشیع کا اعلان نہیں کرتے۔ ان افراد کا شیعہ ہونا ظاہری نہیں، بلکہ فکری اور باطنی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنے عقائد کا رسمی طور پر اعلان کرے، کیونکہ اصل تشیع وہ ہے جس کی بنیاد قرآن اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے رکھی، نہ کہ وہ تشیع جو بعض مخصوص مذہبی رسومات یا فرقوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ تشیع کی اصل وہی حقیقی اور خالص دین ہے جسے ائمہ نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اور یہ دین انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔

اسلام میں تقیہ کا تصور اسی حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔ تقیہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بعض اوقات اپنے ایمان اور عقائد کو چھپانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، تاکہ جان و مال یا دیگر اہم مقاصد کا تحفظ کیا جا سکے۔ دنیا میں کئی ایسے لوگ ہیں جو اپنے دلوں میں حق کو پہچانتے ہیں، لیکن کسی خوف یا مصلحت کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ یہ لوگ ظاہری طور پر کسی اور مذہب سے وابستہ

دکھائی دے سکتے ہیں، لیکن اللہ کے نزدیک وہ حقیقی اہل ایمان ہیں، چاہے وہ یہودی، ہندو، عیسائی، یا کسی اور مذہب کے ماننے والے ہوں۔ ان کی فطری تلاش اور ایمان کی روشنی انہیں قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی طرف لے آتی ہے، اور یہی ان کی نجات کا سبب بنتی ہے۔

تقیہ کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو ظاہری طور پر نماز اور روزے جیسے اعمال انجام نہیں دیتے، لیکن ان کا دل خالص اور نیت سچی ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسے افراد، جو ظاہری عبادات سے محروم دکھائی دیتے ہیں، اللہ کے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ اجر و ثواب کے مستحق ہوں جو بظاہر دیندار اور عبادت گزار ہیں۔ اللہ کی نظر میں انسان کی نیت، خلوص اور دیانت داری اہم ہے، اور یہی چیز انسان کو بافضیلت بناتی ہے، نہ کہ محض ظاہری اعمال۔ بعض اوقات رسمی طور پر مذہب کے پابند افراد، جو نماز، روزہ اور دیگر عبادات ادا کرتے ہیں، ان لوگوں سے کم درجے پر ہو سکتے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے اخلاص رکھتے ہیں۔

تشیع فطرت کے عین مطابق ہے اور یہی اصل اسلام ہے۔ انسان کی روحانی اور فکری جستجو اسے اُس اسلام تک پہنچاتی ہے جو اہل بیت علیہم السلام نے سکھایا ہے۔ جب کوئی انسان اپنی فطرت کی پیروی کرتے ہوئے تحقیق کرتا ہے تو وہ یہی تشیع کی حقیقت پاتا ہے۔ یہ فطرتی اسلام ہے، جو انسان کے دل کی گہرائیوں

سے اُبھرتا ہے، نہ کہ صرف ظاہری عبادات اور رسومات تک محدود ہو جاتا ہے۔ رسمی تشیع اور اصل تشیع میں یہی فرق ہے کہ رسمی تشیع میں اکثر مذہبی رسومات غالب ہوتی ہیں، جبکہ اصل تشیع قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق ایک مکمل فطری اور خالص دین ہے۔

اسلام میں نجات کا راستہ اس تشیع سے جڑا ہوا ہے جو دل کی گہرائیوں سے اللہ کے قریب ہونے کا سبب بنتی ہے۔ یہ نجات رسمی طور پر شیعہ ہونے یا ظاہری عبادات پر منحصر نہیں، بلکہ انسان کے اندرونی عقائد، نیت، اخلاص اور سچائی پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل معیار انسان کا باطن اور اُس کی نیت ہے، اور وہی شخص اللہ کا محبوب ہوتا ہے جو اپنے دل میں اخلاص رکھتا ہے۔ چاہے وہ ظاہری طور پر کوئی بھی مذہب اختیار کرے یا رسمی طور پر کوئی عبادت نہ بھی کرے، لیکن اس کا خلوص اور دیانت داری اسے اللہ کے قریب کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجات کا راستہ اسی حقیقی تشیع میں پوشیدہ ہے جسے قرآن اور اہل بیت علیہم السلام نے سکھایا ہے، نہ کہ صرف ظاہری طور پر شیعہ ہونے میں۔

اسلامی تعلیمات کی اصل تصویر وہی تشیع ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔ جب انسان اپنے نفس اور روح کی گہرائیوں میں جاکر تحقیق کرتا ہے تو وہی اسلام کی اصل حقیقت تک پہنچتا ہے، جس کا جوہر اہل بیت علیہم السلام کی

تعلیمات میں مضمر ہے۔ یہی وہ تشیع ہے جسے قرآن اور اہل بیت علیہم السلام نے بیان کیا اور جس کی بنیاد فطرت پر ہے۔

سستی و کاہلی کی وجوہات و تدارک

سستی اور کاہلی کی ایک بنیادی وجہ تاخیر کرنا (Procrastination) ہے، جسے بہت سے لوگ محض سستی سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ بچپن کے صدمات (Childhood Trauma)یا زندگی میں کسی بڑے مقصد کی کمی (Lack of Great Objective)کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس مسئلے کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ذہنی اور جذباتی پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لیں۔

اگر کسی بچے کو بچپن میں کوئی صدمہ یا مشکل پیش آتی ہے، جیسے والدین کا سخت رویہ، جذباتی نظر اندازی یا خوفناک تجربات کا سامنا، تو یہ اس کے ذہنی اور جذباتی حالت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ اثرات بعض اوقات شعوری طور پر یاد نہیں آتے، لیکن یہ غیر شعوری طور پر انسان کے رویے اور ردعمل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ایسے افراد جنہوں نے بچپن میں ان مشکلات کا سامنا کیا ہو، وہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کے ذہن میں یہ خوف ہوتا ہے کہ وہ ناکام ہو جائیں گے یا ان سے غیر معمولی توقعات وابستہ ہوں گی۔ اس خوف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کاموں میں تاخیر کرنے لگتے ہیں،

اور اس تاخیر کا سبب ان کی شخصیت پر پڑنے والے ان دباؤ کا اثر ہوتا ہے جن کا سامنا انہوں نے بچپن میں کیا۔

دوسری طرف، اگر کسی انسان کی زندگی میں کوئی بڑا مقصد نہ ہو، تو وہ بھی تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جو کام کر رہا ہے وہ اس کی زندگی میں کوئی بڑا فرق نہیں ڈالے گا یا اس سے اس کی تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، تو اس کا جذبہ کم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کاموں میں دلچسپی کھو دیتا ہے۔ اس طرح کے افراد اپنے کاموں کو بار بار ملتوی کرتے رہتے ہیں اور اپنے مقصد کی طرف قدم نہیں بڑھاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زندگی میں ایک بڑا مقصد انسان کو متحرک کرتا ہے، اور جب تک یہ مقصد واضح نہیں ہوتا، انسان تاخیر کا شکار رہتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے بھی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو بے مقصد نہ گزارے۔ حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے": جس کا کوئی ہدف نہ ہو، اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ "اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی میں مقصد کا ہونا انتہائی ضروری ہے، کیونکہ مقصد کے بغیر انسان وقت کو ضائع کرتا ہے اور اپنے اصل مقصد سے بھٹک جاتا ہے۔ اگر زندگی میں کوئی واضح اور بڑا مقصد نہیں ہوتا، تو انسان کی محنت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتا ہے۔

اگر تاخیر کی جڑیں بچپن کے صدمات یا بڑے مقصد کی کمی میں ہوں، تو ان پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندرونی مسائل کو سمجھے، ان کا علاج کرے اور اپنے لیے ایک عظیم مقصد طے کرے۔ اس مقصد کی تخلیق انسان کو زندگی میں ایک سمت عطا کرتی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو بامقصد بنا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، انسان کو یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے خوف اور تحفظات کا مقابلہ کرے اور اس بات کا عہد کرے کہ وہ اپنے کاموں کو مکمل کرے گا، چاہے وہ کسی بھی قسم کے جذباتی یا ذہنی دباؤ سے گزر رہا ہو۔

اسلامی معیشت فطری ضرورتوں کی واحد کفیل

اسلامی معیشت ایک ایسا نظام ہے جو فطری انسانی تقاضوں اور معاشرتی انصاف کے درمیان توازن قائم کرتا ہے، اور اس کا مقصد انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر فلاح و بہبود کو یقینی بنانا ہے۔ اسلامی معیشت میں کچھ خصوصیات سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی موجود ہوتی ہیں، لیکن ان خصوصیات کو اسلامی اصولوں اور اخلاقیات کے مطابق ڈھالا گیا ہے تاکہ ان کے نقصانات سے بچا جا سکے۔ اسلامی معیشت فطری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک منصفانہ اور متوازن طریقہ کار فراہم کرتی ہے، جو کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔

اسلامی معیشت میں ذاتی ملکیت اور آزادی کا حق تسلیم کیا گیا ہے، کیونکہ انسان فطری طور پر اپنی محنت کے نتائج کا مالک بننا چاہتا ہے اور اپنی زندگی میں خودمختار رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسلام اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ افراد اپنی محنت کے ذریعے وسائل حاصل کریں اور ان کو اپنی مرضی سے استعمال کریں۔ تاہم، اس آزادی کا استعمال اسلامی اصولوں کے تحت ہونا چاہیے۔ اس میں وسائل کا استعمال حلال اور اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے کرنا ضروری ہے۔ سود، استحصال،

اور غیر منصفانہ تجارت کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے تاکہ معاشرتی ناانصافی سے بچا جا سکے۔ سرمایہ داری میں نجی ملکیت اور انفرادی آزادی کا تصور مکمل طور پر موجود ہوتا ہے، لیکن یہ بعض اوقات لالچ اور استحصال کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اشتراکیت میں ذاتی ملکیت کم یا ختم کر دی جاتی ہے، جس سے انفرادی آزادی محدود ہو جاتی ہے۔

معاشرتی انصاف اور مساوات انسان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی ضروریات پوری ہوں اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نہ ہو۔ اسلامی معیشت میں دولت کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنانے کے لیے مختلف مالیاتی اصول وضع کیے گئے ہیں جیسے زکوٰۃ، صدقہ، اور خمس، جو غریبوں اور مستحقین کی مدد کرتے ہیں اور دولت کے ارتکاز کو روکنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس طرح، اسلام میں معاشرتی انصاف کا تصور عمل میں لایا جاتا ہے۔ سرمایہ داری میں معاشرتی انصاف کی کمی ہوتی ہے اور دولت زیادہ تر امیر طبقے کے ہاتھوں میں رہتی ہے، جب کہ اشتراکیت میں معاشرتی انصاف کا تصور ہوتا ہے لیکن یہ ریاستی جبر کے ذریعے نافذ کیا جاتا ہے، جو اکثر غیر مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

اسلامی معیشت میں محنت اور منافع کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، کیونکہ ہر انسان اپنے کام کے بدلے انعام یا منافع چاہتا ہے تاکہ وہ خود اور اپنی فیملی کو بہتر زندگی فراہم کر سکے۔ اسلام محنت اور حلال منافع کو جائز قرار دیتا ہے اور اس

کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، لیکن غیر منصفانہ منافع اور سود کو سختی سے منع کرتا ہے۔ اسلامی معیشت میں توازن برقرار رکھا گیا ہے تاکہ محنت کے ساتھ انصاف بھی قائم رہے۔ سرمایہ داری میں منافع کی شدید حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، لیکن یہ اکثر استحصال اور عدم مساوات کا سبب بنتی ہے، جبکہ اشتراکیت میں منافع کا تصور محدود ہوتا ہے اور محنت کرنے والوں کو اس کی محنت کے مطابق معاوضہ نہیں ملتا، جو کہ کارکردگی اور ترقی میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

اسلامی معیشت میں اخلاقیات اور حدود کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ انسان کو اخلاقی اور روحانی اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی دنیاوی خواہشات کو قابو میں رکھ سکے اور صحیح و غلط کے درمیان تمیز کر سکے۔ اسلام میں کاروبار، تجارت اور مالی معاملات میں دیانت داری، شفافیت، اور عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ فلاح کا راستہ اسلامی معیشت میں دنیاوی مفادات کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی پیروی میں ہے، جو سرمایہ داری کی خود غرضی اور اشتراکیت کی بے حسی دونوں سے بچاتا ہے۔ سرمایہ داری میں معاشی مفاد اور منافع اکثر اخلاقی اصولوں سے بالا تر ہو جاتے ہیں، جبکہ اشتراکیت میں اخلاقی پہلو زیادہ ریاستی طاقت کے تابع ہوتے ہیں اور افراد کی ذاتی اخلاقیات کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔

اسلامی معیشت میں ضرورت مندوں کی مدد اور فلاحی ریاست کا تصور بھی موجود ہے۔ انسان کی فطرت میں سماجی انصاف کے نظام کا حصہ بننا اور ہر فرد کی

ضروریات کا خیال رکھنا شامل ہے۔ اسلامی معیشت میں سماجی ادارے اور مالیاتی اصول جیسے زکوٰۃ اور صدقہ کے ذریعے فلاحی ریاست کا قیام ممکن بنایا گیا ہے، جس سے معاشرتی ہم آہنگی اور برابری کا حصول ہوتا ہے۔ سرمایہ داری میں فلاحی ریاست کا تصور اکثر کمزور ہوتا ہے اور دولت مند طبقے کی بالادستی ہوتی ہے، جبکہ اشتراکیت میں فلاحی ریاست کا تصور موجود ہوتا ہے لیکن یہ جبری طور پر نافذ کیا جاتا ہے، جس سے لوگوں کی شخصی آزادی محدود ہو جاتی ہے۔

اس طرح اسلامی معیشت فطری انسانی تقاضوں جیسے ذاتی ملکیت، محنت کے انعام، اور معاشرتی انصاف کو متوازن اور اخلاقی طریقے سے پورا کرتی ہے۔ یہ سرمایہ داری کی طرح انفرادی آزادی اور منافع کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، مگر سرمایہ داری کی خود غرضی اور استحصال سے بچاتی ہے۔ اسی طرح یہ اشتراکیت کی طرح معاشرتی انصاف اور مساوات پر زور دیتی ہے، مگر ریاستی جبر کے بجائے اسلامی اخلاقیات اور ذاتی اختیار کو اہمیت دیتی ہے۔ اسلامی معیشت میں انسان کی فطری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسا طریقہ کار فراہم کیا گیا ہے جو نہ صرف انفرادی فائدے کو مدنظر رکھتا ہے بلکہ اجتماعی فلاح اور انصاف کو بھی یقینی بناتا ہے۔

قرآن کریم کی نزولی ترتیب کا انفرادی و سماجی نفسیات کے تناظر میں جائزہ

قرآن کریم کی ترتیب نزولی کا جائزہ فردی اور سماجی نفسیات کی روشنی میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ نزولِ قرآن، یعنی وحی کا تدریجی طور پر نازل ہونا، نہ صرف ایک دینی حقیقت ہے بلکہ نفسیاتی اور سماجی اثرات بھی رکھتا ہے جو مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی شعور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ قرآن کی تدریجی نزول کا مقصد انسان کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تربیت اور اصلاح کرنا تھا، اور یہ عمل انسان کی زندگی میں گہرا اثر ڈالنے کے لیے تھا۔

انفرادی نفسیات کے حوالے سے قرآن کا تدریجی نزول انسان کی نفسیاتی حالتوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ہر آیت یا سورہ جو نازل ہوئی، اس وقت کے مخصوص حالات اور انسان کی فطری ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل کی گئی۔ قرآن کا تدریجی نزول انسان کی نفسیاتی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ ایک فرد بیک وقت تمام احکام اور اصولوں پر عمل نہیں کر سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو 23 سالوں میں نازل کیا تاکہ لوگ ایک ترتیب کے ساتھ ان احکامات کو اپنی زندگی

میں اپنائیں۔ اس ترتیب سے انسان کے فکری، روحانی، اور عملی پہلوؤں کو آہستہ آہستہ پروان چڑھایا گیا۔

ابتدائی آیات میں ایمان، توحید، اور آخرت کا ذکر کیا گیا تھا، تاکہ لوگوں کا ایمان مضبوط ہو اور ان کی فکری و روحانی سطح بلند ہو سکے۔ اس کے بعد جب لوگوں کا ایمان پختہ ہو گیا تو عملی احکام جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر عبادات نازل ہوئیں۔ فردی نفسیات کے اعتبار سے یہ تدریجی حکمت عملی انسان کی ذہنی اور روحانی تربیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے اندر موجود ذمہ داریوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس تدریج سے انسان کی شخصیت میں توازن اور ہم آہنگی آتی ہے، اور وہ نیک عمل کی طرف رہنمائی پاتا ہے۔

نزولِ قرآن کے دوران مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو جس ظلم و ستم کا سامنا تھا، قرآن نے ان کی نفسیاتی حالت کو بہتر کرنے کے لیے آیات نازل کیں جو دلوں کو تسکین پہنچاتی تھیں۔ قرآن کی یہ آیات مسلمانوں کو صبر، استقامت، اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی تعلیم دیتی تھیں۔ اس طرح قرآن نے انفرادی نفسیات کو تسکین دینے اور انسان کی نفسیاتی حالت کو بہتر بنانے کا عمل جاری رکھا۔

سماجی نفسیات کے لحاظ سے قرآن کی ترتیب نزولی نے پورے معاشرتی نظام کو متوازن اور مضبوط بنایا۔ قرآن نے مکہ اور مدینہ کے مختلف معاشرتی حالات کے

مطابق احکامات نازل کیے۔ مکی دور میں ایمان اور عقیدہ کی مضبوطی پر زور دیا گیا، جبکہ مدنی دور میں قرآن نے معاشرتی زندگی کے اصول، جیسے تجارت، انصاف، اور خاندانی نظام پر احکام دیے۔ یہ تدریجی اصلاح معاشرتی نفسیات کے مطابق تھی، کیونکہ ایک بگاڑ زدہ معاشرہ اچانک تبدیلی کو قبول نہیں کر سکتا۔ قرآن نے سماجی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف مراحل میں افراد اور معاشرتی رویوں کو بہتر بنایا۔

قرآن نے مسلمانوں کے اجتماعی رویوں کو بھی متوازن کیا۔ ابتدائی آیات میں مسلمانوں کو صبر، برداشت، اور حکمت کی تعلیم دی گئی، تاکہ وہ معاشرتی دباؤ کا مقابلہ کر سکیں۔ بعد میں جب مسلمان ایک مضبوط قوت بن چکے تھے، جہاد اور دفاع کے احکامات نازل ہوئے۔ اس تدریج سے قرآن نے سماجی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو مختلف مراحل سے گزارا اور انہیں ایک مضبوط معاشرتی قوت بنایا۔

مدنی دور میں قرآن نے معاشرتی اصول و قوانین کو متعارف کرایا جیسے نکاح، وراثت، اور تجارت کے احکامات، جو ایک مستحکم معاشرتی نظام کے قیام کی طرف تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسا معاشرہ بنانا تھا جہاں ہر فرد کو اس کے حقوق حاصل ہوں اور سماجی عدلیہ کا نظام مضبوط ہو۔ یہ قوانین فرد کو سماجی اور نفسیاتی استحکام

فراہم کرتے ہیں، جس سے وہ ایک متوازن اور ذمہ دار فرد بن کر معاشرت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

فردی اور سماجی نفسیات کا باہمی ربط ایک دوسرے سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ قرآن نے ان دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے پیغامات نازل کیے تاکہ فرد اور معاشرت دونوں کی اصلاح ہو سکے۔ فرد کی تربیت اور اصلاح کے بغیر معاشرتی اصلاح ممکن نہیں، اور اسی طرح معاشرتی رویے افراد کی نفسیاتی حالت سے متاثر ہوتے ہیں۔ قرآن نے دونوں نفسیاتی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے پیغامات کو ترتیب وار نازل کیا تاکہ فرد کی روحانی اور معاشرتی زندگی دونوں کو بہتر بنایا جا سکے۔

نزولِ قرآن کا انسانی تجربات اور نفسیاتی مراحل کے ساتھ تعلق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ قرآن کا تدریجی نزول نہ صرف الہامی حکمت کا مظہر تھا بلکہ اس نے انسانی جذبات، حالات اور نفسیاتی ضروریات کو بھی مدنظر رکھا۔ قرآن کی آیات مختلف انسانی حالات جیسے خوف، امید، کامیابی، ناکامی، خوشی، اور غم میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ جب انسان کو مصیبت یا پریشانی کا سامنا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ صبر کی تلقین کرتے ہیں تاکہ فرد اپنے جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو بہتر طریقے سے کنٹرول کر سکے۔

قرآن کریم نے انسان کو اس کی خودی اور روحانیت سے آشنا کیا اور اس کے اندر مثبت تبدیلیاں لائیں۔ نزولِ قرآن کا ہر مرحلہ انسان کو ایک قدم آگے بڑھانے کے لیے تھا، جیسے ابتدا میں ایمان کی بنیاد رکھی گئی اور بعد میں عملی احکامات نازل ہوئے۔ اس تدریجی عمل سے فرد کو نفسیاتی طور پر تیار کیا گیا تاکہ وہ اپنی اصلاح کے مراحل کو بہتر طور پر سمجھ سکے اور ان پر عمل پیرا ہو سکے۔

قرآن نے فرد کو ایمان اور ذہنی سکون کی جانب بھی رہنمائی دی۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا کہ اللہ کا ذکر دلوں کو سکون پہنچاتا ہے۔ ایمان کے ذریعے فرد کے اندرونی اضطراب کو کم کیا جاتا ہے، اور وہ نفسیاتی سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ سکون فرد کی زندگی میں توازن پیدا کرتا ہے، جو اس کی روحانیت اور ذہنی سکون کے لیے ضروری ہے۔

قرآن کے نزول کے دوران سماجی حالات اور رویوں میں تبدیلیاں آئیں جن کا نفسیاتی اثر افراد اور معاشرت پر مرتب ہوا۔ جب مسلمانوں کو ظلم و ستم کا سامنا تھا تو قرآن نے ان پر صبر و تحمل کی تعلیم دی، جبکہ مدنی دور میں جب مسلمان ایک مضبوط معاشرتی قوت بن چکے تھے، قرآن نے انہیں دفاع اور انصاف کے اصول سکھائے۔

سماجی انصاف اور انسانی نفسیات پر قرآن کے اثرات واضح ہیں۔ قرآن نے معاشرتی انصاف کو اہمیت دی اور افراد کو نفسیاتی طور پر مضبوط کیا۔ وراثت، عورتوں کے حقوق، اور معاشرتی انصاف کے قوانین فرد کو سماجی اور نفسیاتی استحکام فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح قرآن نے معاشرتی اخلاقیات اور نفسیاتی استحکام کے درمیان ایک توازن قائم کیا۔

قرآن کریم کا مجموعی نفسیاتی اثر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر گہرا ہے۔ اس نے انسان کو نہ صرف روحانی اور اخلاقی تربیت دی بلکہ اس کی نفسیاتی ضروریات کو بھی پورا کیا۔ قرآن کی آیات نے مایوسی کو امید میں تبدیل کیا اور فرد کو اس بات کا یقین دلایا کہ اللہ کا ساتھ ہمیشہ موجود ہے۔ اس نے انسان کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور اسے ایک بہتر فرد اور معاشرتی رکن بنانے کی ترغیب دی۔

قرآن کریم کی ترتیب نزولی کا فردی اور سماجی نفسیات کے تناظر میں جائزہ لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ایک جامع، ہمہ گیر، اور تدریجی تربیت کا نظام ہے۔ یہ صرف مذہبی احکامات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل نفسیاتی اور معاشرتی رہنمائی کا ذریعہ ہے جو فرد اور معاشرت دونوں کو ان کی نفسیاتی ضروریات اور حالات کے مطابق ترقی دینے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔

"انسانیت میرا مذہب" کا دھوکہ

استعماری طاقتوں نے اپنے سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں، اور ان میں سے ایک نمایاں طریقہ" انسانیت "کے نام پر مذاہب کی مخالفت ہے۔ یہ عمل ایک گہری اور سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے جس کا مقصد دنیا کے مختلف خطوں میں موجود مذہبی سماجی نظاموں کو کمزور کرنا اور ان کی جگہ ایک ایسا نظریہ پیش کرنا ہے جو ان کی اپنی سامراجی اور معاشی ضروریات کے مطابق ہو۔

مذاہب بنیادی طور پر انسانیت، عدل، اور حقوق کی ادائیگی پر زور دیتے ہیں۔ اسلام اور دیگر الہامی مذاہب کی تعلیمات انسانیت کی خدمت اور حقوق کی ادائیگی کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ یہ مذاہب لوگوں کو نہ صرف اپنے حقوق سمجھنے کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ دوسروں کے حقوق کا بھی احترام کرنے اور ان کی پاسداری کرنے کا درس دیتے ہیں۔ انسان کی روحانی، اخلاقی، اور سماجی ترقی کا مقصد یہی ہے کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی کائنات میں انصاف اور امن کے ساتھ زندگی گزارے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے، مذاہب کی اصل تعلیم ہی انسانیت اور حقوق کی

ادائیگی کے لیے ہے، اور" انسانیت "کے الگ سے قائم کیے جانے والے نظام کا مقصد صرف استحصالی بنیادوں پر ایک نیا معاشی اور سماجی نظام قائم کرنا ہے۔

استعماری طاقتوں نے جب مختلف ممالک پر قبضہ کیا تو انہوں نے وہاں کے مذہبی اور سماجی نظاموں کو اپنے مفاد کے لیے ایک رکاوٹ سمجھا۔ ان طاقتوں نے دیکھا کہ مذہب لوگوں کو آزادی، عدل، اور انصاف کے اصولوں پر اکساتا ہے اور اگر ان اصولوں کو اپنایا جائے تو سامراجی تسلط اور استحصال ممکن نہیں رہے گا۔ اس لیے انہوں نے مذاہب کے مقابلے میں" انسانیت "کا نعرہ بلند کیا۔ ان کا مقصد مذہبی تعلیمات کو بے اثر کرکے ایک نیا سامراجی انسانیت پسند نظام لانا تھا، جو ان کے تسلط کو قائم رکھ سکے۔

استعماری طاقتوں نے اپنے ایجنڈے کو فروغ دینے کے لیے مذہبی پیشواؤں اور اداروں کے دوغلے کردار کو استعمال کیا۔ بعض مذہبی رہنما اور ادارے جب کرپشن میں ملوث ہوئے یا ان کا کردار غیر اخلاقی ثابت ہوا، تو استعماری طاقتوں نے ان دوغلے عناصر کے ذریعے مذہب کی مخالفت شروع کی۔ انہوں نے عوام کو یہ باور کرایا کہ مذہب دراصل ایک استحصالی نظام ہے اور اسے رد کرنا ضروری ہے تاکہ انسانیت کا حقیقی فلاحی نظام قائم کیا جا سکے۔

جب استعماری طاقتیں براہ راست استحصال کے بجائے غیر مرئی یا غیر روایتی طریقے اختیار کرنے لگیں، تو اس دور کو" نیو کولونیل ازم "کہا جانے لگا۔ اس دور میں بھی انہوں نے مذہب کے مقابلے میں" ہیومن ازم "اور انسانیت کا نعرہ بلند کیا تاکہ لوگوں کو مذہب سے دور کیا جا سکے اور مذہبی سیاست، معاشرت، اور عدالتی نظاموں کو کمزور کیا جا سکے۔ اس طریقے سے وہ ایک ایسا نظام تشکیل دینا چاہتے تھے جس میں انسانیت کے نام پر دراصل ان کے اپنے معاشی اور سامراجی مفادات پورے ہوں۔

کولونیل اور استعماری طاقتیں اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لیے انسانیت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ یہ طاقتیں انسانیت اور ہیومن ازم کے خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر دنیا کے مختلف خطوں میں دھوکہ دہی اور فراڈ کے ذریعے وہاں کے وسائل کا استحصال کرتی ہیں اور وہاں کے مقامی مذہبی اور سماجی ڈھانچوں کو تباہ کرتی ہیں۔ وہ لوگ جو حقیقت میں انسانیت اور عدل کے علمبردار ہوتے ہیں، ان کو کمزور اور بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ سامراجی استحصال بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہ سکے۔

استعماری طاقتوں کا یہ عمل دراصل ایک گہری سازش ہے جس کا مقصد مذاہب کے حقیقی انسان دوست اور عادلانہ پیغامات کو دبانا اور ان کے مقابلے میں ایک جھوٹے انسانیت پسند نظام کو پروان چڑھانا ہے۔ اس طرح وہ اپنے معاشی اور

سامراجی مفادات کو یقینی بناتے ہیں، جبکہ عام انسان کو انسانیت کے نام پر استحصال کا شکار بنا دیتے ہیں۔ اگر مذاہب کے بعض پیروکار کرپشن میں ملوث ہیں اور ان کے دعوے اور عمل میں واضح فرق ہے تو صرف ان افراد سے برأت کا اظہار کیا جائے، نہ کہ پوری مذہبی تعلیمات اور نظام کو ہی نظرانداز کیا جائے۔ لیکن استحصالی طاقتوں کے لیے یہ موقع غنیمت ہوتا ہے کہ وہ مذاہب اور عدل و انصاف کے اصل ذمہ داروں کو جعلی دعوے داروں کے ذریعے مجروح کریں اور چند اوباشوں اور مفسدوں کے کردار کو تمام مذہبی پیروکاروں پر لاگو کرکے اپنی سازشی کرتوتوں کے ذریعے استحصالی نظام کو ترویج دیں۔

سماجی حقوق کے نام پر سامراجی سازشیں

سامراجی طاقتیں مختلف سماجی حقوق کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دے کر اور مغالطے پیدا کر کے اپنے سامراجی مفادات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ طاقتیں عالمی سطح پر ایک نیا استعماری طریقہ کار اپناتی ہیں، جس کے تحت وہ براہ راست قبضہ اور کنٹرول کے بجائے زیادہ پیچیدہ، نرم اور غیر محسوس طریقوں سے اقوام، وسائل اور ثقافتوں پر قبضہ جماتی ہیں۔ ان کی یہ حکمت عملی سماجی حقوق کے نام پر کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، جس سے وہ انسانوں کو بے وقوف بنا کر اپنے مفادات حاصل کرتی ہیں۔ سامراجی طاقتوں کی سازشیں اور دھوکہ دہی کے حربے سماجی حقوق کے مختلف شعبوں میں مزید گہرائی میں موجود ہیں۔ یہ طاقتیں مختلف طریقوں سے اپنی موجودگی کو مضبوط کرتی ہیں اور ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنے سامراجی مقاصد کو آگے بڑھاتی ہیں۔

سامراجی طاقتیں اکثر حقوقِ نسواں کا نعرہ بلند کرتی ہیں تاکہ ترقی پذیر ممالک میں خواتین کو اُن کے معاشرتی، مذہبی، اور روایتی کردار سے منحرف کیا جا سکے۔ وہ خواتین کی آزادی، مساوات اور خودمختاری کا پرکشش نعرہ لگا کر انہیں مغربی طرز زندگی کی طرف مائل کرتی ہیں، جو اکثر اُن کے مذہبی اور ثقافتی پس منظر سے

میل نہیں کھاتا۔ ان طاقتوں کا اصل مقصد خواتین کی فلاح و بہبود نہیں ہوتا، بلکہ وہ معاشرتی اور خاندانی ڈھانچے کو کمزور کر کے ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتی ہیں جہاں ان کا مغربی نظریہ غالب آ سکے اور وہاں کی مقامی معیشت اور ثقافت پر ان کا کنٹرول برقرار رہے۔ مثال کے طور پر، حقوقِ نسواں کی آڑ میں ترقی پذیر ممالک میں ایسی این جی اوز کی مالی معاونت کی جاتی ہے جو مقامی ثقافتی اقدار کو مغربی فریم ورک میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرتی انتشار، خاندانی ٹوٹ پھوٹ، اور روایتی قدروں کا زوال ہوتا ہے، جو بالآخر سامراجی مفادات کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔

اسی طرح سامراجی طاقتیں اقلیتوں کے حقوق کو بھی اپنے سامراجی مفادات کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ وہ مختلف معاشروں میں موجود نسلی، مذہبی، یا لسانی اقلیتوں کے مسائل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہیں اور انہیں" آزادی "یا" خود مختاری " کے نام پر حمایت فراہم کرتی ہیں۔ اس عمل کا مقصد ان اقلیتوں کو مقامی حکومتوں یا اکثریتی معاشرتی نظاموں کے خلاف کھڑا کرنا ہوتا ہے تاکہ سیاسی عدم استحکام پیدا ہو اور سامراجی طاقتیں اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کے فیصلے مسلط کر سکیں۔ ان طاقتوں کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ مقامی حکومتیں اپنے داخلی مسائل میں الجھ جائیں اور عالمی سطح پر ان طاقتوں کی سیاسی اور معاشی

سازشوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ جب سامراجی طاقتوں کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں، تو وہ اکثر ان اقلیتوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔

ماحولیاتی حقوق کے نام پر بھی سامراجی طاقتیں ترقی پذیر ممالک کو دھوکہ دیتی ہیں۔ وہ ماحولیاتی حقوق اور عالمی تبدیلیوں کے بارے میں عوامی شعور بیدار کرنے کی بات کرتی ہیں، مگر اصل مقصد ان ممالک کی صنعتوں اور معیشتوں کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو ماحولیاتی قوانین اور معاہدوں کی شکل میں ایسے ضوابط میں جکڑ دیا جاتا ہے جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، جبکہ ترقی یافتہ ممالک خود انہی اصولوں پر عمل درآمد کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ یہ طاقتیں اپنے مفادات کے لئے ترقی پذیر ممالک پر عالمی قوانین کا دباؤ ڈال کر ان کے قدرتی وسائل کا استحصال کرتی ہیں، جبکہ خود اپنے ممالک میں ان قوانین سے چشم پوشی کرتی ہیں۔ نتیجتاً، ترقی پذیر ممالک کی صنعتی ترقی محدود ہو جاتی ہے، اور ان پر انحصار کرنے والی سامراجی طاقتوں کو اپنے مفادات پورے کرنے کا موقع ملتا ہے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق کے نام پر بھی سامراجی طاقتیں ترقی پذیر ممالک میں مداخلت کرتی ہیں۔ وہ ایسی حکومتوں کی حمایت کرتی ہیں جو ان کے مفادات کے مطابق ہوں، اور جو حکومتیں ان کے مفادات کے خلاف ہوں، انہیں جمہوریت کی کمی، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، یا آمرانہ طرزِ حکومت کا بہانہ بنا کر کمزور

کرتی ہیں۔ جمہوریت کا نعرہ لگانے والی یہ طاقتیں دراصل ترقی پذیر ممالک میں اپنی مرضی کے حکمران لانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ وہاں کے وسائل کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکیں۔ جب وہ اپنے مقاصد پورے کر لیتی ہیں، تو جمہوریت یا انسانی حقوق کی کوئی فکر نہیں کرتی اور بعض اوقات ایسے حکمرانوں کو بھی حمایت فراہم کرتی ہیں جو خود انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث ہوں۔

عالمی امداد اور ترقیاتی پروگرامز کے نام پر بھی سامراجی طاقتیں ترقی پذیر ممالک کو اپنے قابو میں رکھتی ہیں۔ یہ ممالک بظاہر ترقیاتی منصوبوں کے لئے امداد فراہم کرتے ہیں، مگر یہ امداد اکثر ایسے منصوبوں میں خرچ کی جاتی ہے جو براہ راست ان طاقتوں کے مفادات کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ اس امداد کے ذریعے مقامی معیشتوں اور سیاسی نظاموں پر اثرانداز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان منصوبوں کے نتیجے میں اکثر قرضے اور سود میں اضافہ ہوتا ہے جس سے ترقی پذیر ممالک مزید معاشی مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ثقافتی سامراجیت کے ذریعے بھی سامراجی طاقتیں ترقی پذیر ممالک کی ثقافتوں کو کمزور کرتی ہیں۔ وہ عالمی سطح پر اپنے کلچر، میڈیا، اور فیشن کو فروغ دیتی ہیں اور ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی مقامی ثقافت، زبان اور روایات کو چھوڑ کر مغربی کلچر کو اپنائیں۔ اس کے نتیجے میں

مقامی ثقافتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک ایسی سوچ پروان چڑھتی ہے جو ان سامراجی طاقتوں کے مفادات کے مطابق ہوتی ہے۔

تعلیمی نظام پر قابو پانے کے لیے بھی سامراجی طاقتیں مختلف منصوبے بناتی ہیں۔ وہ ترقی پذیر ممالک میں تعلیمی امداد فراہم کرتی ہیں، لیکن اس امداد کے ذریعے وہ اپنے نظریات اور اقدار کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کو ان کے سامراجی اور استعماری مفادات کے مطابق تعلیم دی جائے تاکہ وہ اپنی ثقافتی، مذہبی، اور روایتی شناخت سے دور ہو جائیں اور مغربی نظریات کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ اس کے ذریعے مقامی تعلیمی نظام کمزور ہو جاتا ہے اور مغربی تعلیمی معیار کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

صحت اور فلاحی خدمات کے شعبے میں بھی سامراجی طاقتیں اپنے مفادات کو بڑھاتی ہیں۔ وہ ترقی پذیر ممالک کو صحت کے شعبے میں امداد فراہم کرتی ہیں اور فلاحی پروگرامز شروع کرتی ہیں، لیکن اس کا مقصد درحقیقت ان ممالک میں اپنی دوا ساز کمپنیوں اور طبی سازوسامان کی فروخت کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ اس طرح صحت کی خدمت کے نام پر دراصل معاشی استحصال کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا جاتا ہے۔

انسانی امداد کے نام پر فوجی مداخلت بھی سامراجی طاقتوں کی ایک حکمت عملی ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے مختلف خطوں میں جنگ زدہ علاقوں یا قدرتی آفات سے متاثرہ علاقوں میں امدادی کاموں کے بہانے فوجی قوت بھیجتی ہیں تاکہ وہاں اپنے سیاسی اور عسکری مفادات حاصل کر سکیں۔ امداد کی آڑ میں وہ مقامی حکومتوں کو کمزور کرتی ہیں اور ایسے عسکری یا سیاسی رہنماؤں کو طاقتور بناتی ہیں جو ان کے مفادات کے مطابق ہوں۔

میڈیا اور پروپیگنڈا کے ذریعے بھی سامراجی طاقتیں سماجی حقوق کے نام پر اپنی مرضی کے خیالات اور نظریات کو فروغ دیتی ہیں۔ عالمی میڈیا پر ان کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنی پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے عوام کو یہ باور کراتی ہیں کہ ان کے حالات کی بہتری مغربی اقدار، نظام اور ترقی کے ماڈل کو اپنانے میں ہے۔ میڈیا کے ذریعے پھیلائی جانے والی یہ مغالطہ آمیز اطلاعات اور نظریات لوگوں کو ان کی اپنی ثقافت، مذہب، اور معاشرتی اقدار سے بیگانہ کر دیتی ہیں۔

خود مختاری کے نام پر قرضوں کا جال بھی سامراجی طاقتوں کی ایک حکمت عملی ہے۔ وہ ترقی پذیر ممالک کو بڑے قرضے فراہم کرتی ہیں، جو بظاہر ان ممالک کی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے دیے جاتے ہیں، مگر درحقیقت یہ ممالک ان قرضوں کی ادائیگی میں ہی پھنس جاتے ہیں۔ سامراجی طاقتیں ان قرضوں کے

ذریعے ان ممالک کی معیشتوں پر اپنا کنٹرول بڑھاتی ہیں اور جب یہ ممالک قرضے واپس کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو ان پر مزید شرائط عائد کر دی جاتی ہیں۔

سماجی حقوق کے نام پر سامراجی طاقتوں کا یہ دھوکہ دراصل عالمی سطح پر ایک نئے استعماری نظام کا حصہ ہے، جس کا مقصد صرف اور صرف اپنی طاقت اور مفادات کا تحفظ اور فروغ ہوتا ہے۔ یہ طاقتیں ترقی پذیر ممالک کی فلاح و بہبود کا دعویٰ کرتی ہیں، مگر درحقیقت ان کے مفادات کے تحت ان ممالک کی خود مختاری، ثقافت اور معیشت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان سازشوں کے خلاف آگاہی اور محتاط حکمت عملی کی ضرورت ہے تاکہ ترقی پذیر ممالک اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

اختلافات کی وجہ اور نکتہ اشتراک

انسانی معاشروں میں اختلافات کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ مختلف مائنڈ سیٹ)ذہنی و فکری ساخت (اور سوچنے کے طریقے ہر فرد کی شخصیت اور تجربات کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہ مختلف فکری ساختیں اور ذہنی سانچے انسانوں کے عقائد اور نظریات کو ایک منفرد رنگ دیتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں۔ دنیا میں خدا ایک ہے، کتاب ایک ہے، رسول ایک ہے، اور دیگر بہت سے مشترکہ عناصر بھی موجود ہیں، لیکن پھر بھی اختلافات کا وجود اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ہر فرد کا ذہنی ڈھانچہ اور سوچنے کا انداز منفرد ہے۔ انسانی اختلافات اور مختلف فکری ساختوں کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان اختلافات کو کس طرح متوازن انداز میں ہینڈل کیا جا سکتا ہے تاکہ یہ معاشرتی تفرقہ کا سبب نہ بنیں۔ اختلافات کو حل کرنے کے لیے معاشرتی اور مذہبی سطح پر مزید عوامل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جو آگے چل کر مشترکہ اور پرامن معاشرتی نظام کی تشکیل میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

فکری ساخت اور زاویۂ نگاہ کا فرق :

ایک ہی کتاب، جیسے قرآن یا دیگر آسمانی کتب، سے مختلف لوگ مختلف زاویے اور معانی اخذ کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کی فکری ساخت اور ذہنی تشکیل مختلف ہوتی ہے۔ ہر فرد کا علمی اور نفسیاتی پس منظر، اس کے ذاتی تجربات، اور اس کے ذہنی رجحانات اسے ایک منفرد زاویہ دیتے ہیں جس کے ذریعے وہ کسی دینی یا سماجی مسئلے کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک ہی آیت کو ایک عالم دین اپنے علم، تجربے، اور تربیت کے مطابق ایک خاص زاویے سے سمجھتا ہے، جبکہ ایک عام مسلمان اسی آیت کو اپنے ذاتی تجربے اور علم کی سطح کے مطابق سمجھتا ہے۔ یہی فکری اختلافات کسی مسئلے کے بارے میں مختلف تشریحات اور عقائد کا سبب بنتے ہیں۔

نفسیات کی مختلف اقسام :

انسانی نفسیات کی مختلف اقسام اور انسانوں کی متنوع ذہنی ساختیں اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ ایک ہی مذہبی حکم یا عقیدے کو مختلف طریقوں سے سمجھا جائے۔ ہر انسان کی نفسیات اس کے فیصلے، عقائد، اور افکار کو متاثر کرتی ہے۔ نفسیات کی انفرادی تفریق کی بنا پر ایک انسان کسی حکم کو اپنے مفاد یا رجحان کے مطابق قبول کرتا ہے جبکہ دوسرا شخص اسی حکم کو مختلف زاویے سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی اور عقیدے کے مسائل میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ذہنی سانچے کے مطابق حکم یا عقیدہ اخذ کرتا ہے اور اپنے طرزِ فکر

سے اسے سمجھے بغیر دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ انسانی نفسیات کی یہ متنوع تفریق اختلافات کا بنیادی سبب بنتی ہے۔

اختلافات کا وجود :

یہ اختلافات فکری اور مذہبی مسائل میں فطری ہیں، کیونکہ ہر انسان کا ذہن اور سوچنے کا طریقہ منفرد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں مختلف مکاتب فکر وجود میں آتے ہیں۔ اگرچہ خدا، کتاب اور رسول ایک ہیں، لیکن اختلافات انفرادی اور ذہنی زاویوں کی وجہ سے سامنے آتے ہیں۔ تاہم، ان اختلافات کو فطری سمجھنا چاہیے اور ان کی موجودگی کو قبول کرنا ضروری ہے، کیونکہ یہ انسانی فطرت کا حصہ ہیں۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ انفرادی سطح کے اختلافات کو معاشرتی اور اجتماعی بنیادوں پر سمجھداری سے ہینڈل کیا جائے، اور اختلافات کو وجہ بنا کر اجتماعی وحدت کو متاثر نہ کیا جائے۔

اجتماعی بنیادوں پر اشتراک کی ضرورت :

انسانی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں، جہاں سیاست اور قانون کا تعلق ہے، اختلافات کے باوجود ایک مشترکہ بنیاد پر اتفاق ضروری ہے۔ مذہبی، سیاسی اور قانونی نظامات کو مضبوط کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ ایسے اصول اور ضوابط طے کیے جائیں جن پر سب متفق ہوں۔ اس مشترکہ اتفاق کی بنیادوں پر ہی

معاشرتی عدل اور انصاف قائم رہ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگرچہ مختلف فقہی مکاتب فکر یا دینی گروہ ثانوی مسائل میں اختلافات رکھتے ہیں، لیکن بنیادی مسائل، جیسے توحید، عدل، اور معاشرتی انصاف پر اشتراک ممکن ہے۔ اس اشتراک سے اجتماعی نظام مضبوط ہوتا ہے، اور ثانوی اختلافات کو بڑے مسائل کی صورت میں نہیں دیکھنا چاہیے۔

ثانوی امور میں اختلاف کی گنجائش :

ثانوی امور میں اختلافات کو زیادہ بڑا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ یہ اختلافات فطری ہیں اور ان کا وجود انسانوں کی مختلف فکری ساختوں کی بنا پر ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ثانوی مسائل میں اختلافات کسی بھی معاشرتی یا دینی نظام کو کمزور نہیں کرتے، بلکہ ان سے معاشرتی ترقی اور علم و تحقیق کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اسلامی تاریخ میں ہمیں متعدد ایسے مثالیں ملتی ہیں جہاں مختلف مکاتب فکر نے اپنی تشریحات اور عقائد کو سامنے رکھا، لیکن جب بات اجتماعی اور معاشرتی مسائل کی آئی، تو انہوں نے ایک مشترکہ لائحہ عمل اپنایا۔ یہ مشترکہ راستہ اسلامی معاشرتی نظام کی کامیابی کا ایک اہم سبب ہے۔

توازن اور اعتدال کی اہمیت :

اختلافات کو ہینڈل کرنے کے لیے توازن اور اعتدال کی راہ اپنانا ضروری ہے۔ ہر انسان کے فکری اور نفسیاتی زاویے کا احترام کرتے ہوئے، اجتماعی مفاد کو اولیت دینی چاہیے۔ جب مختلف فکری ساختوں کو قبول کیا جائے اور ان میں توازن برقرار رکھا جائے، تو معاشرتی وحدت اور امن کا قیام ممکن ہوتا ہے۔

مذہبی مکالمہ اور باہمی احترام کی اہمیت :

فکری اختلافات کو ختم کرنے یا کم کرنے کا ایک اہم طریقہ مذہبی مکالمے کو فروغ دینا ہے۔ مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کے درمیان باہمی گفتگو اور تبادلہ خیال کے ذریعے ہم ان اختلافات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس مکالمے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کا احترام کیا جائے اور مشترکہ اصولوں پر اتفاق کیا جائے۔ یہ مکالمہ اختلافات کو مزید بڑھانے کے بجائے انہیں سمجھنے اور قبول کرنے کی راہ ہموار کرے گا۔ جب مختلف مکاتب فکر کے افراد ایک دوسرے کے عقائد اور نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ تعصبات اور غلط فہمیوں کو ختم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک پرامن معاشرہ تشکیل پاتا ہے جہاں اختلافات کے باوجود باہمی عزت اور احترام کا ماحول برقرار رہتا ہے۔

علمی ترقی اور تنوع :

اختلافات کو ایک مثبت نظر سے دیکھنا بھی ضروری ہے۔ جب مختلف زاویوں اور فکری ساختوں کے درمیان مکالمہ اور تبادلہ خیال ہوتا ہے تو اس سے علمی ترقی اور تنوع کو فروغ ملتا ہے۔ اختلافات کی وجہ سے مختلف مکاتب فکر کے افراد مختلف مسائل کے حل کے لیے نئے نئے طریقے اور خیالات پیش کرتے ہیں، جو مجموعی طور پر معاشرتی ترقی اور علمی فروغ کا سبب بنتے ہیں۔ اختلافات کو دبانے کے بجائے ان سے سیکھنے اور ترقی کرنے کی سوچ اپنانا چاہیے۔ اگر ہم اختلافات کو علمی تنوع اور ترقی کا ذریعہ سمجھیں تو معاشرہ زیادہ متوازن اور فکری طور پر مضبوط ہو گا۔

مذہبی رواداری اور مشترکہ اقدار کا فروغ :

مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کے درمیان اختلافات کے باوجود کچھ ایسی مشترکہ اقدار موجود ہوتی ہیں جن پر سب متفق ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، عدل، امن، انصاف، اور انسانی حقوق جیسے اصول تمام مذاہب میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مشترکہ اصولوں پر زور دے کر اختلافات کو کم کیا جا سکتا ہے اور معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ مذہبی رواداری کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے عقائد کو چھوڑ دیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے کے عقائد

کو تسلیم کریں اور ان کا احترام کریں۔ مذہبی رواداری کا فروغ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتا ہے جہاں اختلافات کو برداشت کرنے اور ان کو مثبت طور پر ہینڈل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اختلافات کا صحیح استعمال اور تنقید کی جگہ تجزیہ :

اختلافات کو محض تنقید کا موضوع بنانے کے بجائے انہیں تجزیہ کا ذریعہ بنایا جائے۔ جب ہم اختلافات کو تجزیاتی انداز میں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ کون سا نقطہ نظر زیادہ معقول اور حقیقت کے قریب ہے۔ تجزیہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم تعصب یا جذباتیت کے بجائے عقل اور علم کی بنیاد پر اختلافات کو پرکھیں۔ اس عمل میں، ہم اپنے اور دوسروں کے نظریات کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں، اور یہ علم ہمیں ایک مشترکہ راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تنقید کے بجائے تجزیہ معاشرتی اتحاد اور تعمیری مکالمے کو فروغ دیتا ہے۔

سیاست اور قانون میں مشترکہ اصولوں کی اہمیت :

جب سیاست اور قانون کی بات آتی ہے، تو یہ ضروری ہے کہ تمام افراد اور مکاتب

فکر ایک مشترکہ قانونی اور سیاسی نظام میں جڑیں۔ اختلافات کے باوجود، ایک ایسا سیاسی اور قانونی فریم ورک تیار کیا جائے جس پر سب افراد متفق ہوں اور جو معاشرتی امن اور انصاف کی ضمانت دے سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے فرقوں کو تسلیم کرتے ہوئے مشترکہ انسانی اقدار پر زور دیں، جو تمام انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں۔

اختلافات کے باوجود اشتراک کا یہ عمل ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم کس طرح مختلف فکری ساختوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر سکتے ہیں، تاکہ وہ نہ صرف اختلافات کو سمجھیں بلکہ ان میں ایک دوسرے سے سیکھیں۔

مذہبی رواداری کی سرحدیں

پلورل ازم (Pluralism) ایک اہم سماجی اور اخلاقی اصول ہے جس کا مقصد متنوع معاشرتی اور فکری اختلافات کو قبول کرنا اور ان کے ساتھ پرامن طریقے سے زندگی گزارنا ہے۔ اس اصول کے تحت معاشروں میں تنوع اور شمولیت کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہے، جہاں مختلف اقوام، مذاہب، اور عقائد کو نہ صرف جگہ دی جاتی ہے بلکہ ان کا احترام بھی کیا جاتا ہے۔ تاہم، اس اصول کی ایک حد ہوتی ہے جسے ہم" ریڈ لائن "کہہ سکتے ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کب پلورل ازم کے اصول پر سمجھوتا نہیں کیا جا سکتا اور کہاں اسے ختم کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

پلورل ازم کی ریڈ لائن اس وقت آتی ہے جب کسی گروہ یا فرد کی جانب سے ایسے نظریات یا عمل سامنے آئیں جو بنیادی اخلاقی اصولوں سے ٹکراتے ہوں۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی گروہ یا فرد ظلم، ناانصافی، یا انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی ترویج کرتا ہے، تو اس پر رواداری کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ پلورل ازم کا مقصد اختلافات کے باوجود مشترکہ اصولوں اور بنیادی اقدار پر اتفاق پیدا کرنا

ہے، لیکن جب یہ نظریات انسانیت یا اخلاقیات کی بنیاد کو نقصان پہنچائیں، تو انہیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح، پلورل ازم کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے مذہبی عقائد کو چھوڑ دیں یا ایسے عقائد کو قبول کریں جو ہمارے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہوں۔ اگر کوئی نظریہ یا عمل مذہبی عقائد کو مسخ کرنے، غلط تشریحات کو فروغ دینے، یا مذہبی آزادی کو دبانے کی کوشش کرے، تو یہ پلورل ازم کی حد ہے۔ اس صورت میں، ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے عقائد کی حفاظت کے لیے کھڑا ہونا ضروری ہے۔

ایک اور اہم پہلو قومی مفاد اور سلامتی سے جڑا ہے۔ پلورل ازم کا دائرہ اس وقت محدود ہو جاتا ہے جب کوئی نظریہ، گروہ یا فرد ملکی سلامتی، قومی وحدت یا معاشرتی امن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں قوموں کو اپنے مفادات اور سلامتی کی خاطر سخت فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ پلورل ازم کا مقصد اجتماعی مفادات اور امن کو یقینی بنانا ہے، اور جب یہ خطرے میں پڑ جائے، تو اس اصول کو ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

پلورل ازم اس وقت بھی ختم ہو جاتا ہے جب انصاف اور عدل کے اصولوں کو پامال کیا جانے لگے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ اپنے مفادات کے لیے دوسروں کے

حقوق سلب کرے، یا انصاف کو اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق موڑنے کی کوشش کرے، تو یہ پلورل ازم کی حد ہے۔ پلورل ازم کا مقصد ہر کسی کو برابر کے حقوق اور انصاف فراہم کرنا ہے، لیکن جب یہ حقوق پامال ہونے لگیں، تو رواداری کا خاتمہ ضروری ہو جاتا ہے۔

ذاتی مفاد کو ترجیح کب دی جائے؟

ذاتی مفاد کو پلورل ازم کے مقابلے میں ترجیح دینے کی ضرورت تب ہوتی ہے جب:

اگر کسی شخص یا گروہ کو اس کے مذہبی عقائد سے سمجھوتا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہو، تو اس صورت میں ذاتی مذہبی مفاد کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی قانون یا پالیسی کسی فرد کو اس کے دین پر عمل کرنے سے روکے، تو اس پر عمل کرنے کے بجائے دینی مفاد کو اہمیت دینی چاہیے۔ یہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ فرد اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزار سکے۔

اسی طرح، اگر کسی کی ذاتی آزادی یا حقوق پامال کیے جا رہے ہوں، جیسے آزادئ اظہار یا مذہبی آزادی، تو اس وقت فرد یا گروہ کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑا ہونا پڑے گا۔ یہ نہ صرف انفرادی حقوق کی حفاظت کے لیے ضروری ہے

بلکہ ایک ایسی فضا قائم رکھنے کے لیے بھی جہاں ہر شخص اپنی آزادی سے فائدہ اٹھا سکے۔

اگر پلورل ازم کے تحت کسی فرد یا گروہ کے ساتھ انصاف نہ کیا جا رہا ہو، یا اس کے حقوق کو نظر انداز کیا جا رہا ہو، تو اس وقت ذاتی مفاد اور انصاف کی بحالی کے لیے رواداری کو ختم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس میں فرد کی ذاتی حیثیت کے بجائے پورے معاشرتی نظام کا توازن اہمیت رکھتا ہے، اور جب انصاف کی کمی محسوس ہو، تو اس کا سدباب کرنا ضروری ہے۔

اگر پلورل ازم کا غلط استعمال کیا جا رہا ہو اور یہ معاشرتی امن و استحکام کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہا ہو، تو ایسی صورت میں ذاتی یا قومی مفاد کو فوقیت دینا ضروری ہے تاکہ معاشرتی استحکام برقرار رہے۔ ایسی صورت میں پلورل ازم کی حدود طے کی جاتی ہیں تاکہ عوامی مفاد اور سماجی نظم کو برقرار رکھا جا سکے۔

پلورل ازم کے اصولوں کو اپنانا معاشرتی تنوع اور شمولیت کے فروغ کے لیے ضروری ہے، لیکن اس کی بھی ایک حد ہے جہاں بنیادی اصولوں کی حفاظت، دین و عقیدے کی سالمیت، اور انسانی حقوق کو اہمیت دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پلورل ازم کی ریڈ لائن ان مقامات پر کھنچتی ہے جہاں اخلاقی، دینی، قومی یا عدالتی

اصولوں کی پامالی ہو رہی ہو۔ ایسی صورت میں ذاتی مفاد کو فوقیت دینا ایک جائز اور ضروری عمل ہوتا ہے تاکہ انصاف اور اجتماعی مفاد کا تحفظ کیا جا سکے۔

ضروریاتِ انسانی –از ولادت تا مرگ

فلاسفہ اور دانشوروں کے مطابق انسان کی ضروریات بچپن سے بڑھاپے تک جسمانی، نفسیاتی، سماجی، اور جذباتی شعبوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ ان تمام مراحل میں انسان کو مختلف نوعیت کی ضروریات کا سامنا ہوتا ہے، جن میں جسمانی صحت، ذہنی نشوونما، سماجی تعلقات، اور جذباتی استحکام شامل ہیں۔

انسان کی ضروریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں، اور فلسفہ، نفسیات، اور سماجی علوم کی روشنی میں انہیں مندرجہ ذیل نکات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) بچپن(Infancy and Childhood)

یہ عمر زندگی کی ابتدا ہوتی ہے اور انسانی شخصیت اور رویے کی بنیادیں اسی دور میں رکھی جاتی ہیں۔

1۔ بنیادی جسمانی ضروریات:

- خوراک، پانی، نیند :بچے کی جسمانی نشوونما کے لیے مناسب غذا، نیند اور صحت مند ماحول بنیادی ضرورت ہیں۔

- حفاظت :بچے کو جسمانی اور نفسیاتی حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حفاظت اسے جسمانی نقصان، خوف اور عدم استحکام سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

2۔ محبت اور پیار:

- بچپن میں بچے کو محبت اور پیار کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ یہ محبت والدین اور قریبی رشتہ داروں سے حاصل ہوتی ہے اور بچے کی نفسیاتی اور جذباتی نشوونما میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

3۔اعتماد اور انسیت:

- اعتماد پیدا کرنے کے لیے بچے کو اپنے والدین اور دیکھ بھال کرنے والوں کے ساتھ مضبوط جذباتی تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

4۔ سیکھنے اور دریافت کرنے کی خواہش:

- بچے میں فطری طور پر سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اسے کھلونے، کتابیں، اور سیکھنے کے مواقع فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھ سکے۔

5۔زبان اور کمیونیکیشن:

- زبان سیکھنا اور کمیونیکیشن کی صلاحیت پیدا کرنا بچے کی ضروریات میں شامل ہے تاکہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکے۔

(ب) لڑکپن(Adolescence)

لڑکپن کی عمر جسمانی، نفسیاتی، اور سماجی تبدیلیوں کا دور ہے، اور اس میں نوجوانوں کی ضروریات بھی خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔

1۔ شناخت کی تلاش:

- اس عمر میں فرد اپنی ذاتی اور سماجی شناخت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ یہ شناخت خودی کی پہچان، سماج میں اپنی جگہ کی تلاش، اور اپنے اصولوں کی تشکیل کے گرد گھومتی ہے۔

2۔ استقلال کی خواہش:

- نوجوان اپنے فیصلے خود کرنے اور اپنی زندگی کو خود کنٹرول کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ انہیں آزادی اور خودمختاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

3۔ دوستی اور سماجی تعلقات:

- اس عمر میں دوستیاں اور سماجی تعلقات بہت اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ نوجوانوں کو گروپوں میں شامل ہونے اور اپنے ہم عمروں سے تعلقات بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

4۔ رہنمائی اور حدود:

- نوجوان کو آزادی کے ساتھ ساتھ رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج یا خاندان کے بڑے افراد انہیں درست راستے پر رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

5۔ تعلیم اور مہارتوں کی ترقی:

- اس عمر میں تعلیم اور عملی مہارتوں کی ترقی بنیادی ضروریات میں شامل ہوتی ہیں تاکہ نوجوان اپنے مستقبل کے لیے تیار ہو سکے۔

(ج) جوانی(Adulthood)

جوانی کا دور ایک فرد کی ذمہ داریوں اور سماجی تعلقات میں مزید پختگی لاتا ہے۔

1۔ روزگار اور معیشت:

- جوانی میں روزگار تلاش کرنا اور مالی طور پر خود مختار ہونا اہم ضرورت ہے۔ فرد کو ایسی نوکری یا کام کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ اپنی مالی ضروریات پوری کر سکے۔

2۔ رومانوی اور ازدواجی تعلقات:

- جوانی میں رومانوی یا ازدواجی تعلقات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تعلقات محبت، شراکت داری، اور جذباتی تسکین کا ذریعہ بنتے ہیں۔

3۔ ذمہ داری اور فیصلے:

- فرد کو ذاتی اور سماجی زندگی میں مختلف قسم کی ذمہ داریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کو اہم فیصلے لینے اور ذمہ داریاں نبھانے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوتی ہے۔

4۔ سماجی تعاون اور تعلقات:

- فرد کو سماجی طور پر متحرک رہنا اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوستوں، ساتھیوں، اور خاندان کے ساتھ تعاون اس کی جذباتی اور سماجی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

(د) بڑھاپا(Old Age)

بڑھاپے میں جسمانی، نفسیاتی، اور سماجی ضروریات خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ جسمانی کمزوری اور سماجی تعلقات میں تبدیلیاں اس عمر میں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔

1۔ صحت اور طبی دیکھ بھال:

- اس عمر میں صحت کی دیکھ بھال بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں بیماریاں اور جسمانی کمزوری عام ہوتی ہیں، جس کے لیے طبی مدد اور جسمانی فٹنس کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

2۔ احترام اور عزت:

- بزرگ افراد کو سماجی عزت اور احترام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں اپنے خاندان اور سماج میں اہمیت اور مقام کا احساس ہونا چاہیے۔

3۔ سماجی تنہائی سے بچاؤ:

- بڑھاپے میں سماجی تنہائی کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ بزرگ افراد کو سماجی تعلقات اور دوستوں یا خاندان کے ساتھ تعلق برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جذباتی تنہائی سے بچ سکیں۔

4۔ نئی نسل کی رہنمائی:

- اس عمر میں افراد اپنے تجربات اور دانشمندی کو نئی نسل تک منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کے تجربات کا اعتراف اور سماجی مفاد میں کردار ادا کرنے کا موقع دینا ضروری ہے۔

5۔ مالی تحفظ:

- بڑھاپے میں مالی تحفظ ایک اہم ضرورت ہے تاکہ فرد اپنی بنیادی ضروریات، جیسے کہ صحت اور رہائش، کو پورا کر سکے۔

(ہ) جوانی کا وسط اور بڑھتی عمر (Middle Adulthood)

یہ عمر عموماً 35 سے 60 سال کے درمیان ہوتی ہے اور فرد کی شخصیت اور سماجی مقام میں مزید پختگی آ جاتی ہے۔ اس دور میں فرد کو کئی نوعیت کی فردی اور سماجی ضروریات کا سامنا ہوتا ہے:

1۔ شخصی ترقی اور کیریئر کا استحکام:

- جوانی کے وسط میں فرد اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پختہ ہو چکا ہوتا ہے اور کیریئر میں مزید ترقی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ کیریئر میں استحکام، مہارتوں کی بہتری، اور کام کے ساتھ ذاتی تسکین ضروریات میں شامل ہوتی ہیں۔

2۔ گھر اور خاندان کی ذمہ داریاں:

- اس مرحلے میں فرد کو اپنے خاندان کی دیکھ بھال اور ذمہ داریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم، ان کی تربیت، اور والدین کے ساتھ معاملات میں مدد دینا فرد کی اہم ضروریات بن جاتی ہیں۔

3۔ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی:

- اس عمر میں لوگ اپنے مالی معاملات کو مستحکم کرنے اور ریٹائرمنٹ کی منصوبہ بندی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ بچت، سرمایہ کاری، اور مالی تحفظ کی ضروریات سامنے آتی ہیں تاکہ بڑھاپے میں مالی مشکلات سے بچا جا سکے۔

4۔ صحت کا خیال اور جسمانی فٹنس:

- اس عمر میں صحت پر زیادہ توجہ دینا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ جسمانی تبدیلیاں جیسے بڑھتی عمر کے ساتھ کمزوریاں، بیماریوں کا خطرہ بڑھنا، اور صحت مند طرز زندگی اختیار کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

5۔ سماجی مقام اور احترام:

- جوانی کے وسط میں فرد کو اپنے سماجی مقام، احترام، اور عزت کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ سماجی شناخت اور دوسروں کے ساتھ مثبت تعلقات قائم رکھنے کی خواہش اس دور کی ایک اہم سماجی ضرورت ہے۔

(و) بڑھاپے کی ابتدا(Late Adulthood)

یہ عمر عموماً 60 سال کے بعد آتی ہے اور فرد جسمانی، نفسیاتی، اور سماجی تبدیلیوں کا سامنا کرتا ہے۔

1۔ عزت نفس اور خود مختاری:

- بڑھاپے کی ابتدا میں فرد کو اپنی عزت نفس اور خود مختاری برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار رہنا چاہتا ہے اور دوسروں پر کم سے کم انحصار کرنا چاہتا ہے۔

2۔ تجربات کا اشتراک:

- بزرگ افراد کے لیے اپنے تجربات کا اشتراک کرنا اور آنے والی نسلوں کو اپنی دانش اور بصیرت فراہم کرنا ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ اس طرح وہ معاشرتی اور خاندانی زندگی میں اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

3۔ دوسروں کی خدمت اور سماجی کردار:

- بزرگ افراد کو دوسروں کی مدد کرنے اور سماج میں اپنا مقام برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماجی خدمت کے مواقع، جیسے رضاکارانہ کام، انہیں سماجی تعلقات اور ذمہ داریوں سے جوڑے رکھتے ہیں۔

4۔ ذہنی صحت اور جذباتی استحکام:

- اس عمر میں فرد کو اپنی ذہنی صحت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یادداشت کی کمزوری، تنہائی کا خوف، اور نفسیاتی تناؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے جذباتی سپورٹ اور سماجی تعلقات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

(ز) دیرینہ بڑھاپا(Old Age)

دیرینہ بڑھاپا عموماً 75 سال سے زائد عمر کا ہوتا ہے، اور اس میں فرد کی جسمانی اور سماجی ضروریات میں مزید تبدیلیاں آتی ہیں۔

1۔نگہداشت اور سماجی تعاون:

- دیرینہ بڑھاپے میں فرد کو زیادہ نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اپنے خاندان یا خصوصی صحتی مراکز سے مستقل دیکھ بھال کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، جذباتی تعاون اور محبت کا احساس بھی اہم ہوتا ہے۔

2۔ سماجی روابط اور دوستوں کی اہمیت:

- دیرینہ عمر میں دوستوں اور خاندان کے ساتھ تعلقات اور سماجی رابطے انتہائی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ فرد کو تنہائی سے بچنے کے لیے سماجی میل جول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر مستحکم رہ سکے۔

3۔زندگی کی تکمیل کا احساس:

- اس مرحلے میں فرد اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں پر غور کرتا ہے۔ زندگی کی تکمیل کا احساس، ماضی کی یادیں، اور آنے والی نسلوں کو اپنی حکمت و تجربات کا منتقل کرنا اس عمر کی نفسیاتی ضروریات میں شامل ہوتا ہے۔

4۔ آخری زندگی کے انتظامات:

- بڑھاپے میں فرد اپنی آخری زندگی کے انتظامات، جیسے کہ وصیت لکھنا، جائیداد کا فیصلہ، اور دیگر قانونی معاملات کو ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کا اختتام پرسکون اور ترتیب میں کرے۔

انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں فردی اور سماجی ضروریات مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ بچپن میں جسمانی ضروریات اور محبت اہم ہوتی ہے، لڑکپن میں شناخت اور خودمختاری کی تلاش ہوتی ہے، جوانی میں کیریئر اور خاندان کی ذمہ داریاں اہمیت اختیار کر لیتی ہیں، جبکہ بڑھاپے میں صحت، عزت نفس، اور سماجی روابط زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ عقلاء، فلاسفہ، اور دانشور ان تمام مراحل کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ ایک فرد کو اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں توازن اور خوشی حاصل ہو۔

اقوام متحدہ کے پائیدار ترقیاتی اہداف کی حقیقت

اقوام متحدہ کے پائیدار ترقیاتی اہداف (Sustainable Development Goals - SDGs) میں 17 نکات شامل ہیں، جن کا مقصد دنیا میں غربت، بھوک، عدم مساوات اور ماحولیاتی تباہی جیسے مسائل کو حل کرنا ہے۔ تاہمان نکات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے پس پردہ مقاصد اور ممکنہ استحصال کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔

1۔ غربت کا خاتمہ:(No Poverty)

بظاہر مقصد: دنیا بھر سے غربت کا خاتمہ۔

اصل تشویش: امداد اور قرضوں کے ذریعے غریب ممالک کو مغربی مالیاتی نظام کا پابند بنانا۔ ترقی پذیر ممالک کو ایسے قرضے دیے جاتے ہیں جن کی واپسی انہیں مزید معاشی دباؤ میں ڈال دیتی ہے۔

2۔ . بھوک کا خاتمہ:(Zero Hunger)

بظاہر مقصد: غذائی عدم تحفظ کو ختم کرکے دنیا میں بھوک کو مٹانا۔

اصل تشویش :ترقی پذیر ممالک کی زرعی صنعتوں کو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حوالے کر دینا، جس سے مقامی کاشتکاروں پر دباؤ بڑھتا ہے اور خود انحصاری میں کمی آتی ہے۔

3۔ صحت اور فلاح و بہبود:(Good Health and Well-being)

بظاہر مقصد :ہر شخص کو صحت کی بہتر سہولیات فراہم کرنا۔

اصل تشویش :صحت کے شعبے میں عالمی فارماسیوٹیکل کمپنیوں کا کنٹرول اور مغربی طبی ماڈلز کو ہر ملک میں نافذ کرنے کی کوشش۔

4۔ معیاری تعلیم:(Quality Education)

بظاہر مقصد :ہر فرد کو معیاری تعلیم کی فراہمی۔

اصل تشویش :مغربی تعلیم کے نظام اور نظریات کو فروغ دینا، جس کے نتیجے میں مقامی اور اسلامی اقدار کا حاشیے پر چلے جانا۔

5۔ صنفی مساوات:(Gender Equality)

بظاہر مقصد :صنفی عدم مساوات کا خاتمہ۔

اصل تشویش :ایسی پالیسیاں جو اسلامی خاندانی ڈھانچے اور روایات کے خلاف جا سکتی ہیں، اور مغربی فیمنسٹ نظریات کو عام کرنے کی کوشش۔

6۔ صاف پانی اور نکاسی آب:(Clean Water and Sanitation)

بظاہر مقصد :ہر شخص کو صاف پانی اور مناسب نکاسی آب کی سہولت فراہم کرنا۔

اصل تشویش :پانی کے ذخائر اور وسائل پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا کنٹرول، جس کے باعث مقامی آبادیوں کی ضروریات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

7۔ سستی اور صاف توانائی:(Affordable and Clean Energy)

بظاہر مقصد :ہر شخص کو سستی اور صاف توانائی فراہم کرنا۔

اصل تشویش :ترقی پذیر ممالک کو مغربی توانائی کمپنیوں کے وسائل پر منحصر کرنا، اور ان کے توانائی ذرائع کو کنٹرول میں لینا۔

8۔ معیشت اور مہذب روزگار(Decent Work and Economic Growth):

بظاہر مقصد :ہر شخص کے لیے مہذب روزگار اور معیشت میں ترقی۔

اصل تشویش :عالمی سرمایہ داری نظام کا فروغ، جس میں ترقی پذیر ممالک کے وسائل اور مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے۔

9۔صنعت، جدت اور انفراسٹرکچر (Industry, Innovation, and Infrastructure):

بظاہر مقصد :جدید صنعتوں اور انفراسٹرکچر کا فروغ۔

اصل تشویش :ترقی پذیر ممالک کو مغربی صنعتوں اور تکنیکی جدتوں کا محتاج بنانا، جس سے مقامی صنعتوں کی بقا مشکل ہو جاتی ہے۔

10۔عدم مساوات میں کمی:(Reduced Inequalities)

بظاہر مقصد :دنیا بھر میں عدم مساوات کو کم کرنا۔

اصل تشویش :ایسی پالیسیاں جو مغربی نظریات کو فروغ دیتی ہیں، اور مقامی اقدار کو نظر انداز کرتی ہیں۔ یہ پالیسیاں اکثر دولت مند ممالک کو مزید فائدہ پہنچاتی ہیں۔

11۔ پائیدار شہر اور کمیونٹیز:(Sustainable Cities and Communities)

بظاہر مقصد :شہروں کو پائیدار اور انسانی ضروریات کے مطابق بنانا۔

اصل تشویش :بڑے شہروں میں مغربی طرز زندگی کو فروغ دینا، جس کے باعث مقامی ثقافتیں اور روایات کمزور ہو جاتی ہیں۔

12۔ پائیدار کھپت اور پیداوار (Responsible Consumption and Production):

بظاہر مقصد :پائیدار طریقے سے وسائل کا استعمال اور پیداوار۔

اصل تشویش :ترقی پذیر ممالک پر ایسی پابندیاں عائد کرنا جو ان کی صنعتی پیداوار کو محدود کرتی ہیں، جبکہ ترقی یافتہ ممالک کو فائدہ ہوتا ہے۔

13۔ ماحولیاتی عمل:(Climate Action)

بظاہر مقصد :ماحولیاتی تبدیلیوں کے خلاف فوری اقدامات۔

اصل تشویش :ماحولیاتی پالیسیوں کے نام پر ترقی پذیر ممالک کی صنعتی ترقی پر پابندیاں عائد کرنا، جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں بڑے پیمانے پر صنعتوں کو چلانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

14۔ سمندری وسائل کا تحفظ:(Life Below Water)

بظاہر مقصد :سمندری حیات کا تحفظ اور پانی کے نیچے کے وسائل کا بہتر انتظام۔

اصل تشویش :سمندری وسائل پر بڑی کمپنیوں کا کنٹرول، اور مقامی ماہی گیر کمیونٹیز کے وسائل کا استحصال۔

15۔ زمینی وسائل کا تحفظ:(Life on Land)

بظاہر مقصد :زمینی حیات اور قدرتی وسائل کا تحفظ۔

اصل تشویش :زمینی وسائل کو بین الاقوامی کمپنیوں کے ہاتھوں میں دینا، جس سے مقامی آبادیوں کے قدرتی حقوق پر اثر پڑتا ہے۔

16۔ امن، انصاف اور مضبوط ادارے (Peace, Justice, and Strong Institutions):

بظاہر مقصد :دنیا میں امن اور انصاف کو فروغ دینا۔

اصل تشویش :عالمی طاقتوں کی طرف سے ایسے اداروں کا قیام جو ان کے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں، اور ترقی پذیر ممالک کی خودمختاری کو کمزور کرتے ہیں۔

17۔ شراکت داری برائے اہداف:(Partnerships for the Goals)

بظاہر مقصد :دنیا بھر میں مشترکہ شراکت داری کے ذریعے ترقیاتی اہداف کو حاصل کرنا۔

اصل تشویش :ترقی پذیر ممالک کو مغربی ممالک اور اداروں کے ساتھ ایسے معاہدے کرنے پر مجبور کرنا جو دراصل ان کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔

اگرچہ SDGs کے یہ 17 نکات بظاہر عالمی بھلائی، فلاح و بہبود اور ماحولیاتی تحفظ کی بات کرتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے چھپے استعماری مقاصد کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان نکات کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کو مغربی طاقتوں کے معاشی، سماجی، اور ثقافتی ڈھانچوں کا حصہ بننے پر مجبور کیا جاتا ہے، جبکہ ان کے اپنے مفادات اور خودمختاری کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

معصومین ؑ کی سیرت اور تعلیمات :جذباتی وابستگی سے عملی زندگی تک

مذہبی تاریخ کی مثبت کردار شخصیات اور واقعات کو صرف جذباتیت کے تحت دیکھنا اور ان کی سیرتوں پر عمل نہ کرنا انسان کو حقیقی طور پر سعادت مند نہیں بنا سکتا۔ معصومین ؑ کی زندگیوں کا بنیادی مقصد انسانیت کے لیے ایک عملی نمونہ بنانا تھا۔ ان کی تعلیمات اور سیرتیں ہمارے لیے صرف جذباتی وابستگی کا ذریعہ نہیں، بلکہ عملی زندگی میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ اگر ہم ان شخصیات کی زندگیوں کو صرف جذباتی انداز میں دیکھیں اور ان کی تعلیمات پر عمل نہ کریں، تو یہ حقیقی مودت اور محبت کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ ان عظیم ہستیوں کی حقیقی محبت اس میں ہے کہ ہم ان کی تعلیمات کو اپنی روزمرہ زندگی میں شامل کریں اور ان پر عمل کریں۔

منقبتیں، نوحے، قصیدے اور نعتیں پڑھنا اور سننا یقیناً دل کو روحانی سکون اور محبت کی کیفیت میں مبتلا کر سکتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اگر ان شخصیات کے فرمودات، احکامات اور عملی مثالوں سے بے اعتنائی برتی جائے، تو یہ صرف

ایک ظاہری وابستگی ہوتی ہے، جو مکمل طور پر مودت کا مظہر نہیں ہو سکتی۔ حقیقی مودت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان عظیم شخصیات کی تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں شامل کریں اور ان پر عمل کریں۔ یہ عمل نہ صرف جذباتیت کے بجائے ہمارے ایمان کی عملی تصدیق ہو گا بلکہ ہمیں ان کے پیغام کو صحیح معنوں میں سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا موقع ملے گا۔

تاریخ کی شرائط کو آج کے دور میں لاگو کرنا اور موجودہ حالات میں ان تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنا ہی انسان کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ تاریخ صرف ایک ماضی کا قصہ نہیں بلکہ ایک جاری رہنے والا عمل ہے جو ہر دور کے مسائل اور چیلنجز کا حل فراہم کرتی ہے۔ اگر ہم تاریخ کے مثبت پہلوؤں کو اپنے موجودہ حالات میں اپنائیں تو یہ ہمیں معاشرتی اور روحانی کامیابی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں ہمارے معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی مسائل کے حل کے لیے ان عظیم ہستیوں کی سیرت اور تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

ایمان کا حقیقی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے ایمان کو صرف عبادات یا جذباتی عقیدت تک محدود نہ کرے، بلکہ اسے اپنی عملی زندگی میں ثابت کرے۔ معصومین ؑ اور تاریخی واقعات کا حقیقی مقصد انسان کو محض جذباتی وابستگی تک محدود رکھنا نہیں، بلکہ ان کی زندگیوں اور تعلیمات سے عملی سبق لینا ہے۔ ایمان کی کامیابی اس

میں ہے کہ وہ عدل، انصاف، محبت، اخوت، اور رحم دلی جیسے مذہبی اصولوں کو اپنے روزمرہ کے عمل میں شامل کرے۔

مذہبی تاریخ کے واقعات کو سمجھنا محض جذباتی تسکین کے لیے نہیں ہے، بلکہ ان میں پوشیدہ حکمت کو آج کے مسائل کے حل کے طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ تاریخ سے یہ سبق ملتا ہے کہ معاشرتی، سیاسی، اور اخلاقی بحرانوں کا حل کس طرح نکالا جائے۔ صرف قصیدے اور نعتیں پڑھنا اگرچہ دل کو تسکین دیتا ہے، مگر اصل مقصد ان عظیم ہستیوں کے اقوال و افعال کو اپنانا اور آج کے چیلنجز کے مطابق ان سے رہنمائی لینا ہے۔ ان کے اعمال اور افکار کو اپنی زندگیوں میں شامل کرنا ہی اصل مقصد ہے۔

نبیوں، اماموں، اور اولیاء اللہ کی زندگیوں کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اخلاقی معیار ہمارے لیے مشعل راہ بن سکیں۔ ان کی زندگیوں سے ہمیں صدق، امانت، دیانت اور انسانی خدمت جیسے اخلاقی اصول سیکھنے چاہییے۔ اگر ہم صرف ان کی مدح سرائی کرتے رہیں اور ان کے اخلاقی اصولوں سے بے اعتنائی برتیں، تو یہ ہمارے ایمان کا ناتمام پہلو ہوگا۔ حقیقی عقیدت کا مطلب ان کی اخلاقی تعلیمات کو اپنانا اور اپنے کردار میں اس کی جھلک دکھانا ہے۔ یہ تعلیمات ہماری عملی زندگی کا حصہ بنی چاہیے تاکہ ہمارا ایمان مضبوط ہو اور ہم معاشرتی سطح پر مثبت تبدیلی لا سکیں۔

مذہب میں عملی کردار کی بہت اہمیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کی زندگیاں ہمیں سکھاتی ہیں کہ ہر صورت میں عملی کردار کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ صرف رسومات اور ظاہری عقیدت سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم اپنے عمل سے ان تعلیمات کو زندہ نہ کریں۔ ان ہستیوں کی سیرتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ عملی زندگی میں کس طرح دین کے اصولوں کو نافذ کیا جائے۔ اس کے ذریعے ہم اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے ہیں اور دوسروں کے لیے ایک نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔

حقیقی مودت اور محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم صرف شخصیت کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھیں، بلکہ اس شخصیت کی تعلیمات کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔ صرف نعتیں پڑھنا یا نوحے سننا کافی نہیں، بلکہ ان ہستیوں کی تعلیمات پر چلنا ہی اصل محبت اور مودت کا ثبوت ہے۔ اس طریقے سے ہم اپنے ایمان کو حقیقی طور پر زندہ کر سکتے ہیں اور ان عظیم شخصیات کے ساتھ اپنی محبت کا حقیقی اظہار کر سکتے ہیں۔

آج کے دور کے چیلنجز اور مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے مذہبی تعلیمات سے رہنمائی لینا ضروری ہے۔ محض ماضی کے قصے سن کر اور ان سے جذباتی وابستگی پیدا کر کے ہم موجودہ دور کے مسائل کا حل نہیں نکال سکتے۔ ہمیں تاریخ سے سیکھنا ہو گا کہ کیسے ان تعلیمات کو آج کے معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی بحرانوں

میں استعمال کیا جائے۔ اس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنی روحانی ترقی کو آگے بڑھا سکتے ہیں بلکہ معاشرتی بہتری کی جانب بھی قدم بڑھا سکتے ہیں۔

مذہب کا مقصد انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت ہے۔ جذباتی وابستگی یقیناً ایک پہلو ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں ان تعلیمات کا اطلاق کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ جب ہم اپنی زندگیوں میں ان تعلیمات کو عملی طور پر نافذ کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف ان عظیم شخصیات کی حقیقی محبت کا ثبوت پیش کرتے ہیں بلکہ اپنے معاشرتی اور روحانی مسائل کا بھی حل تلاش کرتے ہیں۔

قرآن و احادیث کا جدید دور میں اطلاق :زمان و مکان کی اہمیت اور اجتہاد کی ضرورت

قرآن و احادیث کو جدید دور پر منطبق کرنے کے لیے زمان و مکان کی شرط ایک اہم عنصر ہے، لیکن یہ واحد شرط نہیں ہے۔ اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں چند بنیادی نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔

زمان و مکان کی شرط اس لیے اہم ہے کہ قرآن اور احادیث کا نزول ایک خاص معاشرتی، تاریخی، اور جغرافیائی سیاق و سباق میں ہوا تھا۔ ان تعلیمات کو جدید دور میں اپنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے عمومی اصولوں اور اقدار کو سمجھیں، جو ہر دور اور ہر جگہ پر لاگو ہو سکتی ہیں۔ تاہم، ان اصولوں کو جدید معاشرتی، علمی، اور اخلاقی سیاق و سباق میں سمجھنا اور ان کی وضاحت کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا صحیح اطلاق کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر، قرآن میں تجارت اور مالی معاملات کے بارے میں جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان کو آج کے جدید مالیاتی نظام میں ڈھالنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اسی طرح، سزاؤں اور معاشرتی اصولوں کے بارے میں بھی جدید قانونی نظام اور انسانی حقوق کی بنیاد پر ان تعلیمات کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ان کا اطلاق انصاف پر مبنی ہو۔

اس کے ساتھ ہی اجتہاد اور فہم کا عمل بھی اہم ہے۔ اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی علماء قرآن اور احادیث کے عمومی اصولوں کو نئے حالات اور مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ اجتہاد کے بغیر، دین کو معاشرتی اور علمی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ جدید دور میں اجتہاد کا عمل اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ قرآن اور احادیث کی تعلیمات موجودہ دور کے مسائل اور چیلنجز کے ساتھ ہم آہنگ رہیں، اور ان تعلیمات کو جدید تقاضوں کے مطابق سمجھا جا سکے۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ ہر آیت اور حدیث ہر شخص اور ہر زمانے پر یکساں طور پر لاگو نہیں ہوتی۔ قرآن و حدیث میں بعض آیات اور احادیث مخصوص حالات، مقامات یا افراد سے متعلق ہوتی ہیں، اور ان کا اطلاق مخصوص شرائط و ضوابط کے تحت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں عمومی احکام کے ساتھ ساتھ خصوصی احکام بھی موجود ہیں۔ بعض احکام انفرادی حالات پر منحصر ہوتے ہیں، جیسے مالی احکام، نکاح و طلاق، یا وراثت سے متعلق مسائل، جن کا اطلاق مخصوص حالات میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک آیت یا حدیث جو جنگ یا قتال سے متعلق ہو، وہ ہر مسلمان پر ہر وقت لاگو نہیں ہوگی، بلکہ مخصوص حالات میں، جیسے دشمن کی جارحیت یا ظلم و ستم کے جواب میں، اس کا اطلاق ہوگا۔ اسی طرح، زکات دینے کا حکم صرف ان پر واجب ہوتا ہے جو مالی استطاعت رکھتے ہوں، اور اس کا اطلاق ہر مسلمان پر نہیں ہوتا۔

قرآن و احادیث کی تفہیم میں مختلف عوامل شامل ہیں، جیسے شانِ نزول یا تاریخی سیاق و سباق۔ کسی بھی آیت یا حدیث کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر جاننا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس کے صحیح معانی کو سمجھا جا سکے۔ کچھ احکام عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں، جو ہر زمانے اور ہر جگہ پر لاگو ہوتے ہیں، جیسے صدق، انصاف، اور رحم دلی کی تعلیمات۔ جبکہ بعض احکام مخصوص حالات یا افراد کے لیے ہوتے ہیں، جو ہر شخص یا ہر زمانے میں لاگو نہیں ہوتے۔

بہت سے احکام قرآن اور حدیث کے اندر مخصوص شرائط کے ساتھ مشروط ہیں، جن کا علم رکھنا ضروری ہے تاکہ ان احکام کو غلط یا بے جا طریقے سے لاگو نہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر، روزے کا حکم ایک عمومی حکم ہے، لیکن اس کے ساتھ بیمار، مسافر یا ایسے افراد جن کو روزہ رکھنے میں شدید تکلیف ہو، ان کے لیے روزے کا حکم نہیں ہے۔ قرآن میں ان شرائط کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور ان کی تفہیم ضروری ہے تاکہ کوئی بھی حکم غلط فہمی یا بے جا تشریح سے لاگو نہ ہو۔

قرآن و احادیث کی تعلیمات بنیادی انسانی اقدار پر مبنی ہیں، جیسے انصاف، مساوات، اور انسانیت کی فلاح و بہبود۔ جب ہم ان تعلیمات کو جدید دور میں لاگو کرتے ہیں، تو ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ تعلیمات انسانیت کی ترقی اور بہتر معاشرت کی تشکیل کے لیے ہیں۔ اس لیے آج کے سماجی، سیاسی، اور

اقتصادی حالات کے تناظر میں ان تعلیمات کو اس طرح پیش کرنا ضروری ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے موزوں ہو اور جو جدید دور کے چیلنجز کا سامنا کر سکے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و احادیث کو جدید دور پر منطبق کرنے کے لیے زمان و مکان کی شرط اہم ہے، مگر اس کے ساتھ اجتہاد، نصوص کا صحیح فہم اور احکام کی شرائط و ضوابط کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ہر آیت اور حدیث ہر شخص اور ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر لاگو نہیں ہوتی؛ ان کا اطلاق حالات اور شرائط پر منحصر ہوتا ہے۔ دین اسلام کی تعلیمات کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح اور کامیابی ہے، اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم ان تعلیمات کو زمانے کی ضروریات کے مطابق سمجھیں اور عملی زندگی میں اپنائیں۔

ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی

محاورہ" ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی "ایک قدیم حکمت پر مبنی ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ ظاہری چمک دمک یا خوبصورتی ہمیشہ اصلیت کی عکاسی نہیں کرتی۔ بعض اوقات، جو چیز بظاہر خوبصورت اور دلکش نظر آتی ہے، اس کی اصل حقیقت بالکل مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ محاورہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ہمیں کسی چیز یا شخص کو صرف اس کی ظاہری صورت سے پرکھنے کے بجائے اس کی حقیقت کو جانچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

زندگی میں ہمیں کئی بار ایسے مواقع ملتے ہیں جہاں بظاہر کچھ چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں، لیکن جب ہم گہرائی میں جا کر ان کی حقیقت کو سمجھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری توقعات کے برعکس ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی شخص کی باتیں یا اعمال بظاہر بہت نیک نیت اور مددگار معلوم ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے چھپے ہوئے ارادے اور مقاصد بالکل مختلف ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح، کاروبار یا سیاست میں بھی ہمیں ایسے مواقع ملتے ہیں جہاں بڑے بڑے وعدے اور ظاہری کامیابیاں دھوکہ دہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لوگ اکثر مادی

مفادات، مقام و مرتبہ، یا ظاہری دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ یہ سوچیں کہ ان چیزوں کی اصل قدر اور حقیقت کیا ہے۔ جو چیز چمکتی ہے، وہ ہمیشہ قیمتی نہیں ہوتی، اور یہی وہ نکتہ ہے جو اس محاورے کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے۔

یہ محاورہ ایک فطری حقیقت کو بیان کرتا ہے جسے ہم اپنے روزمرہ کے تجربات میں بار بار دیکھتے ہیں۔ زندگی میں ہمیں ایسی بہت سی چیزوں کا سامنا ہوتا ہے جو بظاہر بہت دلکش اور مفید لگتی ہیں، لیکن جب ان کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے تو وہ صرف دھوکہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمیں ہر حال میں غور و فکر اور دانشمندی سے کام لینا چاہیے اور صرف ظاہری چمک دمک کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے۔

یہی مفہوم قرآن و احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے جہاں دشمن کی دھوکہ دہی اور فریب کاری سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن پاک اور احادیث میں ہمیں بار بار اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ہمیں ظاہری چمک دمک اور خوبصورت بیانات پر نہ جائیں، بلکہ ہر چیز کو حکمت اور فہم کی روشنی میں پرکھیں۔

جیسا کہ تجربہ بتاتا ہے:

"دشمن کبھی بھی کھلے عام دھوکہ نہیں دیتا، بلکہ وہ اپنی چالوں کو خوبصورت اور پُرکشش بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہی وہ خطرہ ہے جو سب سے زیادہ گمراہ کن ہوتا ہے۔"

قرآن و احادیث کی روشنی میں فریب دہی اور دھوکہ بازی کو پہچاننے کے لیے جو اصول بیان کیے گئے ہیں، ان میں غور و فکر، علم، حکمت اور تحقیق کی ضرورت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ دشمن ہمیشہ مختلف حربوں کے ذریعے سچائی کو چھپانے یا اسے بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر ایسے حربوں کو بے نقاب کیا ہے اور ہمیں خبردار کیا ہے کہ دشمن کبھی بھی سیدھے راستے سے ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ وہ حق اور باطل کو ملا کر ایک ایسی صورت حال پیدا کرتا ہے جس سے لوگ دھوکہ کھا جائیں۔

سیاسی دھوکہ دہی میں دشمن کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انصاف اور حقوق کے نعروں کے ذریعے اپنی اصل نیت کو چھپاتا ہے۔ ایسے مواقع پر قرآن ہمیں خبردار کرتا ہے کہ ظاہری بیانات پر نہ جائیں بلکہ ان کے پیچھے چھپی ہوئی نیت کو جاننے کی کوشش کریں۔ سورہ البقرہ میں فرمایا گیا:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار !بے شک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن وہ شعور نہیں رکھتے۔(2:11-12) "

یہ آیات ہمیں بتاتی ہیں کہ اکثر وہ لوگ جو اصلاح اور انصاف کا دعویٰ کرتے ہیں، درحقیقت فساد اور خرابی پھیلانے کی نیت رکھتے ہیں۔ دشمن ہمیشہ اپنے تباہ کن مقاصد کو خوبصورت بیانات اور اصلاحی دعووں کے ذریعے چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اور اسی لیے قرآن ہمیں بار بار عقل اور شعور کا استعمال کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔

علمی اور فکری دھوکہ دہی میں دشمن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ علمی دلائل اور تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر باطل خیالات کو سچائی کے طور پر پیش کرے۔ اس قسم کے دھوکے سے بچنے کے لیے قرآن ہمیں تدبر، علم اور فہم کی دعوت دیتا ہے۔ علم اور حکمت کے بغیر حق اور باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اہل علم کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ علم کی روشنی میں انسان کو حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور وہ دشمن کی دھوکہ دہی کو پہچاننے کے قابل ہوتا ہے۔ سورہ الزمر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کہہ دو کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟"

(39:9)

یہاں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ علم ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان سچائی اور فریب کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔

مذہبی میدان میں دھوکہ دہی زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ مذہب کو عوام الناس کے دلوں میں گہری جگہ حاصل ہے۔ دشمن مذہبی اصطلاحات اور مقدس بیانیوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مذہب کے نام پر فریب دینے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ دشمن دین کے کچھ حصے کو لے کر اسے اپنی مرضی کے مطابق پیش کرتا ہے، اور وہ حصے چھوڑ دیتا ہے جو اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن ہمیں بار بار پورے دین پر عمل کرنے کی ہدایت دیتا ہے، جیسا کہ سورہ البقرہ میں ارشاد ہے:

"کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟(2:85) "

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دین کو ٹکڑوں میں بانٹ کر پیش کرنا، اس میں تحریف کرنا، یا اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا دراصل فریب دہی کی ایک شکل ہے۔ دشمن مذہب کے نام پر ایسے ہی حربے اپناتا ہے تاکہ لوگوں کو گمراہ کر سکے۔

اخلاقی اور معاشی دھوکہ دہی میں دشمن کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ مالی مفادات اور دنیاوی فوائد کے ذریعے لوگوں کو فریب دیتا ہے۔ قرآن ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ مالی معاملات میں دیانتداری، سچائی اور انصاف کو برقرار رکھنا ضروری ہے تاکہ دھوکہ دہی سے بچا جا سکے۔ معاشی دھوکہ دہی کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بہت واضح ہے، جہاں آپ نے فرمایا:

"جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں۔"

یہ حدیث اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ دھوکہ دہی، خاص طور پر مالی معاملات میں، ایک انتہائی سنگین جرم ہے اور اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ دشمن معاشی طور پر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، وعدے کرتا ہے جن کو وہ پورا نہیں کرتا، اور ایسی صورت حال پیدا کرتا ہے جس سے لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کے دھوکے سے بچنے کے لیے قرآن ہمیں عدل، انصاف اور دیانتداری کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک اور اہم پہلو جس کی طرف قرآن و حدیث ہمیں متوجہ کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ دشمن کبھی بھی کھلے عام دھوکہ نہیں دیتا، بلکہ وہ اپنی چالوں کو خوبصورت اور پُرکشش بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہی وہ خطرہ ہے جو سب سے زیادہ گمراہ کن ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار ہمیں فریب دہی کی ظاہری خوبصورتی سے بچنے کی ہدایت دی گئی ہے، جیسا کہ سورہ النساء میں ارشاد ہے:

"شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔(4:38) "

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ شیطان، جو کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے، ہمیشہ خوف، فریب اور بے حیائی کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کا وعدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو صبر اور تقویٰ کے ساتھ سچائی کا دامن تھامے رہتے ہیں۔

دشمن کی دھوکہ دہی کو پہچاننے کے لیے قرآن و حدیث میں جو اہم اصول دیے گئے ہیں، ان میں غور و فکر، علم، تحقیق، دیانتداری، اور عدل و انصاف پر قائم رہنا شامل ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کر کے ہی انسان دشمن کے مکر و فریب سے بچ سکتا ہے۔ دشمن کی سب سے بڑی چال یہی ہوتی ہے کہ وہ حق اور باطل کو ملا کر ایک ایسی صورت حال پیدا کرے جو بظاہر حق معلوم ہو، لیکن دراصل باطل

پر مبنی ہو۔ اس سے بچنے کے لیے ہمیں قرآن کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو اپنے زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کرنا ہو گا۔

اسلامی تعلیمات کی حقانیت پرکھنے کے معروضی معیارات

اگر ہم اسلامی نقطہ نظر کی عقلی بنیادوں پر توثیق کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں معروضی سچائی اور جھوٹ، حق اور باطل کو عقل کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اس تناظر میں، کچھ اہم فلسفیانہ اور عقلی اصولوں کی تفصیل پیش کی جائے گی جو ہمیں حق و باطل کی معروضیت کی پہچان میں مدد دیتے ہیں، اور یہ اصول کس طرح اسلامی نقطہ نظر کی توثیق کرتے ہیں۔

سب سے پہلے، منطق اور تضاد کا اصول ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ عقل کا یہ اصول بیان کرتا ہے کہ دو متضاد باتیں ایک ساتھ سچ نہیں ہو سکتیں۔ یعنی اگر ایک بات سچ ہے تو اس کا الٹ جھوٹ ہوگا۔ یہ اصول ہر حقیقت پر لاگو ہوتا ہے، چاہے وہ مادی ہو یا غیر مادی۔ اگر ہم حق کو سچائی کے طور پر دیکھیں تو اس کا متضاد باطل ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی اور جھوٹ کا یہ فرق منطقی اصول کے تحت معروضی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر ہم کہتے ہیں کہ " اللہ ایک ہے"، تو اس کا متضاد یہ ہوگا کہ " اللہ ایک نہیں ہے"، اور دونوں باتیں ایک ساتھ درست نہیں ہو سکتیں۔ اسلامی تعلیمات میں بھی حق اور باطل کے درمیان ایک واضح فرق موجود ہے، جو اسی منطقی اصول کی بنیاد پر سمجھا

جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت کی گئی ہے، اور عقل کے اس اصول کے تحت ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حق اور باطل ایک ساتھ سچ نہیں ہو سکتے۔

حقیقت کا معروضی وجود بھی ایک اہم اصول ہے، جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حقیقت ایک بیرونی حقیقت ہے جو انسانی فہم سے آزاد ہے۔ چاہے ہم کسی چیز کو مانیں یا نہ مانیں، وہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ مثال کے طور پر، زمین کا گول ہونا ایک معروضی حقیقت ہے، چاہے کچھ لوگ اسے تسلیم نہ کریں۔ حق کو اس معروضی حقیقت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو ہماری رائے یا تصورات سے بالاتر ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حق کی پہچان ممکن ہے اور یہ ہمیشہ ثابت شدہ حقیقت پر مبنی ہوگی۔ اسلامی نقطہ نظر میں بھی حق کا تصور اسی معروضی حقیقت پر مبنی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات ایک معین نظام اور حکمت کے تحت بنی ہے، اور یہ نظام اللہ کی حکمت کی عکاسی کرتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حق کی معروضی حقیقت اسلامی تعلیمات میں موجود ہے۔

عقلی اصول کی عمومی صداقت کا تصور بھی اہم ہے، کیونکہ کچھ اصول عالمی اور عمومی ہیں، جیسے انصاف اور سچائی۔ یہ اصول مختلف تہذیبوں اور معاشروں میں یکساں طور پر سمجھے جاتے ہیں، اور انصاف ہر معاشرے میں ایک اعلیٰ قدر کے طور پر مانا جاتا ہے۔ ان عالمی عقلی اصولوں کی بنیاد پر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں

کہ حق و باطل کے درمیان فرق معروضی اور عالمی ہے۔ اگر کوئی عمل ظلم پر مبنی ہے تو وہ ہر معاشرے میں برا تصور کیا جائے گا، اور اسی طرح حق کا معروضی معیار وہ اصول ہیں جو عقل سے واضح ہوتے ہیں۔

اخلاقیات کا معروضی معیار بھی ایک اہم پہلو ہے، جو بیان کرتا ہے کہ کچھ اعمال درست یا غلط ہوتے ہیں، چاہے کوئی انہیں مانے یا نہ مانے۔ مثال کے طور پر، بے قصور کا قتل ہر حالت میں غلط ہو گا۔ اس اصول کے تحت، ہم اخلاقیات کے ایک معروضی معیار کو تسلیم کرتے ہیں جو سچائی اور جھوٹ، حق اور باطل کا فیصلہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی اخلاقیات کے اصول معروضی ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام، عدل و ظلم، اور خیر و شر کے درمیان فرق واضح کیا ہے۔

فطرت اور عقل کی گواہی بھی اس تناظر میں اہم ہے۔ انسانی فطرت اور عقل ہمیں سچائی کی طرف لے جاتی ہے، کیونکہ انسانی فطرت سچائی اور انصاف کو پسند کرتی ہے اور ظلم سے دور بھاگتی ہے۔ یہ فطری رجحان معروضی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ حق و باطل کا فرق فطری اور عقلی سطح پر موجود ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت کے مطالعے کی دعوت دی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ فطرت حق کی گواہی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر، عقلی نقطہ نظر سے معروضی سچائی، حق اور باطل کا فرق واضح کیا جا سکتا ہے۔ عقل کے اصول، معروضی حقیقت، اور فطرت کی گواہی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حق ایک معروضی حقیقت ہے، جو اللہ کی تخلیق اور اس کے قوانین میں پوشیدہ ہے۔ ان عقلی دلائل کی روشنی میں، اسلامی نکتہ نظر کی توثیق ہوتی ہے، کہ حق و باطل کا فرق نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ عقلی طور پر بھی ثابت شدہ ہے۔ یہ تصورات ہمیں اسلام کی سچائی کو سمجھنے اور تسلیم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر کی عقلی بنیادوں پر توثیق کرنے کی کوششوں میں، ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ حق و باطل کی شناخت میں علم، فلسفہ، اور مذہبی سمجھ بوجھ کا ایک جامع تعلق ہے۔ یہ حقیقت کہ انسانی عقل اور فطرت حق کی پہچان میں اہم کردار ادا کرتی ہے، ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حق کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے ہمیں محض مذہبی نصوص تک محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ عقل کے اصولوں اور انسانی تجربات کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔

کائنات کی ترتیب اور نظم کو دیکھتے ہوئے، ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک معین نظام کے تحت چل رہی ہے۔ یہ نظام صرف فزیکل یا مادی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں اخلاقیات، اقدار، اور انسان کے تعلقات کا ایک وسیع دائرہ بھی شامل ہے۔ جب ہم کائناتی نظم کی بات کرتے ہیں تو یہ سوال بھی

اٹھتا ہے کہ اس نظم کے پیچھے کون سی حکمت ہے اور یہ ہمیں کہاں لے جا رہی ہے۔ یہ سوالات انسانی عقل کے لیے چیلنج ہیں، لیکن یہ اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے عقلی دائرے کو مذہبی نقطہ نظر کے ساتھ جوڑیں۔

اسلامی تعلیمات میں اللہ کی صفات، جیسے علم، حکمت، اور رحمت، ہمیں یہ سمجھاتی ہیں کہ حق ہمیشہ اس کی تخلیق اور حکمت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ہمیں ایک اخلاقی فریم ورک فراہم کرتا ہے جس میں ہم اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس فریم ورک کے تحت، انسان کو خود کو ایک زیادہ حقیقت پسند اور انصاف پسند معاشرتی وجود کے طور پر پیش کرنا ہوگا۔ یہ امر انسان کو اپنی اخلاقیات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ کیا ہم ان اصولوں کی پاسداری کر رہے ہیں جو حق اور باطل کی تمیز کرنے میں مددگار ہیں۔

دوسری جانب، انسانی تجربات بھی اہم ہیں۔ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں، جہاں بھی انسانی فطرت کو سچائی اور انصاف کے راستے پر چلایا گیا، وہاں امن، ترقی، اور خوشحالی کی فضا قائم ہوئی۔ اس کے برعکس، جہاں ظلم و ستم، جھوٹ، اور دھوکہ دہی کو رواج ملا، وہاں انسانی معاشرتوں میں عدم استحکام اور بربادی دیکھی گئی۔ یہ انسانی تجربات ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ اخلاقی اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہمیشہ مثبت ہی ہوتا ہے، اور اس کے برعکس، باطل کی پیروی انسانیت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

انسانی عقل کے مطابق، ہمیں یہ بات سمجھنی ہوگی کہ کچھ حقیقتیں ہمیشہ درست رہتی ہیں۔ یہ حقیقتیں انفرادی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہیں، چاہے وہ کسی بھی ثقافت یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ انسانی فطرت میں ایک فطری جھکاؤ سچائی کی طرف ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ سچائی کا راستہ ہمیشہ انسان کے لیے موزوں رہتا ہے۔ جب ہم اپنی زندگیوں میں ان اصولوں کو اپناتے ہیں تو ہم ایک ایسی بنیاد فراہم کرتے ہیں جو ہمیں نہ صرف عقلی طور پر بلکہ روحانی طور پر بھی مضبوط بناتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی اس بات کی توثیق کی گئی ہے کہ اللہ کی طرف سے دی گئی رہنمائی ہمیشہ انسان کی فطرت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو فطرت کے راستے پر چلنے کی ہدایت دی ہے اور یہ کہ سچائی کے اصول ہمیشہ انسانی تجربات کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر نہ صرف عقلی طور پر درست ہے بلکہ اس کی بنیاد بھی انسانی فطرت اور تجربات پر ہے۔

لہذا، جب ہم اسلامی نقطہ نظر کی توثیق کرتے ہیں تو ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ یہ صرف مذہبی تعلیمات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عقل، تجربات، اور انسانی فطرت کی روشنی میں واضح ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں، ہم ایک ایسی دنیا میں رہ سکتے ہیں جہاں حق و باطل کی شناخت نہ صرف ایک نظریاتی

معاملہ ہے، بلکہ یہ ایک عملی حقیقت ہے جو ہمیں بہتر انسان بننے میں مدد دیتی ہے۔ یہ تصور ہمیں اس بات کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک مثبت معاشرتی تبدیلی کی ضرورت ہے، تاکہ ہم حق کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال سکیں اور اپنے ارد گرد کی دنیا کو بہتر بنا سکیں۔

حق و باطل مذاہب و فلسفی مکاتب کو پرکھنے کے معروضی معیارات

سچے اور جھوٹے، حق و باطل مذاہب اور فلسفی مکاتب کو پرکھنے کے لیے معروضی معیارات کی تشکیل ایک پیچیدہ عمل ہے، لیکن یہ عمل اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ انسان کسی بھی فکری اور عقلی راستے پر چلتے وقت واضح اصولوں کی روشنی میں فیصلہ کر سکے۔ یہ معیارات مندرجہ ذیل اہم پہلوؤں پر مشتمل ہیں:

پہلا معیار" معقولیت "ہے۔ ہر نظریے یا فلسفے کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیے۔ یہ جانچنے کے لیے کہ آیا ایک عقیدہ صحیح ہے یا نہیں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ نظریہ عقل کے عمومی اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔ مثلاً، اگر کوئی مذہب یا فلسفہ ایسے دعوے کرتا ہے جو منطقی تضاد رکھتے ہیں، تو اسے پرکھنے کے لیے یہ ایک قوی دلیل ہے کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

دوسرا معیار" معروضیت "ہے۔ ایک سچائی کی حیثیت سے، ہمیں ایسی معلومات حاصل کرنی ہوں گی جو صرف ذاتی تجربات یا ثقافتی پس منظر پر نہیں بلکہ عالمی سچائیوں پر مبنی ہوں۔ مختلف مذاہب اور فلسفوں کے دعووں کو اس نظر سے

پرکھا جانا چاہیے کہ آیا وہ مختلف تہذیبوں اور زمانوں میں کس طرح قبول کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی نظریہ تاریخی، ثقافتی، اور سائنسی حقیقتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے تو وہ زیادہ مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

تیسرا معیار" اخلاقی اصولوں "کا جائزہ لینا ہے۔ ایک مذہب یا فلسفہ کو اس کی اخلاقیات کی روشنی میں پرکھا جانا چاہیے۔ کیا وہ نظریہ انسانیت کے بہترین اصولوں کی ترویج کرتا ہے، جیسے انصاف، سچائی، اور انسانی حقوق؟ اگر ایک نظریہ انسانیت کی بھلائی کے مقابلے میں ظلم، استحصال، یا جھوٹ کی حمایت کرتا ہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ حق نہیں ہو سکتا۔

چوتھا معیار" انسانی فطرت "سے ہم آہنگی ہے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا ایک مذہب یا فلسفہ انسانی فطرت کی بنیادی ضروریات اور خواہشات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ انسان کی فطرت میں سچائی کی تلاش، انصاف کی جستجو، اور امن کی خواہش شامل ہے۔ اگر کوئی نظریہ ان فطری میلانات کے خلاف ہے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا وہ واقعی انسانی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے یا نہیں۔

پانچواں معیار" تاریخی تجربات "کا جائزہ لینا ہے۔ مختلف مذاہب اور فلسفوں کے اثرات کا تجزیہ کیا جانا چاہیے کہ وہ تاریخی طور پر کس طرح معاشروں پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ کیا وہ ترقی، خوشحالی، اور امن کی طرف لے گئے، یا جنگ، ظلم،

اور عدم استحکام کی طرف؟ یہ تاریخی تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ کون سے نظریات زیادہ کامیاب اور مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔

چھٹا معیار" روحانی تجربات "کا جائزہ لینا ہے۔ انسانیت نے مختلف مذاہب میں روحانی تجربات کی کئی شکلیں دیکھیں ہیں۔ ان تجربات کی سچائی اور ان کی اثر پذیری کا تجزیہ کرنے سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ آیا کوئی مذہب روحانی ترقی اور اندرونی سکون فراہم کرتا ہے یا نہیں۔

ان معروضی معیارات کی مدد سے، انسان ایک ایسا علم کا مرکز حاصل کر سکتا ہے جس کی بنیاد عقل، اخلاقیات، اور انسانی فطرت پر ہو۔ یہ علم انسان کو اپنے مستقبل کی سمت متعین کرنے میں مدد دے گا، اور وہ بغیر کسی دوسری طرف رجوع کرنے کی ضرورت کے اپنے فیصلے خود کر سکے گا۔ اس طرح، وہ ایک مثبت اور معقول زندگی کی جانب بڑھنے میں کامیاب ہو گا، جو کہ سچے علم اور حق کے اصولوں پر قائم ہو۔ یہ علم، جو مختلف مذاہب اور فلسفوں کے درمیان واضح تفریق کی بنیاد فراہم کرتا ہے، انسان کو ایک مؤثر اور باخبر فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے، جس سے وہ اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بہتری لا سکتا ہے۔

سچے اور جھوٹے، حق و باطل مذاہب اور فلسفی مکاتب کے معروضی معیارات کی بحث کو مزید گہرائی میں لے جانے کے لیے، یہ ضروری ہے کہ ہم ان اصولوں کی تفصیل اور ان کے اطلاق کی عملی صورتوں پر توجہ دیں۔ ہر فرد کی زندگی میں فلسفیانہ اور مذہبی نظریات کی اہمیت ناقابل انکار ہے، اور ان کی درستگی یا غلطی کا تعین انسان کے وجود کی بنیادوں کو متاثر کر سکتا ہے۔

انسانی تاریخ میں مختلف نظریات اور مذاہب نے انسانیت کے ترقی کے سفر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ نے لوگوں کو روحانی سکون، معاشرتی عدل، اور اخلاقی رہنمائی فراہم کی، جبکہ دیگر نے محض استحصال، تفریق، اور تناؤ کی فضا قائم کی۔ اس کے پیش نظر، یہ بات واضح ہے کہ صرف ایسے نظریات کو ہی قبول کرنا چاہیے جو انسان کی فطری خواہشات کے مطابق ہوں، جیسے علم کی جستجو، حقیقت کی تلاش، اور انصاف کا قیام۔

اسی تناظر میں، ان نظریات کی تاریخی حیثیت کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ کئی مذاہب کی تاریخ میں ایسے موڑ آئے ہیں جب انہوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے خدمات فراہم کیں، لیکن پھر بھی ان کے کچھ پہلو وقت کے ساتھ ساتھ متنازعہ بن گئے۔ اس لحاظ سے، انسان کو اپنی سوچ کو کھلا رکھنا چاہیے اور ہر نظریے کے ماضی کی جھلک کو مدنظر رکھنا چاہیے تاکہ وہ ایک جامع اور معقول رائے قائم کر سکے۔

مزید یہ کہ، انسان کے ذہنی اور روحانی تجربات بھی اس بات کی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ کس طرح سچائی کے قریب پہنچتا ہے۔ بعض اوقات، تجربات ہماری عقل سے بالاتر ہو کر، قلبی اور روحانی جہتوں کی گہرائی میں ہوتے ہیں۔ ایسے تجربات کی روشنی میں، انسان کو سچائی کی تلاش میں مزید رہنمائی مل سکتی ہے۔ کئی لوگ روحانی تجربات کے ذریعے ایسی گہرائی میں پہنچتے ہیں جو کہ محض عقل کے ذریعے سمجھنے سے باہر ہوتی ہے۔ ان تجربات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کیسے انفرادی اور اجتماعی سطح پر معاشرتی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ مختلف نظریات کی روشنی میں، انسانوں کے درمیان مکالمے کی ضرورت ہے۔ یہ مکالمہ مختلف خیالات، ثقافتوں، اور مذاہب کے مابین سمجھ بوجھ کو فروغ دیتا ہے۔ اس کی بدولت لوگ ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کرتے ہیں اور سچائی کی مشترکہ تلاش کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس عمل سے، انسانی معاشرے میں ایک مثبت اور تعمیری ماحول پیدا ہوتا ہے، جو کہ علم، رواداری، اور باہمی احترام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

کسی بھی مذہب یا فلسفے کی سچائی کو جانچنے کے لیے مزید ایک اہم پہلو اس کی اثر پذیری ہے۔ یہ جانچنا ضروری ہے کہ آیا اس نظریے نے زندگی کے مختلف شعبوں جیسے تعلیم، سیاست، اور معیشت پر کیسے اثر ڈالا ہے۔ ایسے نظریات جو

انسانوں کے درمیان اتحاد، تعاون، اور ترقی کی راہ ہموار کرتے ہیں، یقیناً حق کے قریب ہیں۔

آخر میں، معروضی معیارات کی بنیاد پر سچے اور جھوٹے مذاہب کی پہچان کے عمل میں ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ انسان خود کو ایک مستقل علم کی تلاش میں مصروف رکھے۔ اس علم کی جستجو کی راہ میں، اسے اپنی پیشگوئیوں اور قیاسات کے بجائے حقیقت پر مبنی معلومات کا سہارا لینا چاہیے۔ یوں، وہ ایک ایسے علمی اور اخلاقی معیار پر پہنچ سکتا ہے جو اسے ایک مطمئن، متوازن، اور کامیاب زندگی گزارنے کی طرف لے جائے۔ یہ علم اس کی زندگی کی راہوں میں نور کی مانند ہوگا، جو اسے ہر موڑ پر راہنمائی فراہم کرے گا، اور وہ اپنے وجود کے مقصد کو سمجھنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اس طرح، وہ سچائی کی تلاش میں ایک مضبوط بنیاد رکھے گا، جس کی بنا پر وہ کسی بھی فکری یا عقلی اختلافات کے باوجود اپنے آپ کو ایک کامیاب اور مطمئن فرد کی حیثیت سے پیش کر سکے گا۔

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنا

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنا ایک اہم تصور ہے جو مختلف خیالات اور آراء کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی احترام اور رواداری کے ساتھ زندگی گزارنے کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ عمل خاص طور پر ایک متنوع اور مختلف الثقافتی معاشرے میں نہایت اہمیت رکھتا ہے، جہاں افراد کے پس منظر، تجربات اور خیالات میں فرق ہوتا ہے۔ اختلافات کو برداشت کرنے اور دوسروں کی رائے کو سمجھنے سے سماجی ہم آہنگی اور مثبت تعلقات کی تعمیر ممکن ہوتی ہے۔

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ رہنے کے لیے سب سے اہم پہلو باہمی احترام کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلافات کے باوجود ہمیں دوسروں کی رائے اور خیالات کا احترام کرنا چاہیے اور یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہماری رائے ہی واحد درست ہے۔ دوسروں کے نقطہ نظر کو تسلیم کرنا اس بات کا ضامن ہے کہ ہم باہمی احترام کی فضا قائم رکھیں گے۔ اختلاف کرتے وقت نرم لہجہ اپنانا اور دوسروں کی بات کو بغض اور تعصب کے بغیر سننا بھی ضروری ہے تاکہ ہمارے درمیان تفہیم کا ماحول قائم ہو۔

دوسرا اہم طریقہ کھلے ذہن کے ساتھ دوسروں کی باتوں کو سننا ہے۔ جب ہم دوسرے افراد کی باتوں کو بغیر کسی تعصب کے سنتے ہیں، تو یہ ان کی رائے کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کا ذریعہ

بنتا ہے۔ ہر شخص کے خیالات اس کے اپنے تجربات اور پس منظر سے جڑے ہوتے ہیں، اور ان کا نقطہ نظر ہمارے سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ان کی باتوں کو توجہ سے سنیں تاکہ ان کو قبولیت کا احساس ہو۔

اختلافات کو تعمیری انداز میں حل کرنا بھی ایک اہم طریقہ ہے۔ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو ہمیں تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے۔ غصے یا جذباتیت سے بچتے ہوئے ہمیں دلیل اور منطقی بات چیت سے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ اس طرح کے طریقے اختلافات کو ایک مثبت سمت میں لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔

تعصب سے بچنا بھی ضروری ہے۔ دوسروں کی رائے کے بارے میں پہلے سے رائے قائم کرنے سے بچنا چاہیے اور کھلے ذہن سے ان کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر شخص کا پس منظر اور تجربہ مختلف ہوتا ہے، اس لیے ان کے خیالات بھی ہم سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی سوچ کو بہتر بنانے کے لیے مختلف زاویوں سے بھی دیکھنا چاہیے۔

نکتہ نظر کے اختلافات میں آدابِ گفتگو کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس سے دونوں افراد کے درمیان احترام اور تعلق برقرار رہتا ہے۔ گفتگو میں شائستگی اور صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اور کبھی بھی دوسرے کی ذاتی حیثیت پر تنقید نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیشہ موضوع تک محدود رہنا چاہیے۔

مشترکہ مفادات پر توجہ دینا بھی ایک کامیاب طریقہ ہے۔ اگرچہ نکتہ نظر میں اختلافات ہو سکتے ہیں، مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے اور دوسرے شخص کے درمیان کئی مشترکہ پہلو بھی ہوسکتے ہیں۔ مشترکہ اہداف اور دلچسپیوں پر توجہ مرکوز کرنا، اختلافات کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ رہنے کی اہمیت کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے، یہ سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے میں مددگار ہے۔ جب افراد اختلافات کو تسلیم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کا احترام کرتے ہیں، تو معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور مختلف طبقوں کے درمیان بہتر تعلقات کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ، دوسروں کے مختلف خیالات کو سمجھنے سے ہم اپنی معلومات اور فہم میں اضافہ کرتے ہیں اور دنیا کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کی وجہ سے ہم مسائل کے نئے اور مؤثر حل تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں، کیونکہ جب مختلف خیالات اور تجربات کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو بہتر اور جامع حل نکل سکتے ہیں۔

اختلافات کے باوجود مل جل کر رہنے سے ذاتی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی ہے۔ صبر، رواداری، اور برداشت جیسی خصوصیات کو فروغ دینا ہماری اخلاقی ترقی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ، نکتہ نظر کے اختلافات کے باوجود ایک مثبت اور پرامن ماحول قائم ہوتا ہے، جہاں لوگ آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ سکون سے رہ سکتے ہیں۔ یہ معاشرتی ترقی اور خوشحالی کا باعث بنتا ہے۔

اس طرح، نکتہ نظر کے اختلاف کے ساتھ مل جل کر رہنا ہمیں رواداری، احترام اور دوسروں کے خیالات کو تسلیم کرنے کی اہمیت سکھاتا ہے۔ یہ سماجی ہم آہنگی، مسائل کے بہتر حل اور ایک پر امن ماحول کے لیے ضروری ہے، اور ہمیں اس طریقہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہیے۔

اصول و فروع دین اور انسان کا فردی اور سماجی ارتقاء

اصول دین اور فروع دین اسلامی تعلیمات کے دو بنیادی ستون ہیں جو انسان کی فردی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اصول دین ایمان و اعتقاد کے اصول ہیں، جو انسان کو اللہ سے مضبوط تعلق قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں، جبکہ فروع دین وہ عملی احکامات ہیں جو زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں کو نکھارتے ہیں۔ ان دونوں کے مجموعے سے ایک فرد کی زندگی میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور وہ معاشرتی ترقی کا باعث بنتی ہے۔

۱۔ اصول دین کی فردی زندگی میں اہمیت

اصول دین کی بنیاد پر ایک مسلمان کا عقیدہ اور اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، جس سے اس کی روحانی تربیت ہوتی ہے اور وہ اپنی زندگی کو مقصدیت اور معنویت کے ساتھ گزارتا ہے۔ اصول دین میں تین بنیادی اصول شامل ہیں:

- توحید (اللہ کی وحدانیت): توحید کا عقیدہ انسان میں خدا کا شعور اور اس کی ذات پر مکمل بھروسہ پیدا کرتا ہے۔ یہ یقین کہ اللہ واحد ہے، انسان کو خوف اور ناامیدی سے نکالتا ہے اور اسے ایک پرامن اور متوازن زندگی گزارنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ توحید کی تعلیم سے

انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ زندگی کے چیلنجز کا سامنا بہترین انداز میں کر سکتا ہے۔

- عدل (انصاف): عدل کا عقیدہ انسان کو انصاف اور مساوات کا درس دیتا ہے۔ یہ انسان کی ذات میں حق اور انصاف کے اصول پیدا کرتا ہے اور اسے دوسروں کے حقوق کی قدر کرنے اور ظلم سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ عدل کا شعور فردی اور معاشرتی سطح پر انصاف کی بنیاد ڈالتا ہے، جس سے ہر فرد کی زندگی محفوظ اور خوشحال ہوتی ہے۔

- نبوت (رسولوں کا پیغام): نبوت کا عقیدہ انسان کو ایک مثالی کردار کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ انبیاء کرام (ع) کی زندگیوں کو دیکھ کر ایک فرد اپنی زندگی کو سنوارنے کے قابل ہوتا ہے اور انبیاء کی سنت پر عمل کر کے خود میں بہترین اخلاق اور عمدہ کردار پیدا کر سکتا ہے۔

- امامت (رہنمائی): امامت کا عقیدہ فرد کو رہنمائی فراہم کرتا ہے اور اسے معاشرتی اور دینی راہنماؤں کے ساتھ جوڑتا ہے۔ امام معصوم (ع) کی تعلیمات کی پیروی سے انسان اخلاقیات میں بہتر ہوتا ہے اور ایک مثبت معاشرتی کردار ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

- معاد (آخرت): آخرت کا عقیدہ انسان کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اس کے اعمال کا حساب ہوگا۔ اس سے انسان اپنی زندگی میں خود احتسابی پیدا کرتا ہے اور اپنے اعمال میں خیر و بھلائی کے اصول اپناتا ہے، جس سے اس کی شخصیت مزید نکھرتی ہے۔

2۔ فروع دین کی فردی زندگی میں اہمیت

فروع دین عملی احکام پر مشتمل ہیں جو فرد کی زندگی میں نظم وضبط، عبادات اور اخلاقیات کے ذریعے ترقی پیدا کرتے ہیں۔ فروع دین کے دس اہم احکام ہیں:

- نماز: نماز انسان کے دل کو اللہ سے جوڑتی ہے اور اس کی زندگی میں روحانی قوت پیدا کرتی ہے۔ روزانہ نماز پڑھنے سے انسان میں عزم و استقامت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی ذات پر کنٹرول حاصل کرتا ہے۔

- روزہ: روزہ نفس کی پاکیزگی اور تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ بھوک اور پیاس برداشت کرنے سے انسان اپنے نفس پر قابو پانا سیکھتا ہے اور صبر کا عادی ہوتا ہے۔

-حج: حج روحانی تطہیر، صبر، اور اللہ کی رضا کی جانب انسان کو راغب کرتا ہے، اور اسے ایک نئی زندگی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

- خمس وزکات: ان مالی عبادات سے انسان کو سخاوت اور قربانی کا جذبہ حاصل ہوتا ہے، جس سے وہ اپنی دولت کا ایک حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کے لیے دیتا ہے۔ یہ عبادات فرد کی شخصیت میں ہمدردی اور غم خواری کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔

- جہاد: جہاد کا مقصد اللہ کی راہ میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، علمی وغیرہ کی جدوجہد ہے، جو انسان کو زندگی کے ان مختلف پہلوؤں میں بہترین بننے کی تحریک دیتا ہے۔ یہ جہاد جہاں

علمی، اخلاقی، اور سماجی میدان میں اہم ہو سکتا ہے تو دوسری طرف سب سے اہم نفسانی خواہشات سے مسلسل جہاد کرنے کا سبق دیتا ہے۔

- امر بالمعروف و نہی عن المنکر: ان احکام سے انسان کو اچھائی کے پھیلانے اور برائی سے روکنے کا فرض دیا گیا ہے۔ یہ اصول فرد کو معاشرت میں مثبت کردار ادا کرنے اور اصلاح کا حصہ بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

- تولی اور تبری: ان احکام کے ذریعے فرد کو اچھے لوگوں کے ساتھ وابستگی اور برے لوگوں سے دور رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ انسان میں بہتر تعلقات قائم کرنے اور غلط اثرات سے بچنے کا شعور پیدا کرتے ہیں۔

3۔ اصول و فروع دین کی اجتماعی زندگی میں اہمیت

اصول اور فروع دین فردی تربیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سے ایک متوازن، اخلاقی، اور پر امن معاشرتی ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔

- عدل اور انصاف پر مبنی معاشرہ: عدل اور انصاف کا تصور ایک اجتماعی نظام میں مساوات اور انسان دوستی کا باعث بنتا ہے۔ جب ہر شخص انصاف پر عمل کرے گا تو پورا معاشرہ امن اور خوشحالی سے ہمکنار ہو گا۔

- اخوت اور بھائی چارہ: اصول دین انسانوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دیتے ہیں۔ توحید اور نبوت پر ایمان سے انسان کو احساس ہوتا ہے کہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں، جس سے معاشرت میں اتحاد اور بھائی چارہ پیدا ہوتا ہے۔

- معاشرتی انصاف: خمس اور زکات جیسے احکام کے ذریعے دولت کی مساوی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ معاشرتی انصاف کی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جہاں کوئی فرد بھوک اور فقر کا شکار نہ ہو۔

- اخلاقی اصول اور احترام: امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے افراد ایک دوسرے کی اصلاح اور اچھے اعمال میں مددگار ہوتے ہیں۔ یہ معاشرتی ذمہ داری کا شعور پیدا کرتا ہے اور ہر شخص کو دوسروں کے احترام کا عادی بناتا ہے۔

- امن اور روحانی سکون: نماز اور روزے جیسے فروع دین انسان کو روحانی سکون اور معاشرت میں اطمینان فراہم کرتے ہیں۔ جب ہر شخص نماز اور روزہ جیسے اعمال پر کاربند ہو گا، تو پورا معاشرہ روحانی اعتبار سے مستحکم ہو گا۔

- تعلیم اور فکری آزادی: جہاد کا مقصد نہ صرف جسمانی بلکہ علمی میدان میں بھی ترقی کرنا ہے۔ علم کے فروغ سے معاشرت میں فکری آزادی، روشن خیالی، اور ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

4۔ اصول دین سے انسان کی روحانی قوت میں اضافہ

اصول دین میں توحید اور معاد جیسے اصول انسان کو ایک مضبوط روحانی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یہ اصول اللہ کے ساتھ ایک گہرے تعلق کو فروغ دیتے ہیں اور انسان کو زندگی کے ہر پہلو میں اس کی مدد حاصل کرنے کی امید دیتے ہیں۔ اللہ پر ایمان اور آخرت کے بارے میں یقین انسان کو خود احتسابی کی طاقت دیتا ہے جس سے وہ برائیوں سے بچ کر نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے۔

- معاشرت میں خوش اخلاقی: اصول دین انسان کو باوقار بناتے ہیں اور اس کے رویے میں نرمی، برداشت، اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، عدل کا اصول لوگوں کے ساتھ منصفانہ رویہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جبکہ نبوت کے ذریعے ہمیں انبیاء کرام کی شخصیت کو اپنانے کا درس ملتا ہے۔

5۔ فروع دین سے فرد کی جسمانی اور ذہنی ترقی

فروع دین انسان کی عملی زندگی کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان احکام کے ذریعے انسان کے جسمانی، ذہنی، اور روحانی پہلوؤں کو بہتر بنایا جاتا ہے۔

- نماز اور روحانی تسکین: نماز ایک منظم عمل ہے جس سے انسان کو ذہنی سکون، روحانی تسکین اور جسمانی مشق ملتی ہے۔ یہ عمل انسان کے دل کو اللہ کی یاد سے جوڑتا ہے اور اسے مختلف مشکلات میں مضبوط بناتا ہے۔

- روزہ اور ضبط نفس: روزہ انسان کے اندر برداشت اور صبر کی خصوصیات پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو انسان کو جسمانی اور روحانی طور پر پاکیزہ بناتی ہے اور اسے تقویٰ اختیار کرنے میں مدد دیتی ہے۔

6۔ اصول دین اور فروع دین کے ذریعے معاشرتی ہم آہنگی

اصول اور فروع دین اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی اور اتحاد کو فروغ دیتے ہیں۔ جب لوگ ان تعلیمات پر عمل کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے حقوق کا احترام اور خیر خواہی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

- اجتماعی ذمہ داری کا شعور: فروع دین میں جیسے کہ زکات اور خمس کا نظام ایک اسلامی معاشرے میں مالی توازن اور معاشرتی انصاف کو یقینی بناتا ہے۔ یہ احکام انسان کو دوسروں کی فلاح و بہبود کا احساس دلاتے ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

- اصلاحِ معاشرت: امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول سے افراد کو نہ صرف اپنی زندگی میں بھلائی کو اپنانے کا درس ملتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اچھائی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس سے ایک صحت مند اور تعمیری معاشرت قائم ہوتی ہے۔

7۔ فکری ترقی اور علم کا فروغ

جہاد کا تصور فرد کو نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی و فکری جہاد پر بھی ابھارتا ہے۔ علم حاصل کرنا، تعلیمات اسلامی پر غور و فکر کرنا اور سماجی مسائل کے حل کے لیے عملی اقدامات کرنا بھی جہاد میں شامل ہیں۔

- علمی جہاد اور فکری شعور: اسلامی تعلیمات میں علم کی اہمیت کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ نے بار بار علم حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ علم کا فروغ معاشرت میں روشن خیالی، سچائی اور عمیق فکری شعور کو پروان چڑھاتا ہے۔

- اصلاحِ ذات اور خود احتسابی: اصول دین جیسے معاد کا تصور انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس کے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہے۔ یہ تصور انسان کو خود احتسابی اور اصلاحِ ذات کی طرف لے کر جاتا ہے، جو اس کی شخصیت کو سنوارنے اور اسے بہتر انسان بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

8۔ توازن اور اعتدال کی تعلیم

اصول و فروع دین دونوں اعتدال اور توازن کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہ انسان کو افراط و تفریط سے بچنے اور زندگی میں ایک متوازن رویہ اپنانے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

- اخلاقی اعتدال: اسلام میں انسان کو ہر چیز میں اعتدال کی تعلیم دی گئی ہے۔ فروع دین میں نماز، روزہ اور دیگر عبادات میں ایک متوازن نظام قائم ہے، جو انسان کی روحانی اور

جسمانی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اسی طرح اصول دین میں اللہ اور انسانوں کے حقوق میں توازن پیدا کیا گیا ہے۔

- سماجی اعتدال: زکات، خمس، اور سخاوت کے احکام انسان کو مال میں اعتدال کے ساتھ زندگی گزارنے کا درس دیتے ہیں۔ یہ چیز معاشرت میں عدم مساوات کو کم کرتی ہے اور ہر شخص کو اس کے حق کے ساتھ جینے کا حق فراہم کرتی ہے۔

9۔ اتحاد اور بھائی چارے کا فروغ

اصول دین، جیسے کہ توحید اور نبوت، انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد اور محبت کے رشتے میں جوڑتے ہیں۔ توحید سے انسان اللہ کی وحدانیت کا قائل ہوتا ہے اور سب کو برابر سمجھتا ہے، جبکہ نبوت ہمیں انبیاء کرام (ع) کے اخلاق اور ان کی سیرت کو اپنانے کی دعوت دیتی ہے۔

- اجتماعی شناخت: اصول دین انسان کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ ایک عظیم امت کا حصہ ہے۔ اس شناخت سے وہ اپنی زندگی کو بہتر بناتا ہے اور اس کے دل میں اپنی ملت کے لیے محبت اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

10۔ اخلاقی و معاشرتی عدل

عدل کا اصول انسان کو نہ صرف اپنے معاملات میں انصاف پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ معاشرت میں بھی عدل و انصاف کو فروغ دیتا ہے۔

- خاندان میں عدل: اصول اور فروع دین کی تعلیمات انسان کو اپنے خاندان میں بھی انصاف اور مساوات سے پیش آنے کا درس دیتی ہیں۔ یہ اصول اسے اپنے والدین، بیوی، بچوں اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا شعور دیتے ہیں، جس سے ایک خوشحال خاندان وجود میں آتا ہے۔

- سماجی عدل: فروع دین میں موجود مالی احکام (جیسے خمس اور زکات) ایک منصفانہ اقتصادی نظام کو فروغ دیتے ہیں۔ ان کے ذریعے معاشرت میں ہر فرد کو اس کے حقوق میسر آتے ہیں، اور ایک مضبوط اور انصاف پسند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

11۔ سماجی خدمت اور فلاح عامہ

اسلام کی تعلیمات میں اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے خدمت اور فلاح عامہ کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اصول اور فروع دین کے احکامات انسان کو اس کی اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں۔

- خیرات اور فلاحی کام: فروع دین میں صدقہ، خیرات اور غریبوں کی مدد جیسے احکام سے معاشرت میں فلاح عامہ کا نظام مضبوط ہوتا ہے۔ یہ احکام انسان کو سماجی مسائل کے حل کی طرف راغب کرتے ہیں۔

- امر بالمعروف و نہی عن المنکر: یہ اصول انسان کو اس بات کا پابند بناتے ہیں کہ وہ صرف اپنی ذات تک محدود نہ رہے، بلکہ دوسروں کی بھلائی کے لیے بھی کام کرے۔ یہ چیز اسے ایک فعال اور ذمہ دار فرد بناتی ہے جو معاشرے کی اصلاح میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔

اصول دین اور فروع دین کے ان اصولوں کے ذریعے انسان اپنی ذات میں بہتر تبدیلیاں لا سکتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکتا ہے جو عدل، محبت، انصاف، اور امن کا گہوارہ ہو۔ ان اصولوں پر عمل کرنے سے فرد کی انفرادی زندگی میں روحانیت، سکون اور ترقی آتی ہے جبکہ اجتماعی زندگی میں بھائی چارہ، معاشرتی خدمت، اور خیر خواہی کو فروغ ملتا ہے۔
اصول دین اور فروع دین دونوں مل کر انسان کو ایک ایسی زندگی گزارنے کی راہ دکھاتے ہیں جو اسے روحانی، اخلاقی، اور سماجی طور پر کامیاب بناتی ہے۔ ان تعلیمات کے ذریعے فرد میں نیکی، عدل، اور اخوت جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے معاشرے کے لیے ایک مفید انسان بن جاتا ہے۔ ان پر عمل سے انسان کی فردی زندگی بھی بہتر ہوتی ہے اور معاشرت بھی امن، سکون، اور ترقی کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیاسی زندگی پر ایک نظر۔۔۔

ائمہ علیہم السلام کی روشن زندگی میں ایک قطعی اور مشترک اصول جو کہ تمام زاویوں سے نظر آتا ہے وہ ان کا سیاست میں شرکت کرنا ہے۔ ائمہ علیہم السلام کا سیاست میں شامل ہونا اس طرح ہے کہ اس معاملے کو ان کی زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی پوری زندگیوں میں ظالم وغاصب طاغوتی حکمرانوں کے ساتھ ان کے جو بھی اختلافات نظر آتے ہیں ان کی بنیاد یہی مسئلہ امامت و حکومت ہے۔ ائمہ علیہم السلام کی جن لوگوں نے بھی مخالفت کی، انہیں زندانوں میں قید کیا، اذیتیں اور تکالیف دیں، ہر لمحہ جاسوسی کی، انہیں زہر دیایا کسی بھی طرح قتل کیا۔۔۔ یہ سب دشمنیاں سیاسی تھیں۔ ائمہ علیہم السلام نے یہ سب لڑائیاں اپنے حقِ خلافت اور خود کے حکومت کے اہل ہونے کے دعوے کی بنیاد پر لڑیں۔

ائمہ علیہم السلام اگر یہ دعوائے حکومت و خلافت نہ کرتے اور دوسرے لوگوں کی طرح علومِ اولین و آخرین، فلسفی اور سائنسی و دیگر علمی و فقہی دروس یا

پاکیزگیٔ قلب اور نفسانی ریاضتوں میں مگن رہتے اور تدریس کرتے، مسجد و مدرسے میں مشغول رہتے تب تو اِن خلفاء کو کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو اتنا شدید اختلاف نہ ہوتا، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں بہت سے فقہا، محدثین اور علامہ تھے جو درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، بعض تصوف و عرفان یا نماز و عبادت میں مگن رہتے تھے مگر چونکہ خلفائے زمانہ سے اختلاف نہیں کرتے تھے اسی باعث جابر و غاصب حکمرانوں نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی بلکہ بعض کو تو اپنے درباروں میں علمی اسناد و القابات و ہدایا عطا کیے نیز خصوصیت کے ساتھ عباسی خلیفہ نے ائمہ علیہم السلام کے علمی مقابلے پر یونانی اور ہندوستانی فلسفہ و علوم کی تدریسی درس گاہیں قائم کیں اور دنیا بھر سے نئے نئے علوم معاشرے میں متعارف کروائے تاکہ امت مسلمہ اہلبیت علیہم السلام سے دور رہے تاکہ اس کے نتیجے میں ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے حکومت کے منطقی حق سے روشناس نہ ہو سکے۔

اصل مسئلہ ہی یہی ہے لہذا آپ دیکھ لیں کہ ائمہ علیہم السلام نے اپنے دعوت ناموں اور تبلیغی پیغامات میں لفظ "امر امامت"، "ہمارا امر" کو اسی مصداق یعنی "امام" اور "امامت" کے تحت استعمال کیا اور اسے بہت ہی بنیادی و مرکزی

مسئلہ قرار دیاہے۔ امیر المومنین علیہم اللسام سماج اور معاشرے میں امامت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:" میری ولایت اور حکومت کی مثال چکی کے درمیاں موجود اس کیل کی مانند ہے جس کے محور پر چکی کا نظام چلتا ہے۔" اسی طرح امام رضاعلیہ السلام فرماتے ہیں:" جس دن ہر دل مردہ ہو گا اس دن صرف وہ قلب زندہ ہو گا جو ایسی مجلس و محفل میں بیٹھتا ہو جہاں ہمارے امر حکومت کو زندہ کیا جاتا ہو۔" امامت اسی وجہ سے ہمارے عقائد میں بنیادی اور مرکزی عقیدہ ہے اور عقلی طور پر بھی معاشرے کی باگ ڈور حاکم کے ہی ہاتھ میں ہوتی ہے لہذا معاشرے میں فساد یا اصلاح یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ معاشرے کا ولی ہی ہوتا ہے جس سے معاشرے کا انجن چلتا ہے یا بند کیا جاتا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی سیاسی کردار اور خلافت کے حوالے سے جو باتیں ذکر کی ہیں، ان میں مزید وضاحت اور تفصیلات کے لیے قرآن، احادیث، اور تاریخ کے حوالے سے کچھ نکات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے تاکہ ان کا کردار اور حقیقتِ امامت و خلافت مزید واضح ہو سکے۔

1۔ قرآنی حوالہ

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں اللہ تعالیٰ نے امامت کو ایک عظیم مقام قرار دیا۔ جب اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو مختلف امتحانات میں کامیابی کے بعد انہیں امامت کا مقام عطا کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے بھی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا :

" میرا یہ عہد (امامت) ظالموں کو نہیں پہنچے گا "

(سورۃ البقرہ، آیت 124)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ امامت ایک الٰہی منصب ہے جو صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جو ہر قسم کی برائی سے پاک ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام کو اللہ نے اس عظیم مقام پر فائز کیا، کیونکہ وہی ہر قسم کی برائیوں سے پاک اور معصوم ہیں۔

2۔ روایات سے استدلال

ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام نے ہمیشہ امامت کے موضوع پر زور دیا۔ ایک مشہور حدیث ہے جسے حدیثِ ثقلین کہا جاتا ہے، جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا :

" میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، قرآن اور میرے اہلِ بیت۔ جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے، تم ہر گز گمراہ نہیں ہو گے۔ "

(صحیح مسلم، ترمذی)

یہ روایت یہ واضح کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت کو ہدایت کے لیے قرآن کے ساتھ اپنے اہلِ بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، جو ان کے علم، تقویٰ اور حقِ امامت کی نشاندہی کرتا ہے۔

3۔ ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں سیاسی مصائب اور مثالیں

ائمہ علیہم السلام کی زندگیاں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہیں ہر دور میں حکومت کے غاصب حکمرانوں کی جانب سے سخت ترین اذیتوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تمام اذیتیں اور پابندیاں سیاسی بنیادوں پر تھیں، کیوں کہ اہلِ بیت علیہم السلام نے ہمیشہ حق اور عدل کی بات کی اور حکومت کے انحرافات پر خاموشی اختیار نہیں کی۔

۔حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کے ابتدائی دور میں حق کی بنیاد پر نظر انداز کیا گیا، یہاں تک کہ انہیں خاموش رہ کر صبر کا مظاہرہ کرنا پڑا تاکہ اسلامی

معاشرہ تقسیم سے بچ جائے۔

-حضرت امام حسین علیہ السلام کا واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا واضح ترین واقعہ ہے، جس میں انہوں نے یزید جیسے ظالم اور فاسق حکمران کے خلاف قیام کیا اور اپنی جان، اہلِ بیت علیہم السلام کی قربانیاں دیں، تاکہ امت کو بیدار کیا جائے۔

4۔ امامت اور خلافت کی ذمہ داری اور ان کی تعلیمات

ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں واضح ہدایات موجود ہیں کہ امام صرف نماز و روزہ کے اعمال یا عبادات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی اور حکومتی ذمہ داریوں کا حامل ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :

" ہمارے امر (حکومت) کو سمجھنا واجب ہے، کیونکہ یہی امت کی اصلاح کی بنیاد ہے۔"

امام رضا علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اگر امت کسی دوسری طرف متوجہ ہو جائے تو دل کی حقیقی زندگی اور ایمان میں کمی آسکتی ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امام اور ان کی حکومت کی جانب رجوع کرنے میں حقیقی کامیابی ہے۔

5۔ تاریخی واقعات

عباسی اور اموی حکمرانوں کی حکومت میں کئی مرتبہ ائمہ علیہم السلام کو گرفتار کر کے قید خانوں میں رکھا گیا اور ان کی زندگی پر سخت نگرانی رکھی گئی۔ مثال کے طور پر:

-امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کئی سالوں تک عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے قید میں رکھا۔

-امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کو سامراء میں محصور رکھا گیا تاکہ عوام ان کے قریب نہ آئیں اور انہیں امام کے کردار و اہمیت سے دور رکھا جا سکے۔

6۔ عقل اور منطق کے اعتبار سے امامت کا کردار

ائمہ علیہم السلام کے فلسفہ حکومت کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ امت کو اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے بیدار کیا جائے اور ظلم و جبر کے خلاف حق کی آواز بلند کی جائے۔ امام کے ذریعہ سے معاشرتی انصاف، حقوق کی حفاظت، اور انسانوں کی فلاح و بہبود کے نظام کو نافذ کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر اسلامی حکومت اور امامت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

اس طرح ان دلائل اور مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام کا سیاسی کردار اور امامت کا دعویٰ ایک الٰہی ذمہ داری اور امت کے حق کی حفاظت کے لیے تھا۔ ان کا مقصد نہ صرف حکومت میں آنا تھا بلکہ ظلم کے خلاف جدوجہد اور معاشرتی انصاف قائم کرنا تھا تاکہ حقیقی اسلامی معاشرہ وجود میں آ سکے۔

مجالس عزاء کا مقصد اور روحِ حق کے فقدان کی وجوہات

آج کل کی مجالسِ عزا میں اکثر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اہداف اور مشن کی اصل روح سے کٹاؤ نظر آتا ہے۔ کربلا اور دیگر ائمہ کی شہادت کا اصل مقصد صرف رونے یا یاد منانے تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ ایک عظیم پیغام تھا کہ انسان حق اور عدل کے راستے پر قائم رہے، ظلم و باطل کے خلاف آواز بلند کرے، اور معاشرت میں اصلاح کی کوشش کرے۔ یہ مجالس ایک پلیٹ فارم ہیں جن کا مقصد لوگوں کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات اور ان کے مشن سے جوڑنا ہے۔

آج کی مجالس میں کئی وجوہات کی بنا پر کمی آئی ہے۔ اکثر مجالس میں صرف روایتی انداز سے امام حسینؑ اور دیگر شہداء کا ذکر کیا جاتا ہے، مگر ان کے قیام کے مقصد، اُن کی قربانی اور ان کے پیغام کو عملاً زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کم نظر آتی ہے۔ مجالس میں اکثر عصری مسائل اور آج کے حق و باطل کی صورتوں

پر بات نہیں کی جاتی۔ ائمہ علیہم السلام کا مشن ظلم کے ہر دور میں مخالفین کو بے نقاب کرنا تھا، چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو۔ مزید یہ کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی مجالس کا مقصد صرف یادگاری نہیں بلکہ شعور بیدار کرنا اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے افراد کو تیار کرنا تھا، لیکن آج کی مجالس میں ان بنیادی اہداف کو کم ہی بیان کیا جاتا ہے۔

اگر مجالسِ عزا کو واقعی ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے مشن سے جوڑنا ہے تو ہمیں مندرجہ ذیل نکات پر زور دینا ہو گا۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی زندگی، ان کا مشن، اور ان کے اصول و مقاصد کو مجالس میں بیان کیا جائے۔ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ امام حسینؑ کا قیام ظلم کے خلاف تھا اور ان کی قربانی کا پیغام یہ ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں حق اور عدل کی حمایت کرے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے مشن کی بنیاد معاشرتی اصلاح تھی۔ مجالس میں آج کے معاشرتی مسائل جیسے کہ کرپشن، ظلم، انصاف کا فقدان، اخلاقی انحطاط، اور معاشرتی بے راہ روی کو بیان کرنا ضروری ہے، تاکہ لوگوں کو شعور ملے کہ وہ اپنی زندگیوں میں کیا تبدیلیاں لائیں۔ مجالس میں لوگوں کو ایسی فکری تربیت دی جائے جس سے وہ نہ صرف اپنے ایمان کو مضبوط بنائیں بلکہ حق و باطل کی شناخت میں بھی واضح

رہیں۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ہمیشہ امت کو بیدار کیا کہ وہ اندھی تقلید اور ظلم کو برداشت نہ کرے بلکہ اپنی فکر کو استعمال کرے اور ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی ہمت رکھے۔

آج کے مسائل اور دور حاضر کے چیلنجز کو اسلام اور ائمہ کی تعلیمات کی روشنی میں بیان کیا جائے۔ خاص طور پر نوجوانوں کو ان مسائل کا سامنا کرنے کے لئے تیار کیا جائے اور انہیں ائمہ کی سیرت سے ہدایت دی جائے۔ مجالس کو روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ عملی اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ امام حسینؑ کے پیغام کو اپنی زندگی میں نافذ کریں اور اپنی زندگی کے ہر پہلو میں ان کی سیرت کو اپنانے کی کوشش کریں۔ مجالس میں اس بات پر بھی زور دینا چاہیے کہ ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ اتحاد و یکجہتی کی تعلیم دی ہے۔ آج کے دور میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو فروغ دینا اشد ضروری ہے تاکہ باطل طاقتوں کے خلاف اجتماعی طور پر کھڑا ہوا جا سکے۔

مختصراً، مجالس عزا کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اصل اہداف و مقاصد سے منسلک کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اگر منبر سے ان کی زندگی کے عملی پہلو،

معاشرتی اصلاح اور حق و باطل کی شناخت پر زور دیا جائے، تو ان مجالس کا حقیقی مقصد پورا ہو گا۔ اس طرح یہ مجالس نہ صرف ایک یادگار ہوں گی بلکہ افراد اور معاشرہ میں حقیقی تبدیلی کا ذریعہ بنیں گی۔

غلو اور ناصبیت (افراط و تفریط) کے درمیان کا راستہ

مسلمانوں کے درمیان موجود دو انتہائیں، یعنی غلو اور ناصبیت، ایک ایسی حقیقت ہیں جو اسلام کی اصل روح کے خلاف ہیں۔ غلو کا مطلب ہے اہل بیت (ع) کے مقام کو حد سے بڑھا کر انہیں الٰہی صفات سے متصف کرنا، جبکہ ناصبیت اہل بیت (ع) سے دشمنی اور ان کی عظمت کو چھپانے کی کوشش ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک راہِ اعتدال ہے جسے حق اور واجب الاطاعت قرار دیا گیا ہے۔ یہ راہ قرآن، سنت رسول (ص)، اور اہل بیت (ع) کی تعلیمات پر مبنی ہے، جو نہ افراط کا شکار ہے اور نہ تفریط کا۔

اہل بیت (ع) کی محبت ایمان کا حصہ ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں حکم دیا گیا کہ رسول (ص) کے اہل بیت (ع) سے محبت کی جائے۔ تاہم، یہ محبت کبھی اس حد تک نہ پہنچے کہ ان کو خدا کے مقام پر فائز کر دیا جائے۔ اہل بیت (ع) کی پیروی ان کے بتائے ہوئے اصولوں اور سنت پر عمل کرنے کو واجب قرار دیتی ہے، لیکن ان کے مقام میں حد سے تجاوز کرنا غلو کے زمرے میں آتا ہے، جو دین میں

ممنوع ہے۔ دوسری طرف، ناصبیت یعنی اہل بیت (ع) سے بغض رکھنا، قرآن اور سنت کے سراسر خلاف ہے۔ رسول اللہ (ص) نے واضح طور پر اہل بیت (ع) کی محبت اور اطاعت کا حکم دیا ہے، اور ان سے دشمنی رکھنا درحقیقت دین سے انحراف ہے۔

قرآن مسلمانوں کو ہر معاملے میں اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور ہم نے تمہیں امتِ وسط بنایا ہے۔" اس آیت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہر پہلو میں میانہ روی اپنانی چاہیے۔ سنت رسول (ص) اور اہل بیت (ع) کی تعلیمات میں بھی افراط و تفریط سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ امام علی (ع) نے غالیوں اور ناصبیوں دونوں کی مذمت کی اور فرمایا کہ نہ ہم سے محبت میں غلو کرو اور نہ ہی ہمیں دشمن سمجھو، بلکہ ہماری تعلیمات پر عمل کرو۔

اسلام کا بنیادی اصول عدل اور انصاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: "اور جب تم بات کرو تو انصاف سے کام لو۔" اہل بیت (ع) نے ہمیشہ عدل اور انصاف کا درس دیا اور ہر طرح کے افراط و تفریط سے بچنے کی تاکید کی۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں میانہ روی اور حق و ہدایت کی پیروی نمایاں ہے۔

راہِ اعتدال پر چلنے کے لیے علم اور معرفت میں اضافہ ضروری ہے۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ، اہل بیت (ع) کی سیرت اور اقوال کو سمجھنا، اور اسلامی اصولوں سے آگاہی انسان کو افراط و تفریط سے بچا سکتی ہے۔ اخلاقی تربیت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ غلو اور ناصبیت عموماً تعصبات اور بغض کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اخلاقی تربیت حسنِ ظن، حسنِ سلوک، اور اعتدال پسندی کو فروغ دیتی ہے۔

علماء اور رہنماؤں کی رہنمائی لینا بھی ضروری ہے تاکہ انسان فکری گمراہی سے بچ سکے۔ علماء کی صحبت میں رہ کر اپنی شخصیت کو سنوارنا اور اعتدال کو اپنانا ممکن ہوتا ہے۔

راہِ اعتدال قرآن اور اہل بیت (ع) کے نزدیک وہ راستہ ہے جو ایمان کو مضبوط اور خالص بناتا ہے۔ یہ راستہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ غلو اور ناصبیت سے دور رہتے ہوئے اس میانہ روی کی راہ کو اپنائیں، جو حق، محبت، اور انصاف پر مبنی ہے۔

نعمتوں کو درست وسیلے سے حاصل کریں

انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و الضالین

قرآن اور اہلبیت (علیہم السلام) کی احادیث کی روشنی میں ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، اور ساتھ ہی ان نعمتوں کے صحیح ذریعے سے طلب کرنے کی ہدایت بھی دی ہے۔ قرآن مجید اور معصومین (ع) کی تعلیمات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ صبر اور تقویٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے وسیلے سے نعمتوں کی طلب کی جائے، نہ کہ ان لوگوں کے ذریعے جو ظلم اور ناحق کے راستے پر چلتے ہیں۔

1۔ اللہ پر بھروسہ اور صبر کی تعلیم:

قرآن میں اللہ پر بھروسہ اور صبر کے حوالے سے بارہا تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ

" اور صبر کرو اور تمہارا صبر اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ "(سورہ نحل، 16:127)

یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ حقیقی صبر اللہ ہی کی مدد سے ممکن ہے اور اسی سے ہمیں ہر نعمت کی طلب میں استقامت اور امید کا درس ملتا ہے۔

2۔ نیک بندوں کے وسیلے سے برکت اور دائمی نعمتیں:

نیک بندے جو کہ اللہ کے مقرب اور عبادت گزار ہیں، ان کا وسیلہ ہمیں دائمی اور بابرکت نعمتوں کی طرف لے جاتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق (ع) فرماتے ہیں:

"اگر تمہیں کسی ضرورت میں اللہ کی بارگاہ میں دعا کرنی ہو تو نیک بندوں کے وسیلے سے دعا کرو کیونکہ ان کی دعائیں اللہ کے نزدیک مقبول ہوتی ہیں۔"

(اصول کافی، جلد 2)

یہ حدیث اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ نیک بندوں کے ذریعے طلب کی جانے والی نعمتیں نہ صرف طمانیت بخش ہوتی ہیں بلکہ اللہ کی طرف سے رحمت اور برکت کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔

3۔ ظالمین کے وسیلے سے ملنے والی نعمتوں کی ناپائیداری:

قرآن ہمیں بارہا ظالموں سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے اور ان کی دنیاوی نعمتوں کی حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ

" اور تم ظالموں کی طرف نہ جھکنا ورنہ تمہیں آگ پکڑ لے گی۔ "(سورہ ہود، 11:113)

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ظالمین کے ذریعے ملنے والی نعمتیں وقتی ہیں اور ان میں ذلت اور خواری ہوتی ہے، کیونکہ ان میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہوتی۔ ایسی نعمتیں وقتی فائدے کے بعد نقصان اور مصیبت کا سبب بنتی ہیں۔

4۔ پیغمبر اکرم (ص) اور اہلبیت (ع) کی تعلیمات میں پائیدار نعمتوں کی اہمیت:

پیغمبر اکرم (ص) کا ارشاد ہے:

"جو نعمت اللہ کے بندوں کے وسیلے سے ملے، وہ کبھی کم نہیں ہوتی اور ہمیشہ خیر و برکت کا ذریعہ ہوتی ہے۔"

یہ حدیث ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ نیک بندوں کے ذریعے حاصل کی گئی نعمتیں اللہ کی رضا کی نشانی ہیں اور دنیا و آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہیں۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ اللہ سے نعمتوں کی طلب میں صبر اور استقامت اختیار کرنی چاہیے اور نیک بندوں کے وسیلے سے مانگنا چاہیے۔ ان کے ذریعے حاصل ہونے والی نعمتیں ہمیشہ سکون، عزت، اور برکت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ دوسری طرف، ظالمین کے وسیلے سے ملنے والی نعمتیں وقتی، ذلت آمیز اور نقصان دہ ہوتی ہیں۔

غالیوں کی نفسیاتی کیفیت اور دینی فکر کا تجزیہ

غلو دین میں افراط و تفریط کی ایک ایسی کیفیت ہے جس میں کوئی فرد کسی شخصیت، جیسے انبیاء یا ائمہ، کو ان کے حقیقی مقام سے بلند کر دیتا ہے، حتیٰ کہ انہیں الوہیت یا ربوبیت کے درجے پر فائز کر دیتا ہے۔ یہ ایک بڑی فکری گمراہی ہے جسے اسلام میں سختی سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے دین کی اصل تعلیمات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور توحید کا بنیادی اصول متاثر ہوتا ہے۔

غلو اور غالی کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ:

غالی کی نفسیات میں عمومی طور پر چند عوامل شامل ہوتے ہیں جو اس رویے کی طرف لے جاتے ہیں:

1۔ احساسِ محرومی اور عظمت کی طلب: غالی افراد عموماً ایسے نفسیاتی احساسات میں مبتلا ہوتے ہیں جن میں انہیں اپنی ذات کی عظمت محسوس نہیں ہوتی، اور وہ کسی عظیم شخصیت کو اپنے لئے سہارا بناتے ہیں۔ ائمہ یا دیگر برگزیدہ شخصیات سے

بے حد عقیدت کی بنا پر وہ ان کو اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ اپنی نفسیاتی کمی کو پورا کر سکیں۔

2۔ تسلط اور یقین کی حدیں: غالی افراد کے نزدیک ایک بے حد طاقتور یقین ہوتا ہے جسے وہ خود تسکین یا حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جب یہ یقین شدت اختیار کرتا ہے تو وہ ائمہ یا شخصیات کے بارے میں عقائد کو اس طرح سے قبول کر لیتے ہیں جو دین کے بنیادی اصولوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

3۔ غیر معمولی عقائد اور حقیقت پسندی سے دوری: غالی افراد عموماً حقیقت پسندی سے دور ہوتے ہیں اور غیر منطقی عقائد اختیار کرتے ہیں۔ وہ اس چیز کو قبول نہیں کر پاتے کہ ائمہ بھی بشر تھے اور اللہ کی اطاعت کے تابع تھے، اور اسی وجہ سے انہیں ربوبیت یا الوہیت کی صفات دینا گمراہی کے زمرے میں آتا ہے۔

4۔ حد سے زیادہ عقیدت: غلو کی نفسیاتی کیفیت میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ عقیدت کی شدت فرد کو اندھا کر دیتی ہے۔ یہ حد سے زیادہ عقیدت عقل و شعور کو مفلوج کر دیتی ہے، جس سے وہ شخصیات کے مقام کو غیر ضروری طور پر بلند کر دیتا ہے۔

غالی جدید عملیات اور ائمہ کی تعلیمات کو کیوں نہیں اپناتا؟

غالی کے لیے ائمہ کی تعلیمات کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنانا مشکل ہوتا ہے کیونکہ:

1۔ جمود اور ارتقاء سے خوف: غالی افراد عموماً جمود کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے یا جو روایات انہوں نے قبول کی ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا جدید دور کی ضروریات کے مطابق کوئی ارتقاء نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی عقیدت کو کسی بھی جدید تصور سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

2۔ ائمہ کی حقیقی تعلیمات سے لاعلمی: غالی افراد ائمہ کی اصل تعلیمات اور ان کے سماجی و سیاسی اعمال سے عموماً واقف نہیں ہوتے یا انہیں اس انداز میں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس میں اصل مفہوم آشکار ہوتا ہے۔ ائمہ نے ہمیشہ حقیقی اسلامی اصولوں پر چلنے کی تعلیم دی، مگر غالی انہیں زیادہ تر الٰہی صفات کے ساتھ جوڑتے ہیں اور ان کی حقیقی انسانی اور اصلاحی جدوجہد سے انکار کرتے ہیں۔

3۔ نظامِ عمل سے فرار: ائمہ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا مطلب ایک خاص نظامِ عمل کو اپنانا ہے جو جدوجہد، صبر، اور احتساب پر مبنی ہوتا ہے۔ غالی عموماً اس قسم کی جدوجہد سے گریز کرتے ہیں اور صرف روحانی یا خرافاتی انداز سے ائمہ کی محبت میں گم رہتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ حقیقی اسلامی نظام میں اپنی زندگی گزاریں۔

جدید دور میں ائمہ کے سیاسی اعمال کا اطلاق کرنے سے اجتناب:

غالی ائمہ کے سیاسی اور سماجی اقدامات کو اپنے عملی زندگی میں اپنانے سے گریز کیوں کرتے ہیں؟ اس کا تجزیہ درج ذیل ہے:

1۔ تصوراتی مذہبی عقائد: غالی افراد کے نزدیک ائمہ کی شخصیت کو ایک ایسی مقدس اور ماورائی حیثیت میں دیکھا جاتا ہے جس کا دنیاوی سیاست یا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے نزدیک ائمہ کا مشن ایک خاص روحانی دائرے تک محدود ہے، جس میں سیاسی اور سماجی جدوجہد کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔

2۔ جدوجہد سے کنارہ کشی: ائمہ نے اپنے سیاسی اقدامات میں ظالم حکمرانوں کے خلاف اور عدل کے قیام کے لئے جدوجہد کی ہے، جیسے امام حسین (ع) کا کربلا

میں قیام، جو حق و باطل کے درمیان ایک واضح معیار قائم کرتا ہے۔ مگر غالی افراد اس جدوجہد کے عملی پہلوؤں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، کیونکہ وہ خود کو اس قسم کی عملی ذمہ داریوں کے بوجھ سے بچانا چاہتے ہیں۔

3۔ اصلاحی مشن سے لاتعلقی: ائمہ اہل بیت (ع) کا اصلاحی مشن تھا جس میں لوگوں کو فکری و روحانی آزادی دینے، حقوق کی پاسداری، اور انصاف کے قیام کی تلقین شامل تھی۔ مگر غالی افراد نے اس اصلاحی پہلو کو نظر انداز کر دیا اور صرف عقیدت کے ایک محدود اور غیر فعال دائرے میں ائمہ کی محبت کو محدود کر دیا۔

4۔ اندھا دھند عقیدت اور سچائی سے بیزاری: ائمہ کے سیاسی افکار کو سمجھنے کے لیے علمی اور فکری کوشش کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ غالی عموماً جذباتی اور روحانی عقیدت میں اتنے گم ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ تجزیاتی یا فکری کوشش اضافی اور غیر ضروری لگتی ہے۔

غالی افراد کے نظریات اور طرزِ عمل دین کی اصل روح اور ائمہ کے حقیقی مشن سے دور ہیں۔ ان کی نفسیاتی کیفیت، جس میں وہ عقیدت میں حد سے بڑھ جاتے

ہیں، انہیں ائمہ کی تعلیمات کو جدید عملیات میں اپنانے اور ائمہ کے سیاسی اعمال کو اپنی زندگیوں میں لاگو کرنے سے روکتی ہے۔ ائمہ کا مشن ایک اعتدال اور توازن کا تھا جس کا مقصد انسانوں کو اللہ کی طرف لانا اور دنیا میں عدل و انصاف کا قیام تھا۔ غالی کا یہ رویہ کہ ائمہ کو الوہیت یا ماورائی حیثیت میں فائز کر دیا جائے، دین میں بگاڑ اور توحید کی روح سے انحراف کا سبب بنتا ہے۔

ناصبیوں کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ اور ان کی عملی کوتاہیاں

ناصبیوں کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ اور ان کی عملی کوتاہیوں کا جائزہ لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح اہل بیت (علیہم السلام) سے بغض رکھنے کی کیفیت فرد کی شخصیت، عقائد، اور عملی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ ان کے رویے میں بعض نفسیاتی عوامل، فکری کمزوریاں، اور عملی سطح پر بنیادی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے اس طرزِ عمل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

(الف) نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ

1۔ عدمِ تحفظ اور خود اعتمادی کی کمی: ناصبی عموماً عدمِ تحفظ کا شکار ہوتے ہیں اور خود اعتمادی میں کمی محسوس کرتے ہیں۔ اہل بیت (ع) کی عظمت اور ان کی تعلیمات کو قبول کرنے میں انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اس سے ان کے اپنے مذہبی نظریات یا گروہی شناخت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے، وہ ان

شخصیات کی عظمت کا انکار کر کے اپنے نظریات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

2۔ حسد اور دشمنی: ناصبیوں کے دل میں اہل بیت (ع) کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے حسد اور بغض پایا جاتا ہے۔ اس حسد کا تعلق اس بات سے ہے کہ اہل بیت (ع) کو امت میں عظیم مرتبہ حاصل ہے، اور ناصبی اس بلند مقام کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی شخصیت میں حسد ایک ایسی گہری نفسیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے جس کے سبب وہ اہل بیت (ع) سے دشمنی پر آمادہ رہتے ہیں۔

3۔ تعصبات: ناصبی عموماً تعصبات اور فرقہ وارانہ خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنی مخصوص گروہی شناخت بہت اہمیت رکھتی ہے اور یہ تعصبات انہیں اہل بیت (ع) کی شخصیت و تعلیمات سے منسلک ہونے سے روکتے ہیں۔ یہ تعصبات عموماً ذہنی تنگ نظری اور مذہبی عدم برداشت کی علامت ہیں۔

4۔ انکارِ حقیقت اور علمی بد دیانتی: ناصبیوں میں حقیقت کا انکار اور علمی بد دیانتی بھی عام ہے۔ اہل بیت (ع) کے فضائل و مناقب کو جھٹلانے کے لیے یا تو وہ

مستند حقائق سے انکار کرتے ہیں یا پھر انہیں غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ نفسیاتی کیفیت پائی جاتی ہے کہ وہ حقیقت کو قبول کرنے کے بجائے اس سے انحراف کرتے ہیں۔

5۔ عدمِ فکری آزادی: ناصبی عموماً کسی خاص نظریے یا گروہ سے فکری طور پر منسلک ہوتے ہیں اور آزادانہ طور پر تحقیق کرنے یا سچائی کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ فکری جمود انہیں اہل بیت (ع) کی عظمت کو قبول کرنے سے روکتا ہے، اور وہ محدود ذہنی دائرے میں ہی رہ کر اپنی عداوت کو برقرار رکھتے ہیں۔

(ب) عملی میدان میں بنیادی کوتاہیاں

1۔ حقیقی اسلامی تعلیمات سے دوری: ناصبی افراد اہل بیت (ع) کی تعلیمات سے دوری اختیار کرتے ہیں جو اسلام کی روح اور حقیقی تعلیمات کو سمجھنے اور اپنانے میں ایک بنیادی رکاوٹ ہے۔ اہل بیت (ع) نے انسانیت کے لیے اعلیٰ اخلاق، علم، عدل، اور انصاف کے اصول وضع کیے، لیکن ناصبی ان اصولوں کو

اپنا کر عملی زندگی میں نہیں لاتے، جس کے سبب وہ دین کی حقیقت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

2۔ دشمنی اور نفرت کی تبلیغ: ناصبیوں کی عملی زندگی میں ایک بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ اہل بیت (ع) کے خلاف پروپیگنڈہ اور نفرت انگیز مواد کی ترویج میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ دشمنی اور نفرت ان کے کردار کا حصہ بن جاتی ہے، اور اس کا نتیجہ معاشرتی بگاڑ اور تفرقہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

3۔ اہل بیت (ع) کے فضائل کو کم کرنے کی کوشش: ناصبی عملی میدان میں اہل بیت (ع) کے فضائل کو جھٹلانے، ان کے مقامات کو کم ظاہر کرنے، اور ان کی شخصیت کے خلاف منفی خیالات پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی عملی بددیانتی ہے جو انہیں مسلمانوں کے عقائد میں خلل پیدا کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔

4۔ تاریخی حقائق کو مسخ کرنا: ناصبی افراد اہل بیت (ع) اور اسلامی تاریخ کے حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں، جس سے عوام الناس میں ان کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس قسم کی مسخ شدہ معلومات اسلامی تعلیمات کے

درست فہم میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں اور اس سے نوجوان نسل کو بھی گمراہی میں مبتلا کرتی ہے۔

5۔ فرقہ وارانہ رویہ: ناصبی فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں اور اہل بیت (ع) کے ماننے والوں کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں۔ ان کا عملی میدان میں یہ رویہ امتِ مسلمہ کے اتحاد کو نقصان پہنچاتا ہے اور انہیں گروہی تعصبات میں مبتلا رکھتا ہے۔

6۔ اسلامی اخلاقیات اور انسانیت سے دوری: اہل بیت (ع) کی تعلیمات انسانیت، محبت، اور بھائی چارے پر مبنی ہیں، لیکن ناصبی ان اعلیٰ اسلامی اقدار کو نظر انداز کر کے اپنے طرزِ عمل میں نفرت، دشمنی، اور عداوت کو فروغ دیتے ہیں۔ ان کی عملی زندگی میں اسلامی اخلاقیات اور انسانیت سے دوری نمایاں ہے، جو انہیں اسلام کے اصل پیغام سے دور لے جاتی ہے۔

ناصبیوں کی نفسیاتی کیفیت اور عملی میدان میں کوتاہیاں ان کی شخصیت میں مختلف اخلاقی اور دینی کمزوریوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کا بغض، حسد، تعصبات، اور علمی بد دیانتی انہیں حقیقت اور اسلامی تعلیمات سے دور کر دیتے ہیں۔ اگر وہ

اپنی نفسیاتی کیفیت اور عملی رویوں پر غور کریں اور اہل بیت (ع) کی تعلیمات کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کریں، تو وہ ایک بہتر اور مثبت اسلامی رویہ اختیار کر سکتے ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔

باطل طاقتوں سے مراد کون ہے؟

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے نزدیک باطل طاقتوں سے مراد وہ افراد، گروہ، اور اقوام ہیں جو الٰہی اصولوں اور عدل وانصاف کے خلاف کھڑے ہوئے، جو اسلامی تعلیمات کو اپنے ذاتی مفادات اور اقتدار کی خاطر بگاڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ باطل طاقتیں بنیادی طور پر ظلم، فریب، اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے اقتدار کو استعمال کرتی تھیں۔ قرآن میں بھی ان باطل طاقتوں کی وضاحت مختلف آیات میں کی گئی ہے جو ہمیں ائمہ علیہم السلام کے مشن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

1۔ ظالم اور فاسق حکمران:

قرآن میں ظالم اور فاسق حکمرانوں کے خلاف بار بار تنبیہ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اور تمہیں لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ ظلم نہ کرو اور میرے عہد میں ظالم شامل نہیں ہوں گے۔ "(سورۃ البقرہ، آیت 124)

ائمہ علیہم السلام کا قیام اسی اصول کے تحت تھا کہ وہ خود کو الٰہی تعلیمات کی روشنی میں عدل و انصاف کے لیے اہل اور منتخب سمجھتے تھے، جبکہ اس دور کے باطل حکمران جابر، فاسق، اور ظالم تھے۔ امام حسین علیہ السلام کا قیام بھی اسی لیے تھا کہ یزید فاسق اور جابر حکمران تھا اور اسلام کے اصولوں کو بگاڑ رہا تھا۔

2۔ طاغوتی طاقتیں:

قرآن کریم نے طاغوت کا بارہا ذکر کیا ہے۔ طاغوت سے مراد وہ طاقتیں ہیں جو انسانوں کو اللہ کی عبادت اور عدل و انصاف سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اور جو طاغوت کی بندگی سے انکار کرتے ہیں اور اللہ پر ایمان لاتے ہیں تو یقیناً وہ مضبوط رسی کو پکڑ چکے ہیں۔ "(سورۃ البقرہ، آیت 256)

ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ طاغوت کے خلاف جہاد کیا، کیونکہ یہ وہی طاقتیں تھیں جو اللہ کے نظام کے مخالف تھیں۔ اموی اور عباسی حکمران اپنے اقتدار اور

طاقت کے نشے میں اللہ کی حاکمیت کے بجائے اپنی من مانی کرتے تھے، اور اسی لیے یہ طاغوت کے مصداق تھے۔

3۔ فرعونیت اور ظلم و استبداد:

قرآن میں فرعون کا ذکر اکثر مثال کے طور پر ہوتا ہے۔ فرعون کی طرح ہر دور میں ایسے حکمران اور طاقتیں موجود رہی ہیں جو عوام کو دبانے اور اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے لئے ظلم و استبداد کا سہارا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" یقیناً فرعون زمین میں سرکشی کرتا تھا اور وہاں کے لوگوں کو گروہ در گروہ بانٹ کر کمزور کرتا تھا۔ "(سورۃ القصص، آیت 4)

ائمہ علیہم السلام نے اسی فرعونیت کے خلاف آواز بلند کی، کیونکہ ان کے وقت کے حکمران بھی اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں میں فرقہ بندی، نفرت، اور ظلم و استبداد کو فروغ دیتے تھے۔

4۔ منافقین اور دین کے دشمن:

قرآن میں منافقین کا ذکر کیا گیا ہے، جو کہ دین میں رخنہ ڈالتے ہیں اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے، اور آپ ان کا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ "(سورۃ النساء، آیت 145)

ائمہ علیہم السلام کے دور میں بھی منافقین موجود تھے، جو اسلامی تعلیمات کو بگاڑنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ منافقین اکثر ظالم حکمرانوں کے ساتھی ہوتے تھے اور ائمہ علیہم السلام کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

5۔ اہل باطل اور ان کے مکارانہ طریقے:

قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ باطل قوتیں ہمیشہ مکر و فریب کے ذریعے اہل حق کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں:

" اور انہوں نے بہت چالیں چلیں، اور اللہ نے بھی (جواب میں) اپنی تدبیر کی، اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ "(سورۃ آل عمران، آیت 54)

ائمہ علیہم السلام کے دشمنوں نے بھی سازشیں کیں، جھوٹے پروپیگنڈے کیے، انہیں قید کیا، زہر دیا اور ان کے پیروکاروں کو اذیتیں پہنچائیں تاکہ ان کی آواز کو دبایا جا سکے۔

6۔ اللہ کے دین کے خلاف کھڑے ہونے والے گروہ:

قرآن میں یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت اور سربلندی کے لیے ہمیشہ انبیاء، اور ان کے بعد ائمہ علیہم السلام کو منتخب کیا۔ دین کے مخالف قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ دین کی پیروی کرو، تو کہتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلیں گے۔ "(سورۃ البقرہ، آیت 170)

ائمہ علیہم السلام کے وقت میں بھی کچھ لوگ اسلامی اصولوں کو چھوڑ کر اپنے آباؤ اجداد کے رسوم و رواج پر چلتے رہے اور اسلامی تعلیمات کے بجائے ان غلط عقائد کو فروغ دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ دینِ حق کے دشمن بن گئے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے دشمن بنیادی طور پر وہ ظالم، فاسق اور طاغوتی حکمران تھے جو اسلامی تعلیمات کو اپنے اقتدار اور خواہشات کے مطابق ڈھالنا

چاہتے تھے۔ ان میں اموی اور عباسی حکمرانوں کا کردار واضح ہے، جنہوں نے اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لئے دین میں بگاڑ پیدا کیا، ائمہ کو قید کیا اور قتل کیا۔

ائمہ علیہم السلام نے انہی باطل طاقتوں کے خلاف قیام کیا اور اپنے مشن کے ذریعے واضح کر دیا کہ دین کی حفاظت، عدل کا قیام اور ظلم کے خلاف جدوجہد ان کی اصل ذمہ داری ہے۔

قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات اور دشمنی کے بارے میں مختلف آیات موجود ہیں، اور یہ آیات مختلف حالات و پس منظر میں نازل ہوئیں۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے وقتاً فوقتاً نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، مگر یہ تمام یہودیوں یا عیسائیوں کے متعلق عمومی بیان نہیں ہے بلکہ مخصوص حالات اور کردار رکھنے والے گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔

1۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں دشمنی کا ذکر:

قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے مخصوص گروہوں کے ساتھ دشمنی کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کیں:

" یقیناً آپ ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن یہود اور مشرکین کو پائیں گے۔ "(سورۃ المائدہ، آیت 82)

یہ آیت ان یہودیوں اور مشرکوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مکہ اور مدینہ میں موجود تھے اور جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگیں اور سازشیں کیں۔

2۔ منافقت اور کمزور عقیدے کے حامل افراد کو اکسانا:

قرآن میں منافقین کا ذکر بھی بار بار آیا ہے جو بظاہر مسلمان ہوتے ہوئے درپردہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر سازشیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ منافق افراد یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ سازباز کرتے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف اکسایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اے نبیؐ! منافقوں کے بارے میں تمہیں جو اطلاع دی گئی ہے وہ کافی ہے۔ اور تم ان کے بارے میں صرف اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ خود تمہارے لیے کافی ہے۔ "(سورۃ النساء، آیت 81)

منافقین نے کئی مواقع پر ائمہ اہل بیت علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف سازشیں کیں، اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر مختلف فتنے پیدا کیے۔

3۔ اسلام کے خلاف سازشیں اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف رویہ:

اسلامی تاریخ میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ بعد کے ادوار میں بھی بعض یہودی اور عیسائی گروہوں نے اسلامی معاشرت میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کی۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں مختلف گروہوں نے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف سازشیں کیں، جن میں منافق اور ضعیف العقیدہ افراد شامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض یہودی اور عیسائی دانشور اور مشیر حکمرانوں کو اپنے مشوروں سے دین میں بگاڑ پیدا کرنے پر اکسایا کرتے تھے۔

4۔ اسلام کے اصولوں پر منافقت اور دورخی طرز عمل:

قرآن میں واضح طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی بھی انسان کا اصل مقام اس کے اعمال اور نیت کے مطابق ہے۔ قرآن میں دشمنوں کا ذکر کرنے کے باوجود بھی یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ہر یہودی یا عیسائی مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اس کے بجائے قرآن میں ان لوگوں سے تعلق کی اجازت دی گئی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملے میں تم سے لڑے نہیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو اور انصاف سے پیش آؤ، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ "(سورۃ الممتحنہ، آیت 8)

قرآن کے مطابق، ہر یہودی اور عیسائی مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے۔ تاہم، ایسے افراد اور گروہوں کا ذکر ملتا ہے جو منافقت، کمزور عقیدے، اور ذاتی مفادات کے تحت اسلام اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف سازشوں میں ملوث رہے۔ قرآن نے ان مخصوص گروہوں کو فتنہ و فساد کے مرتکب قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو ان کے شر سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی شہادتوں میں ایسے افراد اور گروہوں کا کردار رہا ہے جو یا تو منافقت کا شکار تھے یا دشمنانِ اسلام کے زیرِ اثر تھے۔ قرآن مجید نے ایسے عناصر کے بارے میں خبردار کیا اور ان کے خلاف بیداری کو ضروری قرار دیا تاکہ مسلم معاشرہ ان کی سازشوں سے محفوظ رہ سکے۔

قرآن اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں کچھ یہودی اور عیسائی گروہوں نے انبیاء کے خلاف سازشیں کیں اور بعد میں دین میں تحریفات کرکے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مخالفت کا تسلسل نبی اکرم ﷺ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ادوار تک جاری رہا۔ یہ وہی گروہ تھے جنہوں نے نہ صرف نبیوں کے پیغامات میں بگاڑ پیدا کیا بلکہ اپنے ذاتی مفادات اور اقتدار کی خاطر اللہ کے دین کو مسخ کیا۔

1۔ تحریفات اور دین کی بگاڑ:

قرآن میں بارہا ذکر کیا گیا ہے کہ کچھ یہودی اور عیسائی علما نے توریت، انجیل، اور زبور میں تحریفات کیں اور عوام کو غلط راستے پر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" پھر ان لوگوں کے حال پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعے تھوڑی قیمت لے لیں۔ "(سورۃ البقرہ، آیت 79)

یہ وہ افراد تھے جنہوں نے الٰہی کتابوں میں تبدیلیاں کرکے انبیاء کے اصل پیغام کو چھپایا اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

2۔ انبیاء کی مخالفت اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں:

قرآن میں واضح طور پر ذکر ہے کہ کچھ بنی اسرائیل کے لوگ انبیاء کے شدید مخالف تھے اور ان کی تعلیمات کے خلاف کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نبیوں کو جھٹلایا، ان پر ظلم کیا اور بعض کو قتل بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" پھر کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آتا ہے جو تمہاری خواہشات کے خلاف ہو تو تم اس پر تکبر کرتے ہو؟ تو ان میں سے ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو تم قتل کرتے ہو۔ "(سورۃ البقرہ، آیت 87)

اسی طرح کچھ یہودی اور عیسائی گروہوں نے بعد میں اسلام اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف بھی سازشیں کیں اور مسلمانوں کے درمیان انتشار اور نفرت پیدا کرنے کے لیے ذہن سازی کی۔

3۔ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف سازشیں:

اسلامی تاریخ میں ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں کچھ بااثر افراد نے ائمہ علیہم السلام کو راستے سے ہٹانے کے لیے مسلمانوں کے درمیان سازشیں کیں۔ ان کے ساتھ بعض وقت یہودی و نصرانی مشیر اور دانشور بھی شامل ہوتے تھے، جو اپنے سیاسی اور معاشرتی مفادات کو برقرار رکھنے کے لئے اس سازش میں شریک ہوتے۔ ان افراد نے اسلامی عقائد میں بگاڑ پیدا کرنے، ائمہ علیہم السلام کے حق کو چھپانے، اور لوگوں کو ان سے دور کرنے کے لئے نت نئے فلسفے اور خیالات متعارف کرائے۔

4۔ عقل و شعور کی حفاظت اور باطل طاقتوں کے خلاف مزاحمت:

قرآن ہمیں تاکید کرتا ہے کہ ہم ہمیشہ حق اور عدل کے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اے ایمان والو! اللہ کے لئے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔ "(سورۃ المائدہ، آیت 8)

ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ مسلمانوں کو ان باطل طاقتوں سے خبر دار کیا جو اسلام کو بگاڑنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ لوگوں کو ان فتنہ انگیز گروہوں کے اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے اور انہیں توحید، عدل، اور الٰہی اصولوں کے راستے پر قائم رہنے کی دعوت دیتے۔

قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کچھ یہودی اور عیسائی گروہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے نہ صرف انبیاء بلکہ ائمہ علیہم السلام کے خلاف بھی سازشیں کیں اور مسلمانوں کے عقائد میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ گروہ ہیں جو تحریف، گمراہی، اور دین میں بگاڑ کا ذریعہ بنے۔ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں ان فتنوں سے خبر دار رہیں اور دین کی اصل تعلیمات کو سمجھ کر اپنی عقیدے کی حفاظت کریں، کیونکہ یہی وہ باطل طاقتیں پہلے بھی تھیں جو انبیاء کے دشمن رہے جنہوں نے ان کو قتل کیا اذیتیں دیں اور یہی آخری رسول ص کے

بھی دشمن رہے اور مسلمانوں میں اپنے ہمنوا پیدا کر کے سازشیں کرتے رہے اور اہلبیتؑ کی دشمنی میں انہیں قتل و آزار کیا اور آج بھی یہی یہودی اور نصرانی ہیں جو حق کے دشمن اور حق پرستوں سے تعصب اور حسد کے باعث انہیں قتل کرتے ہیں اور آزار پہنچاتے ہیں۔

ظلم سے مقابلے کا اسلامی دستور

جب ہم منافقوں یا فکسڈ مائنڈ سیٹ لوگوں کے ساتھ تعلقات کی بات کرتے ہیں، تو یہ ایک نازک اور پیچیدہ معاملہ ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر عمل کرنا، جو کہ رحمت للعالمین کی خصوصیت ہے، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان صبر، بردباری، اور معاف کرنے کے اصولوں پر عمل کرے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظلم اور فساد کو نظر انداز کیا جائے، کیونکہ اگر ہم ظلم کی سرکوبی نہ کریں یا فساد کو خاموشی سے برداشت کریں تو اس کا نتیجہ معاشرتی خرابی اور فرد کی کمزوری کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ جب منافق یا فکسڈ مائنڈ سیٹ والے افراد فساد پھیلاتے ہیں یا ظلم کرتے ہیں، تو ان کا خاموشی سے تماشا دیکھنا اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ ان کے افعال کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان افراد کے ساتھ درست طریقے سے، معقولیت اور مؤثر طریقے سے پیش آئیں تاکہ نہ صرف خود کو، بلکہ معاشرتی اصولوں اور اخلاقی حدود کو بھی بچایا جا سکے۔

یہ سوال کہ آیا آخرت کے دن پر ظلم کا حساب کتاب چھوڑ دیا جائے یا دنیا میں ظالموں کی سرکوبی کی جائے، ایک اہم موضوع ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ ظلم کا حساب ضرور لے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں ظلم کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم ظلم کا مقابلہ کریں، خاص طور پر جب ہمارے ہاتھ میں وسائل ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ آپ نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، نرمی اور عدلیہ کے ذریعے ظلم کا مقابلہ کیا، اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں طاقت کا استعمال بھی کیا۔ اس لیے ہمیں ظلم کے خلاف اٹھنا چاہیے اور جب تک ممکن ہو، ہمیں حکمت اور بردباری کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ تاہم، جب معاملات زیادہ سنگین ہوں اور ظلم کا اثر بڑھ جائے، تو ہمیں قانونی طریقوں یا مناسب ردعمل کے ذریعے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

جب ہم منافقوں یا فکسڈ مائنڈسیٹ والے افراد کے ساتھ تعلقات اور ان کے ساتھ گزارے جانے والے وقت کی بات کرتے ہیں تو یہ ایک انتہائی حساس مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اگرچہ آپ نے اپنی زندگی میں رحمت، بردباری،

اور معاف کرنے کے اصولوں پر عمل کیا، لیکن آپ نے کبھی بھی ظلم یا فساد کو خاموشی سے برداشت نہیں کیا۔ آپ نے ہمیشہ حق کی حمایت کی اور ظلم کی سرکوبی کے لیے فعال کردار ادا کیا، چاہے وہ فرد کے طور پر ہو یا امت کے لیے۔

اس کے باوجود، جب ہم اپنے معاشرتی، دینی یا اخلاقی اصولوں کو دیکھتے ہیں، تو یہ واضح ہوتا ہے کہ صرف صبر یا خاموشی سے کام نہیں چل سکتا۔ منافقین یا وہ لوگ جو فساد پھیلاتے ہیں، ان کا مقابلہ ضروری ہے تاکہ معاشرت میں عدل قائم رہے۔ اگر ہم ظلم یا فساد کو خاموشی سے دیکھتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اثرات نہ صرف فرد بلکہ پورے معاشرے میں پھیلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حالات میں ہمیں ان افراد کے ساتھ مقابلہ کرنا اور ان کی اصلاح کی کوشش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہمیں آخرت میں ظلم کا حساب اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے یا دنیا میں ظلم کی سرکوبی کرنی چاہیے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں باتوں کا ایک دوسرے سے تعارض نہیں ہے۔ اسلام میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ہر انسان کے عمل کا حساب لے گا، مگر اس کا یہ مطلب

نہیں کہ ہم دنیا میں ظلم کے سامنے خاموش رہیں یا حق کا دفاع نہ کریں۔ دنیا میں عدل کا قیام ایک اہم ذمہ داری ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، ظلم کا مقابلہ کرے۔ اگر ظلم بڑھ جائے اور کسی کا نقصان ہو رہا ہو، تو ہمیں مناسب اقدامات کرنا چاہیے تاکہ ظلم کی روک تھام کی جا سکے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور امام علی علیہ السلام کی رہنمائی ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ضروری ہے، لیکن اس میں حکمت اور عدل کو برقرار رکھتے ہوئے۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا کہ "عدل و انصاف میں کبھی بھی درشتی یا ظلم کو اپنی حکمت سے تبدیل نہ کرو"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں اپنے ردعمل میں ہمیشہ عقل و دانش سے کام لینا چاہیے اور کسی بھی قسم کے ظلم کا جواب دینے میں توازن برقرار رکھنا چاہیے۔

لہذا، ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، معقول طریقوں سے مقابلہ کرنا، اور ظالموں کی اصلاح کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ تاہم، جہاں ضروری ہو، وہاں ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے طاقت کا استعمال بھی کرنا چاہیے تاکہ ظلم کا خاتمہ ہو سکے۔ ان تمام اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ہم اپنے معاشرتی، دینی اور اخلاقی

ذمہ داریوں کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں اور اپنی معاشرتی عدلیہ کو صحیح طریقے سے قائم رکھ سکتے ہیں۔

جب بات مکتب دینی یا تعلیم و تربیت کے شعبے یا زیر کفالت افراد (یعنی خاندان یا دوسرے معصوم لوگ) کی آجائے جو ظلم کا شکار ہوں، تو اس صورت میں ظلم کو برداشت کرنا ایک مختلف سوال بن جاتا ہے۔ ذات تک ظلم کو برداشت کیا جائے، لیکن جب مکتب یا زیر کفالت افراد کی بات ہو، تو یہاں ایک زیادہ فعال ردعمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نوعیت کی صورتحال میں ظلم کے خلاف کھڑا ہونا اور مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ نہ صرف خود کو بلکہ معاشرتی یا مذہبی اصولوں کو بھی محفوظ رکھا جاسکے۔

جب مکتب یا دینی ادارہ ظلم کا شکار ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی تعلیمات یا تربیتی اصول کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اس صورت میں، ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اور اصلاحات کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہاں علما، تعلیمی اداروں اور مذہبی قیادت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حق کا پرچار کریں اور فکری آزادی کو برقرار رکھیں۔ جیسے امام علی علیہ السلام نے خود کو محتسب یعنی نگران

کے طور پر قائم کیا تھا، اس طرح آج بھی ایسی صورتحال میں قیادت کو ظلم کی نشاندہی کرنی چاہیے اور اس کا مناسب ردعمل ظاہر کرنا چاہیے۔

جب آپ کے زیر کفالت افراد ظلم کا شکار ہوتے ہیں، چاہے وہ خاندان کے افراد ہوں یا دیگر کسی صورت میں، تو ان کی حفاظت اور حقوق کا دفاع آپ کا فرض بن جاتا ہے۔ اسلام میں والدین، بیوی، بچے اور دیگر افراد کے حقوق کی حفاظت کی شدید تاکید کی گئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ "تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے"۔ اگر ظلم آپ کے زیر کفالت افراد پر ہو رہا ہے تو نرمی کے ساتھ لیکن ثابت قدمی سے اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ ظلم کا رد کرنا، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، اسلام کی تعلیمات کے مطابق آپ کی ذمہ داری ہے۔

ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کو سب سے پہلے لوگوں کو آگاہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہوں۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور قانونی طریقوں کا سہارا لینے کے لیے عدلیہ میں انصاف کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم، ظلم کا مقابلہ صرف آخرت کے لیے چھوڑنا نہیں چاہیے بلکہ دنیا میں انصاف کا قیام بھی

ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ جب تک ممکن ہو، ظلم کا مقابلہ صبر کے ساتھ کیا جانا چاہیے، لیکن جہاں ظلم کا اثر بڑھنے لگے اور ظلم کی شدت بڑھ جائے تو طاقت کا استعمال ضروری ہو سکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور امام علی علیہ السلام کا نمونہ ہمیں دکھاتا ہے کہ انہوں نے ظلم اور فساد کا مقابلہ کیا، لیکن اس میں حکمت اور عدل کو برقرار رکھا۔ ان کی سیرت یہ بتاتی ہے کہ ہمیں ظلم کے خلاف اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیے، اور جہاں ضرورت ہو، وہاں ہم قانونی یا فکری اقدامات کریں تاکہ معاشرتی انصاف اور حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

اچھائی اور برائی کی انسانی فطرت

انسانی فطرت مثبت رویوں اور اعلیٰ اخلاقی صفات کو پسند کرتی ہے۔ یہ رجحان اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک پاکیزہ فطرت پر ہوئی ہے، جو خوبیوں کی طرف مائل اور برائیوں سے دور رہنے کی خواہش رکھتی ہے۔ مثبت رویے جیسے سچائی، انصاف، محبت، اور رحم دلی انسانی دل میں خوشی اور سکون پیدا کرتے ہیں، کیونکہ یہ صفات معاشرتی اور انفرادی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

انسانی فطرت کی گہرائی میں مثبت رویوں کی محبت اور منفی رویوں سے بیزاری ایک ایسا خداداد اصول ہے جو انسان کی شخصیت اور اس کے طرزِ عمل کی بنیاد بنتا ہے۔ یہ رجحان اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو نہ صرف شعور اور سمجھ بوجھ دی ہے بلکہ اسے اچھائی کو پہچاننے اور اپنانے کی ایک اندرونی صلاحیت سے بھی نوازا ہے۔ جب انسان مثبت عادتوں، جیسے ایمانداری، صبر، اور ایثار کو اپناتا ہے، تو وہ اپنے اندر سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یہ سکون اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صفات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

دوسری طرف، جب انسان برائیوں، جیسے لالچ، بد دیانتی، یا ظلم کی طرف مائل ہوتا ہے، تو اس کے دل میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے اطمینانی اس بات کی علامت ہے کہ اس کا رویہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برائی کے راستے پر چلنے والے لوگ بھی ایک نہ ایک وقت پر اپنے اعمال پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

منفی رویے اور برائیاں، جیسے جھوٹ، ظلم، نفرت، اور خودغرضی، انسانی دل کو بوجھل اور معاشرتی ماحول کو زہر آلود کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ان سے نفرت کرتا ہے اور فطری طور پر ان کے خاتمے کی خواہش رکھتا ہے۔ قرآن پاک بھی انسانی فطرت کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے، جہاں نیکیوں کو اپنانے اور برائیوں سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھائی اور برائی کی پہچان عطا کی اور اسے اختیار دیا کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق مثبت راستہ اختیار کرے۔

یہ اصول معاشرتی سطح پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں اچھائی اور انصاف کی اقدار کو فروغ دیا جائے، وہاں امن اور خوشحالی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں برائیاں غالب ہوں، وہاں فساد، اختلاف، اور بے چینی عام ہوتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں تمام بڑے مصلحین اور انبیاء نے لوگوں کو اچھائیوں کی طرف مائل کرنے اور برائیوں سے روکنے کی جدوجہد کی ہے۔

یہ حقیقت ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ اگر انسان برائیوں میں مبتلا ہوتا بھی ہے تو اس کی فطرت کبھی مطمئن نہیں ہوتی، اور وہ اچھائی کی طرف واپسی کے لیے بے چین رہتا ہے۔ لہٰذا، انسانی معاشرہ بھی ان اصولوں پر قائم ہوتا ہے جہاں مثبت اقدار کو فروغ دیا جاتا ہے اور برائیوں کو روکنے کے لیے اجتماعی کوششیں کی جاتی ہیں۔

انسانی فطرت کے اس پہلو کا ادراک ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی میں حقیقی خوشی اور کامیابی چاہتے ہیں، تو ہمیں اپنی فطرت کے مطابق مثبت عادتوں کو اپنانا ہوگا اور برائیوں سے اجتناب کرنا ہوگا۔ یہ نہ صرف ہمارے اپنے لیے فائدہ مند ہوگا بلکہ ہمارے ارد گرد کے لوگوں اور پورے معاشرے کے لیے بھی۔

پوشیدہ گناہ

پوشیدہ گناہ وہ گناہ ہیں جو انسان کے دل و دماغ میں چھپے ہوتے ہیں اور ان کا ظاہری طور پر کسی دوسرے شخص پر اثر نہیں پڑتا۔ قرآن کی روشنی میں یہ وہ گناہ ہیں جو علانیہ طور پر نہیں کیے جاتے، بلکہ یہ انفرادی سطح پر ہوتے ہیں اور زیادہ تر انسان کی نیت، خیالات اور ارادوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کو بھی حرام قرار دیا ہے کیونکہ وہ انسان کی روحانیت کو متاثر کرتے ہیں اور دراصل اس کی پاکیزگی اور نیک نیتی کے خلاف ہوتے ہیں۔ ایک شخص اگر دل میں کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے، کسی کے بارے میں برا سوچتا ہے یا کسی کے ساتھ ظلم کرنے کی نیت رکھتا ہے، تو یہ سب پوشیدہ گناہ ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے " :إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا "(سورہ بنی اسرائیل: 33)یعنی اے رسول ص تم کہہ دو! میرے پروردگار نے صرف بے حیائی وبدکاری کے کاموں کو حرام قرار دیا ہے خواہ ظاہری ہوں یا باطنی۔۔ یہ

آیت پوشیدہ گناہوں میں شامل ہے، جہاں انسان کی غلط نیت، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا یا کسی کی عزت کو نقصان پہنچانا شامل ہے۔

پوشیدہ گناہ انسان کی اخلاقی حالت کو متاثر کرتے ہیں اور اس کے قلب میں فساد پیدا کرتے ہیں، جو اس کے عمل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یہ گناہ اس لیے بھی زیادہ خطرناک ہیں کہ انسان ان کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے اندر احساسِ جرم یا توبہ کا عمل مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ گناہ صرف اللہ کے علم میں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی نیتوں، خیالات اور دل کی صفائی کی طرف متوجہ کیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح ظاہری گناہ پر سزا ملتی ہے، اسی طرح پوشیدہ گناہ بھی اللہ کے ہاں اہم ہیں اور ان کا حساب بھی ہو گا۔ اس لیے قرآن میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ نہ صرف ظاہری گناہوں سے بچیں بلکہ اپنے دل و دماغ میں بھی اللہ کی رضا کی کوشش کریں تاکہ ان کی روحانیت پاک و صاف رہے۔

پوشیدہ گناہوں کی مثالیں وہ ہیں جو انسان کے دل و دماغ میں ہوتے ہیں، اور ان کا ظاہری طور پر ظاہر ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ گناہ دراصل انسان کی نیت، سوچ،

یا احساسات سے جڑے ہوتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں ایسی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

بد نیتی یا بغض رکھنا : جب انسان کسی دوسرے مسلمان یا انسان کے بارے میں دل میں بغض یا دشمنی رکھتا ہے، تو یہ ایک پوشیدہ گناہ ہے۔ جیسے کسی سے حسد کرنا، اس کی کامیابی پر دل میں نفرت محسوس کرنا، یا اس کی ناکامی کی خواہش کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے " :وَلَا تَحَاسَدُوا "(سورہ حجرات:10)، یعنی حسد نہ کرو۔

غیبت اور جھوٹ بولنا : کسی کی غیبت کرنا، یعنی کسی کے پیچھے اس کے عیبوں یا کمزوریوں کے بارے میں بات کرنا، ایک پوشیدہ گناہ ہے۔ اس میں انسان کے دل میں بدگمانی یا دوسروں کی عزت کی پامالی کا ارادہ ہوتا ہے، مگر یہ عمل عموماً لوگوں کی نظر سے چھپ کر کیا جاتا ہے۔ قرآن میں فرمایا" :وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا "(سورہ الحجرات:12)۔

ظلم کا ارادہ کرنا : کسی پر ظلم کرنے کی نیت رکھنا، چاہے وہ خیالی طور پر ہو، یا کسی کا حق مارنے کا سوچنا، یہ بھی ایک پوشیدہ گناہ ہے۔ اس میں انسان کا دل کسی

دوسرے کو نقصان پہنچانے کی نیت رکھتا ہے، لیکن یہ عمل فیزیکلی سامنے نہیں آتا۔

ریا یا دکھاوا کرنا : کسی اچھے عمل، عبادت یا کارِ خیر کو صرف لوگوں کے دکھانے کے لیے کرنا، یعنی اس کا مقصد اللہ کی رضا نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی تعریف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :إِنَّ الَّذِينَ يُرَاؤُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ "(سورہ ماعون:6-7)۔

حرام مال کی تمنا کرنا : کسی حرام مال کی خواہش کرنا یا اس کے بارے میں دل میں لالچ رکھنا، جیسے رشوت یا دھوکہ دہی کے ذریعے مال کمانا۔ یہ بھی ایک پوشیدہ گناہ ہے کیونکہ کوئی برا عمل ممکن ہے کہ ظاہر نہ ہو، لیکن دل میں اس کی تمنا رکھی جاتی ہے۔

دل میں کینہ یا بدگمانی رکھنا : کسی کے بارے میں بے بنیاد بدگمانیاں یا کینہ رکھنا، جیسے کسی شخص پر الزام لگانا یا اس کے بارے میں غلط سوچنا، یہ بھی ایک پوشیدہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا" :يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ "(سورہ الحجرات:12)۔

یہ سب پوشیدہ گناہ اس لیے خطرناک ہیں کہ ان کا اثر صرف فرد پر ہوتا ہے اور ان کے ذریعے انسان اپنی روحانیت اور اخلاقی حالت کو متاثر کرتا ہے۔ ایسے گناہ اگر نہ روکے جائیں تو انسان کے دل میں فساد پیدا ہوتا ہے، جو اس کے اچھے عملوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

تفرقہ انگیزی اور سامراجی مقاصد

نیو کالونیل طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لیے مختلف طریقے اپناتی ہیں۔ سب سے پہلے، وہ فرقہ وارانہ اور لسانی تقسیم کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ مختلف مسلمانوں کے گروپوں کے درمیان اختلافات کو اُبھار کر، وہ ان کے درمیان دشمنی پیدا کرتی ہیں تاکہ ایک متحد مسلم معاشرہ وجود میں نہ آسکے۔ ان طاقتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم دنیا کو داخلی طور پر کمزور کر دیں، تاکہ وہ عالمی سطح پر ایک مضبوط اور متحد موقف اختیار نہ کر سکیں۔

یہ طاقتیں وسائل اور حکومتی اداروں میں بھی تقسیم کی حکمت عملی اپناتی ہیں تاکہ مسلمانوں کے درمیان اعتماد کا فقدان ہو جائے۔ ان کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلم ممالک کی سیاسی و اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ڈالیں اور انہیں بیرونی طور پر بھی کمزور کر دیں۔ اس کے ذریعے وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے مسلم دنیا میں اختلافات اور کمزوری کا فائدہ اُٹھاتی ہیں۔

نیو کالونیل طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی کے ذریعے ایک ایسی حالت پیدا کرنا چاہتی ہیں جس میں مسلمان اپنے مشترکہ مسائل پر متفق نہ ہو سکیں اور ان کے اندر انتشار اور تقسیم کا ماحول برقرار رہے۔ اس طرح وہ اپنی حکمت عملیوں کو نافذ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور مسلم دنیا کو اپنے مفادات کے تابع کر لیتی ہیں۔

نیو کالونیل طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لیے ذہنی اور ثقافتی سطح پر بھی حملے کرتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے تاریخی ورثے اور ایک مشترکہ شناخت کو مٹا دینے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ وہ اپنے اصلی عقائد و اصولوں سے دور ہوں اور ان کی فطری یکجہتی کو کمزور کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ، وہ مختلف مسلم اقوام اور فرقوں کے درمیان فرقوں اور عقائد کی بنیاد پر اختلافات کو بڑھاوا دیتی ہیں، جیسے سنی اور شیعہ کے درمیان تنازعات کو اُبھار کر۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو اپنے داخلی اختلافات میں مشغول کر کے انہیں عالمی سطح پر موثر طور پر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتی ہیں۔

ایک اور اہم طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعے ایک خاص قسم کا فکری ماحول پیدا کرتی ہیں، جس سے نوجوانوں کو ایک

دوسرے کے خلاف اُکسانا اور شدت پسندی کی طرف راغب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان طاقتوں کا مقصد صرف داخلی اختلافات کو بڑھانا نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا ذہنی خلاء پیدا کرنا بھی ہوتا ہے جس میں وہ اپنی اجتماعی جدوجہد کے بجائے فردی طور پر ٹوٹ کر رہ جائیں۔

نیو کالونیل طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی کے ذریعے ایک نفسیاتی جنگ بھی لڑ رہی ہوتی ہیں تاکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تصور بیٹھ سکے کہ ان کے اندر اختلافات بہت زیادہ ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس قسم کی حکمت عملی نہ صرف مسلم ممالک کے سیاسی استحکام کو متاثر کرتی ہے بلکہ یہ مسلم دنیا کی عالمی سطح پر آواز کو بھی دبانے میں مدد دیتی ہے۔ ان طاقتوں کے لیے یہ تفرقہ انگیزی ایک مستقل ہتھیار بن جاتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی عالمی حکمت عملیوں کو زیادہ موثر طریقے سے نافذ کر پاتی ہیں۔

تفرقہ انگیزی کے نتیجے میں مسلمان معاشروں میں کئی قسم کے فساد جنم لیتے ہیں جو نہ صرف داخلی انتشار کا سبب بنتے ہیں بلکہ ان کے اجتماعی استحکام کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جب مسلمان مختلف فرقوں یا قوموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، تو یہ ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ نتیجے کے

طور پر، معاشرتی ہم آہنگی کمزور پڑ جاتی ہے، اور افراد کی توجہ اپنے مشترکہ مسائل کے بجائے آپس کے اختلافات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف فکری اور نظریاتی خلفشار بڑھتا ہے بلکہ ایک ہی کمیونٹی کے اندر شدید نوعیت کی تصادم اور فسادات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تصادم کئی صورتوں میں خودکش بمباری، فرقہ وارانہ فسادات، اور دہشت گردی کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں، جس سے معاشرتی امن تباہ ہو جاتا ہے اور لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے۔

تفرقہ انگیزی کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ یہ مسلم معاشروں کی سیاسی قوت کو بھی کمزور کرتی ہے۔ جب لوگ اپنے فرقہ وارانہ یا نسلی اختلافات میں ملوث ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنی اجتماعی ترقی اور ایک مضبوط حکومتی نظام کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کے بجائے اپنے فرقوں یا گروپوں کی حمایت میں متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف حکومتی استحکام متاثر ہوتا ہے بلکہ یہ بیرونی قوتوں کے لیے مداخلت کا موقع فراہم کرتا ہے، جو داخلی انتشار کا فائدہ اٹھا کر اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتی ہیں۔ اس طرح مسلم معاشروں میں ایک کمزور داخلی سٹرکچر پیدا ہوتا ہے جو عالمی سطح پر ان کی پوزیشن کو کمزور کر دیتا ہے۔

تفرقہ انگیزی کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر ایک عدم اعتماد کی فضا بھی پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور یکجہتی کے بجائے شک و شبہات کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں۔ اس سے معاشرتی ترقی، علم و تحقیق، اور معاشی ترقی میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ مسلم اقوام کی آپس میں فکری ہم آہنگی اور تعاون کی کمی کے باعث وہ عالمی مسائل کے حل میں بھی مؤثر کردار ادا نہیں کر پاتیں۔ ان حالات میں، نہ صرف داخلی نقصان ہوتا ہے بلکہ مسلم دنیا عالمی سطح پر بھی اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کو کھو دیتی ہے۔

تفرقہ انگیزی مسلمان معاشروں کی معیشت اور ثقافت و تہذیب پر گہرے منفی اثرات ڈالتی ہے۔ جب مسلمان مختلف فرقوں یا گروپوں میں بٹ جاتے ہیں، تو ان میں آپس کا تعاون اور یکجہتی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تقسیم معاشی ترقی کے لیے ایک بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے کیونکہ افراد اور گروہ اپنے مفادات کو فوقیت دینے لگتے ہیں اور اجتماعی مقاصد کے حصول میں تعاون کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس نتیجے میں تجارتی روابط، سرمایہ کاری، اور دیگر اقتصادی سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں، جس سے پورے معاشی نظام کو نقصان پہنچتا ہے۔ معاشرتی سرمایہ، جو کہ ایک ملک کی ترقی کا اہم حصہ ہے، ضائع ہو جاتا

ہے کیونکہ لوگ اپنی ہی کمیونٹی کے مفاد کے بجائے اپنے فرقے کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔

ثقافت اور تہذیب کی سطح پر بھی تفرقہ انگیزی مسلمانوں کی مشترکہ وراثت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مسلمانوں کی ثقافت ہزاروں سالوں سے ایک متنوع اور غنی تاریخ پر مشتمل ہے، جس میں مختلف خطوں، اقوام اور فرقوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک عظیم تہذیب پروان چڑھ چکی ہے۔ لیکن جب مسلمان فرقوں میں بٹ جاتے ہیں تو یہ مشترکہ ورثہ اور تہذیبی اقدار خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ اس تفرقے کی وجہ سے مختلف ثقافتی روایات ایک دوسرے سے کٹ جاتی ہیں اور ہر فرقہ اپنی علیحدہ ثقافتی شناخت بنانے کی کوشش کرتا ہے، جس سے مجموعی طور پر مسلمانوں کی ثقافت میں یکجہتی اور ہم آہنگی کم ہو جاتی ہے۔

مزید یہ کہ تفرقہ انگیزی مسلمانوں کی علمی و فکری ترقی کو بھی محدود کرتی ہے۔ جب مختلف فرقوں یا گروپوں کے درمیان تصادم اور تنازعات بڑھتے ہیں، تو لوگ آپس میں معلومات کا تبادلہ اور مشترکہ منصوبوں پر کام کرنے کے بجائے اپنے اختلافات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس سے تعلیمی اداروں، تحقیقاتی اداروں اور ثقافتی سرگرمیوں میں کمی آتی ہے، جو کسی معاشرے کی ترقی کے لیے

ضروری ہیں۔ اس طرح تفرقہ انگیزی مسلمانوں کی معیشت اور ثقافت کو جمود کا شکار بنا دیتی ہے اور انہیں عالمی سطح پر اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔

نیوکالونیل طاقتیں مسلمانوں میں شیعوں کو کافر باور کرانے کی حکمت سے مختلف فوائد حاصل کرتی ہیں، جو ان کے عالمی مفادات کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس قسم کی فرقہ واریت اور تفرقہ انگیزی سے مسلمان معاشروں کی یکجہتی ٹوٹتی ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ داخلی طور پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ جب مسلمان اپنے ہی بھائیوں کو کافر سمجھتے ہیں، تو ان میں آپس کے تعلقات میں تناؤ آجاتا ہے اور وہ اپنے مشترکہ مسائل کے حل کے بجائے فرقہ وارانہ لڑائیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ اس سے نیوکالونیل طاقتوں کو ان معاشروں میں مداخلت کا موقع ملتا ہے، کیونکہ ایک تقسیم شدہ اور کمزور معاشرہ عالمی سطح پر مؤثر طریقے سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نیوکالونیل طاقتیں اس تفرقہ انگیزی کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی استحکام کو متاثر کرتی ہیں۔ جب مسلمان فرقہ وارانہ تصادم میں مشغول ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنے حکومتی نظام کو مستحکم کرنے اور معاشی ترقی

پر توجہ دینے کے بجائے داخلی لڑائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس سے ان طاقتوں کو اپنے اقتصادی مفادات کو آگے بڑھانے کا موقع ملتا ہے، کیونکہ داخلی انتشار کے دوران یہ طاقتیں قدرتی وسائل، تجارت، اور دیگر اہم شعبوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

نیوکالونیل طاقتیں اس حکمت عملی سے مسلمانوں کی عالمی سطح پر اتحاد اور تعاون کو کمزور کرتی ہیں۔ شیعہ سنی اختلافات کو بڑھاوا دے کر، وہ مسلمانوں کے درمیان فکری ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتی ہیں، جس سے ان کی عالمی پوزیشن متاثر ہوتی ہے۔ اس طرح، نیوکالونیل طاقتیں تفرقہ انگیزی کے ذریعے نہ صرف مسلمان معاشروں کو کمزور کرتی ہیں بلکہ انہیں عالمی سطح پر ایک غیر مؤثر اور پسماندہ قوت بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

علمی دنیامیں سامراجی استحصال کے نمونے

دنیا کی تاریخ میں بہت سے نابغہ روزگار سائنسدان اور مفکرین ایسے ہیں جنہیں ان کے علم و ہنر اور عوامی فلاح کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے سبب قتل کر دیا گیا۔ ان کی موت کو بعض اوقات نامعلوم وجوہات یا غیر متعلقہ قاتلوں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تاکہ اصلی سازشوں اور قاتلوں کو پوشیدہ رکھا جا سکے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا پر قابض وہ سرمایہ دار اور نیو کالونیل (Neo-Colonial) طاقتیں، جو امریکہ اور یورپ کے صنعتی ڈھانچوں کو چلا رہی ہیں، ان نابغوں سے خوفزدہ تھیں۔ یہ سائنسدان اور موجد جب ان طاقتوں کے مالی مفادات کے سامنے جھکنے کے بجائے عوامی بھلائی کو اپنی سائنس و ٹیکنالوجی کا ہدف بناتے تھے تو انہیں ان طاقتوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

ان موجدین میں سے سب سے نمایاں نام **نکولا ٹیسلا** کا ہے، جس نے بجلی اور توانائی کے میدان میں انقلابی تحقیقات کیں۔ ٹیسلا کے نظریات اور اختراعات نے دنیا کو مفت اور لامحدود توانائی فراہم کرنے کا امکان پیدا کیا تھا، جو نیو کالونیل

سرمایہ داروں کے مالی مفادات کو شدید نقصان پہنچا سکتا تھا۔ لیکن ایڈیسن جیسے سرمایہ داروں کے آلہ کار اور ان کے نیو کالونیل آقاؤں نے ٹیسلا کو مختلف طریقوں سے مالی اور علمی استحصال کا نشانہ بنایا اور بالآخر انہیں بربادی اور مظلومیت کی موت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کا میدان نہیں تھا جہاں نابغہ روزگار شخصیات کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ سیاست اور معیشت کے میدان میں بھی ایسے کئی مغربی رہنما تھے جنہوں نے نیوکالونیل سرمایہ دارانہ کارپوریشنوں کی اجارہ داریوں اور غلیظ سیاست کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں **ابراہم لنکن، جان ایف کینیڈی،** اور **شہزادی ڈیانا** جیسے عالمی رہنما شامل ہیں، جنہوں نے دنیا کو ایک بہتر اور عادلانہ نظام دینے کی کوشش کی، لیکن ان کی انقلابی سوچ اور عدل کی خواہش کو ظلم کے ذریعے کچل دیا گیا۔

آج کا عالمی منظرنامہ یہ ہے کہ فلسفہ، تعلیم، سیاست، میڈیا، فنون لطیفہ، معیشت، اور دیگر سماجی فلاح کے بیشتر ادارے نیو کالونیل طاقتوں کے ایجنڈے پر چل رہے ہیں۔ ان اداروں کے زیادہ تر افراد یا تو خوف کے زیر اثر ہیں یا لالچ کا شکار ہو چکے ہیں، اور یہی صورتحال دنیا بھر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

موجودہ دور میں واحد مؤثر مزاحمت جو ان نیو کالونیل طاقتوں کے خلاف بھرپور انداز میں کھڑی ہے، وہ **ایران** ہے۔ ایران ان استعماری قوتوں کے خلاف ایک ایسی جنگ لڑ رہا ہے جو تاریخ کے تمام مظلومین نابغوں کے انتقام کی جنگ ہے۔ ایران کی یہ جدوجہد ایک ایسی کوشش ہے جس کا مقصد ان سامراجی طاقتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے، اور اس مقصد کے لیے دنیا بھر کے حق پرستوں کی دعائیں اور مدد درکار ہیں۔

یہ نیو کالونیل طاقتیں صرف مشرق وسطیٰ کو نہیں بلکہ امریکہ، یورپ، کینیڈا، آسٹریلیا، چین، جاپان، کوریا اور روس جیسے بڑے بڑے ممالک کو بھی اپنی ستمگری اور ظلم کے ذریعے نشانہ بنا رہی ہیں۔ ان کی سامراجی پالیسیوں نے عالم انسانیت کو ایک بہت بڑی تباہی میں دھکیل دیا ہے۔ لیکن آج دنیا کا ہر حق پرست اور بابصیرت انسان ان کے خلاف ایک مجاہد کی طرح کھڑا ہے۔

ہمیں اجتماعی طور پر ان طاقتوں کے خلاف ایک مضبوط اور منظم جدوجہد کی ضرورت ہے تاکہ انسانیت کو ان کی بربریت سے نجات دلائی جاسکے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نیو کالونیل طاقتیں صرف معاشی مفادات اور صنعتی اجارہ داریوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا قبضہ فلسفہ، تعلیم، ثقافت، اور میڈیا جیسے

کلیدی شعبوں پر بھی ہے۔ یہ طاقتیں عالمی سطح پر سوچنے اور سمجھنے کے عمل کو بھی کنٹرول کر رہی ہیں۔ تعلیمی نظام کو اس طرح ڈھال دیا گیا ہے کہ نوجوان نسل کو حقائق سے دور رکھتے ہوئے انہیں محض ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت تربیت دی جائے، تاکہ وہ انہی طاقتوں کی غلامی میں مبتلا رہیں اور کوئی سوال اٹھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔

فلسفہ اور **تعلیم** کا بنیادی مقصد انسان کو آزاد خیالی، تنقیدی سوچ، اور حق و باطل کے درمیان تمیز سکھانا تھا، مگر آج کا نظام تعلیم ان اعلیٰ مقاصد کو بھلا کر انسانیت کو ایک غلامی کی زنجیر میں جکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں، جو کبھی علم و دانش کا مرکز ہوا کرتی تھیں، اب نیو کالونیل طاقتوں کے زیر اثر ایسے کورسز اور نظریات سکھا رہی ہیں جو ان کے مالی اور سیاسی مفادات کی حفاظت کریں۔

اسی طرح **میڈیا**، جو کہ عوامی شعور اور حقائق کو دنیا کے سامنے لانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا، اب ان طاقتوں کا غلام بن چکا ہے۔ یہ میڈیا اکثر سچائی کو چھپاتا ہے اور ایک جھوٹا بیانیہ تشکیل دیتا ہے تاکہ عوام کو حقائق سے دور رکھا جائے۔ میڈیا کے بڑے ادارے صرف ان معلومات کو عوام تک پہنچاتے ہیں جو ان نیو کالونیل

قوتوں کے ایجنڈے کو فروغ دیں، اور جو بھی ان کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، اسے یاتوخاموش کر دیاجاتا ہے یاغلط معلومات کی مدد سے بدنام کر دیاجاتا ہے۔

فن اور **ادب** کو بھی ان طاقتوں نے اپنے مفادات کے لیے ہتھیار بنالیا ہے۔ فلموں،موسیقی، اور دیگر فنون لطیفہ کے ذریعے عوام کوایسے بیانیے دیے جارہے ہیں جو ان کی اصل حیثیت اور حقوق سے بے خبر رکھیں۔ فلمی اورادبی دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ان کے ایجنڈے کو فروغ دیتے ہیں، جبکہ حقیقی آرٹسٹ اور دانشور جو عوامی فلاح کے بارے میں سوچتے ہیں، انہیں پس پشت ڈال دیاجاتا ہے۔

آج کی **معیشت** کاحال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دنیا کے بڑے بینک، مالیاتی ادارے اور کارپوریشنز ان نیو کالونیل طاقتوں کے زیر اثرہیں، جو اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لیے عوام کو قرضوں اور استحصال کے جال میں پھنسا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کرنا اور عالمی سطح پر غربت، نابرابری اور بدامنی کو فروغ دینا ہے تاکہ وہ اپنے مفادات کو مزید مضبوط کر سکیں۔

اس تمام صورتحال میں **ایران** کی قیادت ایک حقیقی مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آئی ہے۔ ایران نے نہ صرف ان نیو کالونیل طاقتوں کو چیلنج کیا ہے بلکہ مظلوم اقوام کے حقوق کی بحالی کے لیے عملی اقدامات بھی اٹھائے ہیں۔ ایران کی اس جدوجہد کو محض ایک جنگی یا عسکری معرکہ سمجھنا درست نہیں ہو گا، بلکہ یہ ایک فکری، نظریاتی، اور روحانی جنگ بھی ہے جو حق اور باطل کے درمیان ہو رہی ہے۔

ایران کی اسلامی قیادت نے دنیا کے ہر مظلوم اور دبے کچلے انسان کے لیے ایک امید کی کرن پیدا کی ہے۔ یہ قیادت قرآن اور سنت نبوی کے اصولوں کے مطابق انسانیت کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے میدان میں اتری ہے۔ وہ تمام مظلومین، خواہ وہ کسی بھی قوم، مذہب یا ملت سے تعلق رکھتے ہوں، ایران کی اس جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھتے ہیں۔ اس لیے دنیا کے ہر حق پرست انسان کو اس تحریک کا حصہ بننا چاہیے اور ان نیو کالونیل طاقتوں کو شکست دینے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

دنیا کو درپیش موجودہ حالات میں، ہر باضمیر اور حق پرست انسان کا فرض ہے کہ وہ ان سازشوں کا مقابلہ کرے اور عالم انسانیت کی بقا اور فلاح کے لیے اپنی آواز

بلند کرے۔ یہ جنگ صرف ایران کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی جنگ ہے، اور اس میں کامیابی کے لیے ہمیں ایک اجتماعی اور عالمی سطح پر منظم جدوجہد کرنی ہوگی۔

یہ وہ وقت ہے جب ہم سب کو اپنی آنکھیں کھول کر نیو کالونیل طاقتوں کے خلاف کھڑا ہونا ہوگا، تاکہ آنے والی نسلیں ان کے ظلم و ستم سے آزاد ہو سکیں اور ایک بہتر، عادلانہ اور پرامن دنیا میں سانس لے سکیں۔

مسلم نوجوان نسل کی بے راہ روی میں سامراجی طاقتوں کا کردار

مسلم نوجوان نسل کی بے راہ روی میں نو آبادیاتی طاقتوں کا کردار انتہائی گہرا اور پیچیدہ ہے۔ یہ طاقتیں اپنے معاشی، سیاسی، اور ثقافتی تسلط کے ذریعے مسلم دنیا کو زیر اثر رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے عزائم کا بنیادی مقصد مسلم اقوام کی روایتی اقدار اور اسلامی تہذیب کو ختم کر کے مغربی ثقافت اور طرزِ زندگی کو فروغ دینا ہے۔ اس کے لیے مختلف حکمت عملیوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

تعلیمی نظام پر اثر انداز ہونا ان کا اہم حربہ ہے۔ نصابی مواد سے اسلامی تاریخ اور تعلیمات کو یا تو نکال دیا گیا یا کمزور انداز میں پیش کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نوجوان اپنی تہذیب سے ناواقف ہو گئے اور فکری طور پر مغرب زدہ ہو گئے۔ تعلیم کا مقصد صرف مغربی نظریات کو اپنانا بن گیا، جس سے فکری غلامی پیدا ہوئی۔ تعلیمی نظام بھی سامراجی منصوبے کا ایک اہم حصہ ہے۔ مسلم ممالک میں زیادہ تر نصاب اور تعلیمی ڈھانچے مغربی ماڈلز پر مبنی ہیں، جن میں اسلامی تاریخ، تہذیب، اور اخلاقیات کو یا تو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے یا پھر سطحی انداز میں پیش کیا

گیا ہے۔ اس کے بر عکس، مغربی مفکرین اور ان کے نظریات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، جس سے نوجوانوں کے ذہنوں میں ایک قسم کا فکری غلامی کا بیج بویا جاتا ہے۔

میڈیا اور تفریحی صنعت کا استعمال بھی ان طاقتوں کی ایک مؤثر حکمت عملی ہے۔ مغربی فلموں، ڈراموں، گانوں اور سوشل میڈیا کے ذریعے غیر اخلاقی طرزِ زندگی اور مغربی اقدار کو عام کیا گیا۔ یہ مواد نوجوانوں کے اخلاقی اصولوں کو کمزور کرتا ہے اور انہیں اپنی اقدار سے دور کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ، فرقہ واریت اور علاقائی تعص بات کو ہوا دے کر معاشرتی اتحاد کو کمزور کیا گیا۔ مغربی طرزِ زندگی کو پر کشش انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں عام طور پر اسلامی اقدار کو دقیانوسی اور پسماندہ دکھایا جاتا ہے، جبکہ مغربی رویوں کو ترقی اور آزادی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً، مسلم نوجوان اپنے دین اور ثقافت سے شرمندگی محسوس کرنے لگتے ہیں اور مغربی طرزِ زندگی کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے غیر ضروری رجحانات اور بے مقصد مواد کو فروغ دیا گیا، جس سے نوجوانوں کی تعلیمی اور اخلاقی کارکردگی متاثر ہوئی۔

سوشل میڈیا نے وقت کے ضیاع اور غیر اخلاقی رویوں کو عام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

یہ حکمت عملیاں مسلم نوجوانوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اسلامی اخلاقیات سے دوری، فکری انتشار، اور تعلیمی ناکامی ان اثرات کے نمایاں پہلو ہیں۔ نوجوانوں میں اعتماد کی کمی اور اپنے عقیدے کے بارے میں احساسِ کمتری پیدا ہو گئی ہے۔ نتیجتاً، خاندانی نظام کمزور ہو گیا اور معاشرتی مسائل بڑھ گئے۔

سامراجی طاقتوں کا کردار مسلم نوجوان نسل کی بے راہ روی میں نہایت گہرا اور پیچیدہ ہے۔ یہ طاقتیں براہِ راست قبضے کے بجائے جدید ذرائع استعمال کر کے مسلم معاشروں پر اپنے اثر و رسوخ کو بڑھاتی ہیں اور نوجوانوں کی ذہنی، روحانی، اور ثقافتی تربیت کو متاثر کرتی ہیں۔ ان طاقتوں کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اصل شناخت سے دور کر کے مغربی نظریات اور اقدار کو مسلط کیا جائے تاکہ وہ ذہنی طور پر غلام رہیں اور ان کے وسائل پر تسلط برقرار رکھا جا سکے۔

معاشی استحصال بھی سامراجی طاقتوں کا ایک اہم پہلو ہے۔ مسلم ممالک کو مغربی مالیاتی اداروں کے قرضوں میں جکڑ کر ان کی اقتصادی آزادی کو محدود کیا جاتا

ہے۔ اس کے نتیجے میں بے روزگاری، غربت، اور سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جو نوجوانوں کو جرم، منشیات، اور دیگر غیر اخلاقی سرگرمیوں کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔

سامراجی طاقتیں تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر بھی عمل کرتی ہیں۔ فرقہ واریت، نسلی تعصبات، اور قومی خودغرضیوں کو ہوا دے کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان اتحاد اور مشترکہ اسلامی شناخت کے بجائے فرقہ وارانہ اور علاقائی جھگڑوں میں الجھ جاتے ہیں۔

یہ طاقتیں غیر محسوس انداز میں نفسیاتی جنگ بھی لڑتی ہیں۔ مسلمانوں کے عظیم ماضی کو دھندلا کر کے ان میں مایوسی اور احساس کمتری پیدا کیا جاتا ہے۔ ان طاقتوں کے زیر اثر، نوجوان اپنی قابلیت اور اپنے دین پر اعتماد کھو دیتے ہیں اور مغربی افکار کو اپنانے کو اپنی ترقی کا واحد راستہ سمجھنے لگتے ہیں۔

مختصر یہ کہ سامراجی طاقتوں کا مقصد مسلمانوں کو فکری، ثقافتی، اور معاشی طور پر اتنا کمزور کرنا ہے کہ وہ عالمی سطح پر کوئی مؤثر کردار ادا نہ کر سکیں۔ یہ ایک مستقل

چیلنج ہے جس کا مقابلہ صرف ایک مضبوط اسلامی نظریے، متحدہ قیادت، اور تعلیمی، ثقافتی، اور اقتصادی میدانوں میں خود مختاری کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

اس صورتحال سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جائے اور نوجوانوں کو اپنی تہذیب سے دوبارہ جوڑا جائے۔ تعلیمی نظام میں اسلامی اقدار کی شمولیت اور میڈیا کے ذریعے مثبت مواد کی ترویج کی جانی چاہیے۔ مسلم اقوام کو معاشی اور سیاسی خود مختاری کی جانب بڑھنا ہو گا اور نوجوانوں کو اسلامی طرز قیادت کی تربیت فراہم کرنی ہو گی۔

یہی راستہ مسلم نوجوان نسل کی اصلاح اور امت مسلمہ کی تعمیر و ترقی کے لیے موزوں ہے۔ نوجوانوں کو قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فراہم کی جائے تاکہ وہ اپنی اصل شناخت کو پہچان سکیں اور اپنے معاشرے میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

مزید برآں، مسلم نوجوانوں کو مغربی ثقافتی یلغار سے بچانے کے لیے متبادل اسلامی میڈیا اور تفریحی صنعت کو فروغ دینا بے حد ضروری ہے۔ ایسا مواد تیار کیا جائے جو نوجوانوں کے دلوں میں ایمان کی مضبوطی، اسلامی تعلیمات کی محبت، اور اپنی تہذیب پر فخر پیدا کرے۔ میڈیا کو ہتھیار کے طور پر استعمال

کرتے ہوئے مسلمانوں کی عظیم شخصیات، تاریخی واقعات اور اخلاقی قدروں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں، تعلیمی اداروں کو ایسا ماحول فراہم کرنا چاہیے جہاں نوجوان نہ صرف جدید سائنسی اور فنی علوم میں مہارت حاصل کریں بلکہ ان کے ساتھ اسلامی اقدار بھی پروان چڑھیں۔ اساتذہ کو کردار سازی پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور انہیں نوجوانوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت کا حصہ بننا چاہیے۔

عصرِ حاضر کے چیلنجز کے پیش نظر، نوجوانوں کو سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے مثبت استعمال کی تربیت دی جائے۔ ان میں تجزیاتی اور تنقیدی سوچ کی صلاحیت پیدا کی جائے تاکہ وہ جھوٹے پروپیگنڈے اور گمراہ کن مواد سے متاثر نہ ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ نوجوانوں کو جدید ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ امت مسلمہ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں اور مغربی تسلط کو چیلنج کر سکیں۔

مزید یہ کہ، مسلم اقوام کو معاشی خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ نوآبادیاتی طاقتوں کی محتاجی ختم ہو۔ ایک مضبوط معیشت نوجوانوں کو بہتر مواقع فراہم کر سکتی ہے اور انہیں غیر اخلاقی سرگرمیوں سے بچا سکتی ہے۔

اسلامی بینکاری اور تجارت کے اصولوں کو فروغ دے کر معیشت کو استحکام دیا جا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں نوجوانوں کو اسلامی طرزِ زندگی اپنانے کی ترغیب ملے گی۔

آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ مسلم دنیا کو اتحاد کی طرف گامزن ہونا ہو گا۔ نوجوانوں کو فرقہ واریت اور علاقائی تعصبات سے نکال کر امت واحدہ کے تصور سے روشناس کروانا ضروری ہے۔ علماء، رہنما، اور تعلیمی ماہرین مل کر ایک مشترکہ حکمت عملی وضع کریں جو تمام مسلم ممالک کے نوجوانوں کے لیے یکساں ہو۔

نوجوانوں کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ امت مسلمہ کے معمار ہیں اور ان کی ذمہ داری صرف اپنی ذات یا خاندان تک محدود نہیں بلکہ پوری امت کی ترقی اور بقا کے لیے اہم ہے۔ انہیں اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی گزارنے کا شعور دیا جائے تاکہ وہ مغربی یلغار کا نہ صرف سامنا کر سکیں بلکہ اسے ناکام بنا کر اسلامی تہذیب کی عظمت کو دوبارہ زندہ کر سکیں۔

شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلافات کا جائزہ

شیعہ اور اہل سنت کے درمیان بعض اہم اختلافات ہیں جن کا تعلق بنیادی عقائد اور فقہ سے ہے۔ ان اختلافات کو عقل اور منطق کی روشنی میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے:

- **امامت کا عقیدہ :** اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کسی خاص فرد کو امام منتخب کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور خلافت کا عمل اجماع اور شوراکے ذریعے انجام پانے کا تھا۔ شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام کا انتخاب اللہ کی مرضی اور رہنمائی کے تحت ہونا چاہیے تھا، اور امام معصوم ہوتا ہے۔
    - **عقلی دلیل:**

اگر خلافت و رہنمائی کسی انسان کے اختیار میں چھوڑ دی جاتی، تو دین میں اختلافات اور غلط فہمیوں کا پیدا ہونا لازمی تھا، کیونکہ لوگوں کی عقل اور فہم میں فرق ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے معصوم امام کا تعین اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ دین کی تشریح اور پیروی ہمیشہ صحیح راستے پر ہو۔

- **توحید و عدل کی تشریح :** اہل سنت اور شیعہ میں توحید اور عدل کی تفصیلات میں بعض اختلافات ہیں، جیسے کہ اللہ کے اوصاف کا احاطہ کرنے کی حدود۔
  - **عقلی دلیل:**

شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کی صفات میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی، اور اللہ کا عدل ہر وقت اور ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ اس کے مطابق، اگر کوئی فرد اللہ کی حکمت اور عدل کے برخلاف عمل کرے، تو یہ اللہ کی کامل صفات سے انحراف ہو گا، جیسے کہ امامت کے انتخاب میں بھی مکمل عدل کی ضرورت ہے۔

- **خلافت کا تعین :** اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ خلافت کا فیصلہ شورا کے ذریعے کیا گیا، جبکہ شیعہ عقیدہ ہے کہ امام علی علیہ السلام کا خلافت کا حق تھا اور یہ انتخاب اللہ کی طرف سے تھا۔
    - **عقلی دلیل:**

اگر انسانوں کو اللہ کی رہنمائی کے بغیر خلافت کی اہمیت کا تعین کرنے کی آزادی دی جاتی، تو نتیجتاً مختلف گروہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے۔ اللہ کی طرف سے منتخب رہنما (امام) کی ضرورت اس لیے تھی تاکہ دین کی اصل روح اور پیغام کو صحیح طریقے سے برقرار رکھا جاسکے۔

- **مقامِ اہل بیت :** اہل سنت میں امام علی علیہ السلام اور اہل بیت کا مقام اور ان کی رہنمائی کو دوسرے صحابہ کے برابر سمجھا جاتا ہے، جب کہ شیعہ اہل بیت کو نہ صرف اہم سمجھتے ہیں بلکہ انہیں معصوم اور کامل رہنمائی کے حامل قرار دیتے ہیں۔

- **عقلی دلیل:**

چونکہ اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ترین افراد تھے اور قرآن و حدیث میں ان کا خاص مقام ذکر کیا گیا ہے، اس لیے ان کا رہنمائی میں اہم کردار ہونا عقلی طور پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی معصومیت اور علم کا ہونا اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ انہیں دین کی تشریح میں اولیت دی جانی چاہیے۔

- **تقدیر کا عقیدہ :** اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی تقدیر ہر چیز پر غالب ہے اور انسان کی آزادی کو محدود نہیں کرتا، جبکہ شیعہ تقدیر کے ساتھ ساتھ انسان کی آزادی اور انتخاب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔
  - **عقلی دلیل:**

اگر انسان کے پاس اپنی مرضی اور ارادے کا اختیار نہ ہو، تو اس کی جزا و سزا کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ شیعہ عقیدہ میں تقدیر اور انسان کے اختیار کا توازن اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ

انسان اپنی کوششوں اور نیتوں کے مطابق جزا یا سزا کا حق دار ہو گا۔

- **معصومیت کا تصور :** اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ فقط نبی معصوم ہوتا ہے، جبکہ شیعہ عقیدہ ہے کہ امام بھی معصوم ہوتے ہیں، یعنی وہ گناہ اور خطا سے پاک ہوتے ہیں۔
    - **عقلی دلیل:**

اگر امام بھی معصوم نہ ہو تو دین کی صحیح تشریح اور رہنمائی میں غلط فہمی کا خطرہ رہتا ہے۔ امام کی معصومیت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ دین میں کسی قسم کی تحریف نہ ہو، کیونکہ وہ اللہ کے منتخب فرد ہوتے ہیں اور ان سے کوئی غلط عمل سرزد نہیں ہوتا۔

- **عید غدیر کا واقعہ :** اہل سنت میں عید غدیر کو معمولی دن سمجھا جاتا ہے، جب کہ شیعہ اسے ایک انتہائی اہم دن قرار دیتے ہیں، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علی علیہ السلام کو اپنا جانشین منتخب کیا۔

- ### عقلی دلیل:

اگر نبی صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علی علیہ السلام کو اس اہم موقع پر منتخب کیا، تو یہ یقیناً اللہ کی طرف سے ایک حکم اور ہدایت تھی۔ اس دن کا معاملہ اور اس میں دی گئی رہنمائی کا عقلی طور پر یہ تقاضا ہے کہ اہل بیت اور امام علی علیہ السلام کا مقام اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جتنا بعض دیگر مسلمان سمجھتے ہیں۔

- **تقلید کا عقیدہ :** اہل سنت میں ہر فرد کو اپنی عقل کے مطابق اجتہاد کرنے کی آزادی دی جاتی ہے، جبکہ شیعہ میں تقلید کا نظام موجود ہے، یعنی عوام کو ایک عالم دین (مرجع تقلید) کی رہنمائی کی پیروی کرنی چاہیے۔

- ### عقلی دلیل:

تقلید کا نظام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ دین کی پیچیدہ مسائل میں صحیح رہنمائی حاصل ہو، کیونکہ ہر شخص کی عقل اور فہم ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس سے انسانوں کو ایک

درست اور مستند رہنمائی ملتی ہے جس سے وہ دین کی صحیح تفہیم حاصل کر سکتے ہیں۔

- **آگاہی اور علم کا مرکزی مقام :** اہل سنت میں دینی علوم کو زیادہ تر صحابہ اور علماء تک محدود سمجھا جاتا ہے، جبکہ شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ اہل بیت اور امام علی علیہ السلام کو علم کا خصوصی اور مکمل مقام حاصل ہے۔
  - **عقلی دلیل:**

چونکہ امام علی علیہ السلام اور اہل بیت نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی افراد تھے اور وہ اللہ کی خاص رہنمائی اور علم سے مستفید تھے، ان کا علم ہر لحاظ سے کامل تھا۔ اس بات کو عقلی طور پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ دین کے تمام مسائل کی گہرائی میں جا کر صحیح تشریح کر سکتے تھے۔

- **روحانیت اور دنیاوی امور کا توازن :** اہل سنت اور شیعہ میں روحانیت اور دنیاوی امور کے توازن پر بھی اختلافات ہیں۔ اہل سنت میں دنیاوی زندگی اور روحانیت کے درمیان توازن رکھا جاتا ہے، جبکہ

شیعہ مسلمانوں کے نزدیک امام کی زندگی کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں میں انسانوں کی رہنمائی ہے۔

- **عقلی دلیل:**

امام معصوم نہ صرف دین کی روحانی رہنمائی کرتے ہیں بلکہ وہ دنیاوی مسائل میں بھی رہنمائی فراہم کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی زندگی دونوں جہانوں میں کامیاب ہو۔ یہ عقلی طور پر درست ہے کہ دین کے تمام پہلوؤں کی صحیح رہنمائی ہونی چاہیے تاکہ انسان مکمل طور پر ہدایت پا سکے۔

- **موت کے بعد کے معاملات :** اہل سنت اور شیعہ کے درمیان موت کے بعد کی عبادات اور عقائد میں بھی فرق ہے، مثلاً شیعہ میں اہل بیت اور اماموں سے توسل کا عقیدہ ہے، جبکہ اہل سنت میں توسل کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔
  - **عقلی دلیل:**

اگر انسان اپنی عبادات میں اللہ کے ساتھ دیگر معصوم افراد کے ذریعے مدد لیتا ہے، تو اس میں کوئی منطقی خرابی نہیں

ہے۔ امام اور اہل بیت کو اللہ کی طرف سے ان کی قربانیوں اور علم کے باعث ایک خاص مقام دیا گیا ہے، اور ان سے مدد طلب کرنا ایک جائز عمل سمجھا جا سکتا ہے۔

- **جہاد اور فوجی قیادت** :اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاد اور فوجی قیادت میں امیر المؤمنین (خلیفہ) کا انتخاب عوامی اجماع سے ہوتا ہے، جب کہ شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ اس کا حق فقط امام معصوم کو حاصل ہوتا ہے۔
  - **عقلی دلیل:**

اگر امت کے رہبر کی قیادت میں کوئی غلطی ہو، تو دین کی تعلیمات میں بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ امام معصوم کی رہنمائی میں جنگوں اور قیادت کے اصول درست اور متوازن ہوں گے، کیونکہ امام کی معصومیت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ غلط فیصلے نہیں کرے گا۔

یہ نکات اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ شیعہ اور اہل سنت کے اختلافات نہ صرف تاریخی یا ثقافتی مسائل ہیں، بلکہ ان کی عقلی اور منطقی بنیادیں بھی ہیں۔ شیعہ عقیدہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ دین کی صحیح رہنمائی کے لیے معصوم امام کا

انتخاب ضروری ہے، تاکہ دین میں تحریف اور غلط فہمیوں کا امکان نہ ہو۔ اس کے علاوہ، شیعہ عقیدہ میں اہل بیت اور اماموں کی رہنمائی کا مقام اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ دین کی اصل حقیقت اور تشریح ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اور اس کے صحیح پیغام کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے، تاکہ انسانوں کو مکمل اور غلطی سے پاک رہنمائی فراہم کی جا سکے۔

شیعہ اصولِ دین عقل و منطق کی روشنی میں

شیعہ اصول دین (توحید، عدل، نبوت، امامت، اور قیامت) کو عقلی اور منطقی دلائل کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

1۔ توحید (اللہ کی وحدانیت):

توحید کا مطلب ہے کہ اللہ ایک ہے اور کوئی اس کے برابر نہیں۔

• عقلی دلیل: کائنات کے نظام میں ہم ایک مکمل ہم آہنگی اور ترتیب دیکھتے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق ایک ہی ہے۔ اگر دو یا زیادہ خدا ہوتے تو ان کے اختلافات سے کائنات میں بے ترتیبی پیدا ہوتی۔

• قرآنی دلیل: "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" (سورہ انبیاء: 22) (اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں تباہ ہو جاتے)۔

2۔ عدل (اللہ کا انصاف):

عدل کا مطلب ہے کہ اللہ ظالم نہیں اور ہر چیز میں انصاف کرتا ہے۔

• عقلی دلیل: ایک کامل اور حکیم ذات ظلم نہیں کر سکتی، کیونکہ ظلم کمزوری یا لاعلمی کی علامت ہے، جو اللہ کی صفات کے منافی ہے۔ شیعہ عقائد میں عدل ایک بنیادی اصول ہے جو اللہ کی صفات میں سے ہے اور دین کی بنیادوں میں شامل ہے۔ عدل کا مطلب ہے کہ اللہ ہر کام میں انصاف کرتا ہے اور کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ عدل کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی عقلی اور منطقی بنیادوں کو سمجھیں۔

عقل ہمیں بتاتی ہے کہ انصاف کامل ذات کا لازمی وصف ہے۔ اللہ چونکہ علیم، حکیم، اور قادر مطلق ہے، اس لیے وہ کسی بھی معاملے میں ظلم یا ناانصافی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ظلم کا تصور یا تو لاعلمی، کمزوری، یا بے مقصدیت سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ تمام صفات اللہ کی ذات سے یکسر منافی ہیں۔ اگر اللہ کسی پر ظلم کرے یا کسی کو اس کا حق نہ دے، تو یہ اس کی کامل ذات کے خلاف ہو گا۔

کائنات میں ہر شے ایک خاص ترتیب اور توازن کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ سورج اور چاند کی گردش، موسموں کی تبدیلی، اور انسان کی جسمانی اور روحانی ساخت اس بات کی گواہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو انصاف کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اگر اللہ کے فیصلے میں ناانصافی یا بے ترتیبی ہوتی، تو یہ کائنات کے نظام میں

واضح طور پر نظر آتا۔ لہٰذا کائنات کا یہ منظم نظام اس بات کی عقلی دلیل ہے کہ اللہ عادل ہے اور اس کا کوئی کام بے مقصد یا غیر منصفانہ نہیں۔

عدل کا تصور اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل اور ارادہ دیا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال میں آزادی کے ساتھ فیصلے کر سکے۔ اگر انسان کے اعمال پر جزاو سزا نہ ہو اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ نہ دیا جائے، تو یہ عدل کے خلاف ہو گا۔ اس لیے قیامت اور جزاو سزا کا تصور عدل الٰہی کی ایک منطقی توسیع ہے۔ اگر دنیا میں ظالم اپنے ظلم کے باوجود کامیاب رہے اور مظلوم کو انصاف نہ ملے، تو عدل کا تقاضا ہے کہ ایک دن ایسا ہو جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے۔

قرآن پاک میں اللہ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ وہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا: إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء:40)۔ یہ آیت عدل الٰہی کی ضمانت دیتی ہے اور اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اللہ کا ہر فیصلہ حکمت اور انصاف پر مبنی ہے۔ اسی طرح، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں عدل کو دین کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر مخلوق کو اس کے حق کے مطابق نوازا ہے۔

شیعہ عقیدہ میں عدل کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ انسان کے اعمال کو زبردستی نہیں کرتا بلکہ انسان کو آزادی دیتا ہے تاکہ وہ اچھے یا برے اعمال کا انتخاب خود کرے۔ اگر اللہ انسان کو زبردستی نیکی یا بدی پر مجبور کرتا، تو یہ عدل کے منافی ہوتا۔ عدل الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان کو اس کی کوشش اور نیت کے مطابق جزا یا سزا دی جائے، اور اسی وجہ سے دنیا میں امتحان کا نظام موجود ہے۔

لہٰذا عدل کا اصول نہ صرف اللہ کی کامل ذات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ انسان کی زندگی کو بھی ایک مقصد اور ذمہ داری کے ساتھ جوڑتا ہے۔ یہ اصول کائنات کے نظام سے لے کر قیامت کے دن تک، ہر معاملے میں اللہ کی حکمت، انصاف، اور رحمت کو واضح کرتا ہے۔

• قرآنی دلیل: "إِنَّ اللهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ" (سورہ نساء: 40) (بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا)۔

3۔ نبوت (انبیاء کی بعثت):

نبوت کا مطلب ہے کہ اللہ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے انبیاء بھیجے۔

• عقلی دلیل: انسان اپنی فطرت اور عقل سے محدود ہے اور اسے رہنمائی کی ضرورت ہے تاکہ وہ زندگی کے اصل مقصد کو سمجھ سکے۔ انبیاء اللہ کے نمائندے ہیں جو وحی کے ذریعے یہ رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

• قرآنی دلیل: "وَلَقَدْ بَعَثْنَافِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا" (سورہ نحل:36)(ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا)۔

4۔ امامت (رہنمائی کا تسلسل):

امامت کا مطلب ہے کہ نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اللہ نے معصوم اماموں کو انسانیت کی رہنمائی کے لیے مقرر کیا۔

• عقلی دلیل: جس طرح نبوت ضروری ہے، اسی طرح نبوت کے بعد امت کو گمراہی سے بچانے کے لیے ایک معصوم رہنما کی ضرورت ہے جو دین کو محفوظ اور واضح رکھے۔ شیعہ اصول دین میں **امامت** ایک بنیادی اور ضروری عقیدہ ہے۔ امامت کا مفہوم یہ ہے کہ نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اللہ نے منتخب افراد کو امت کی رہنمائی کے لیے معصوم اماموں کی شکل میں مقرر کیا ہے۔ یہ عقیدہ شیعہ مسلمانوں کے لیے اس بات کی وضاحت فراہم کرتا ہے کہ دین کی صحیح تفہیم اور اس کی مکمل رہنمائی کے لیے، صرف نبی کا وجود کافی

نہیں تھا، بلکہ ایک معصوم رہنما کی ضرورت تھی جو دین کے صحیح اصولوں کو نبی کے بعد بھی بحفاظت اور باحسن طریقے سے لوگوں تک پہنچا سکے۔

عقلی طور پر، امامت کی ضرورت اس حقیقت سے جڑی ہوئی ہے کہ کسی بھی سماج یا ملت کی رہنمائی کے لیے ایک کامل اور معصوم رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان اپنی فطرت اور عقل میں کمی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اور وہ کامل رہنمائی کے لیے ایک معصوم ہدایت دینے والے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو بے رہنمائی میں چھوڑ دیا جاتا، تو اس بات کا خطرہ تھا کہ دین میں تبدیلیاں آئیں، لوگوں میں اختلافات پیدا ہوں، اور دین کی اصل روح محفوظ نہ رہ سکے۔

دوسری طرف، نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا انسان کی محدود عقل اور فطرت کی بنا پر مشکل ہو سکتا ہے۔ امام معصوم، جو اللہ کی طرف سے منتخب کیا گیا ہو، اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ دین کی صحیح تفہیم اور اس کی حقیقت ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ امام کی معصومیت کا عقیدہ اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ وہ خطا سے پاک ہوتا ہے اور دین کی کوئی بھی تفسیر یا تشریح اس سے غلط نہیں ہو سکتی۔ اس طرح امام کی رہنمائی کو نبی کی رہنمائی کے تسلسل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

عقلاً یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر امام کی ضرورت نہ ہوتی تو اللہ تعالی نے اسے واضح طور پر قرآن میں ذکر کیا ہوتا۔ قرآن میں کئی مقامات پر اللہ نے اپنے منتخب بندوں کو رہنمائی دینے کا وعدہ کیا ہے، اور یہ وعدہ محض نبوت تک محدود نہیں تھا بلکہ رہنمائی کا یہ تسلسل امام کے ذریعے بھی جاری رہنا ضروری تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ کی حکمت پر سوال اٹھتا، کیونکہ بغیر رہنمائی کے انسانیت کو اپنی فطری کمزوریوں سے بچانے کا کوئی ذریعہ نہیں بچتا۔ اس لیے امامت کا عقیدہ اللہ کی حکمت اور انصاف کے مطابق ہے جو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ دین کی تکمیل اور اس کی صحیح تشریح کا عمل ہمیشہ جاری رہنے والا ہے۔

امامت کا عقیدہ اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ دین کے بعد کے مسائل اور چیلنجز کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں، بلکہ امام کا وجود اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ دین کی مکمل تشریح اور اس کی پیروی کرنے والے افراد کو صحیح رہنمائی مل سکے۔ امام، جو معصوم ہوتا ہے، لوگوں کی روحانی، علمی اور اخلاقی رہنمائی کرتا ہے اور دین کے اصولوں کی درست تشریح فراہم کرتا ہے۔ اس کے ذریعے، نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی دین کی اصل روح برقرار رہتی ہے، اور امت میں اختلافات اور فتنوں کو دور کرنے کی صلاحیت حاصل کی جاتی ہے۔

یہ عقیدہ کہ امام معصوم ہوتے ہیں، اس بات کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ اللہ کے منصوبے میں کوئی بھی فرد اس منصب کے لیے اہل نہیں ہوتا سوائے اس کے جسے اللہ خود منتخب کرے۔ اسی طرح، امام کے منتخب ہونے کا طریقہ ایک مقدس عمل ہے جسے اللہ کی رہنمائی کے تحت انجام دیا جاتا ہے تاکہ امت کی صحیح رہنمائی کو یقینی بنایا جا سکے۔

امامت کا عقیدہ قرآن اور حدیث میں بھی مضبوط دلائل سے ثابت ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب افراد کو رہنمائی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مثلاً، سورہ مائدہ کی آیت 55 میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ "تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ جو ایمان لانے والے ہیں اور جو رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں"۔ یہ آیت اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ رہنمائی کا حق ان لوگوں کو دیا گیا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین کی رہنمائی کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔

اسی طرح، امام علی علیہ السلام کا انتخاب اور ان کا منصب امامت ایک تاریخی حقیقت ہے، جو نہ صرف شیعہ بلکہ اہل سنت کے بعض مفسرین اور مورخین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، حدیث "من کنت مولاہ فہٰذا علی مولاہ" میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علی علیہ السلام کی امامت کو واضح طور پر

بیان کیاہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ امامت کا عقیدہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیمات کا حصہ تھا۔

اس لیے، عقلی دلائل کے مطابق، امامت کی ضرورت اس بات سے جڑی ہوئی ہے کہ دین کی صحیح رہنمائی کے لیے معصوم رہنما کی موجودگی ضروری ہے تاکہ دین کا اصل پیغام اور ہدایت لوگوں تک پہنچ سکے۔ امام کی معصومیت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ دین میں کسی قسم کی تحریف یا غلط تفہیم کا امکان نہ ہو۔ اس کے علاوہ، امام کا انتخاب اللہ کی حکمت اور مرضی کے تحت ہوتا ہے تاکہ امت کی رہنمائی کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری رہ سکے۔

• قرآنی دلیل: "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ" (سورہ مائدہ: 55) (تمہارے ولی اللہ، اس کے رسول، اور وہ مؤمن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں)۔

5۔ قیامت (آخرت پر ایمان):

قیامت کا مطلب ہے کہ اللہ ایک دن سب کو زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب لے گا۔

• عقلی دلیل: اگر کوئی آخری عدالت نہ ہو تو یہ دنیا بے مقصد اور ظلم کا شکار معلوم ہو گی۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ نیکوں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے، جو دنیا میں مکمل ممکن نہیں۔

• قرآنی دلیل: "أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا" (سورہ مؤمنون: 115) (کیا تم نے یہ گمان کیا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا؟)۔

یہ اصول دین، اللہ کی صفات اور انسان کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق ہیں، اور ان کا مقصد انسان کو ایک متوازن اور کامیاب زندگی فراہم کرنا ہے۔

تشیع علوی و تشیع صفوی اور مغربی جدت

"تشیع صفوی" اور "تشیع علوی" کی اصطلاح کے تناظر میں مغربی جدت (modernity) کو پسند کرنے والے اور نہ پسند کرنے والے انقلابی اور غیر انقلابی گروہوں کی دلچسپیاں اور رجحانات مختلف ہیں۔ ان کے رویے کا تعین اس بات پر منحصر ہے کہ وہ مغربی جدت کو کس طرح اپنے مذہبی اور سماجی مقاصد کے لیے دیکھتے ہیں۔

1. تشیع علوی کے تناظر میں مغربی جدت پسند اور مخالف گروہ

1.1 مغربی جدت کو پسند کرنے والے علوی انقلابی

- مغربی ترقی کے ان پہلوؤں کو اپنانے کے قائل ہیں جو اسلامی اصولوں سے متصادم نہ ہوں، جیسے :
  - **سائنس اور ٹیکنالوجی**: جدید ٹیکنالوجی کو معاشرتی ترقی کے لیے استعمال کرنا۔

○ **جمہوریت:** عوامی شمولیت کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے نافذ کرنا۔

- یہ گروہ مغرب کو مکمل طور پر مسترد کرنے کے بجائے اس کے مثبت پہلوؤں کو اسلامی مقاصد کے لیے کارآمد بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

1.2 مغربی جدت کو نہ پسند کرنے والے علوی انقلابی

- مغربی نظام کو کلی طور پر "استکباری" سمجھتے ہیں اور اس کے ہر پہلو کو اسلامی معاشرتی ڈھانچے کے لیے نقصان دہ تصور کرتے ہیں۔
- ان کے نزدیک مغربی جدت اسلامی روحانیت، اخلاقیات، اور سماجی انصاف کو کمزور کرتی ہے۔

2. تشیع صفوی کے تناظر میں مغربی جدت پسند اور مخالف گروہ

2.1 مغربی جدت کو پسند کرنے والے صفوی غیر انقلابی

- مغربی جدت کو ظاہری ترقی، معاشی استحکام، اور سماجی بہتری کے لیے اپنانے پر زور دیتے ہیں۔

- ان کے نزدیک مذہب ذاتی اور رسومات تک محدود ہونا چاہیے، اور معاشرتی وسیاسی معاملات میں مغربی اصولوں کو اپنانا ضروری ہے۔
- مثال: وہ مذہبی رہنما اور عوامی حلقے جو مغرب کی ظاہری ترقی کو مثالی سمجھتے ہیں اور اسے مکمل طور پر اپنانے کے حامی ہیں۔

2.2 مغربی جدت کو نہ پسند کرنے والے صفوی غیر انقلابی

- مغربی جدت کو دینی اقدار، رسومات، اور روایات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔
- ان کے نزدیک مغرب سے تعلقات محدود رکھنا ہی مذہبی و ثقافتی اقدار کو محفوظ رکھنے کا طریقہ ہے۔
- یہ گروہ زیادہ تر دینی شعائر، روایتی فقہ، اور مذہبی رسومات کو مغربی اثرات سے دور رکھنے پر توجہ دیتا ہے۔

دلچسپیوں کا موازنہ:

صفوی جدت مخالف	صفوی جدت پسند	علوی جدت مخالف	علوی جدت پسند	پہلو
مسترد، روایتی طرز زندگی کو ترجیح دیتے ہیں	قبول، معاشی ترقی کے لیے ضروری	مسترد، سامراجی ایجنڈا سمجھتے ہیں	قبول، اسلامی فلاح کے لیے استعمال	مغربی سائنس و ٹیکنالوجی
روایتی مذہبی نظام پر زور، مغربی اثرات سے دوری	مغربی جمہوریت اور اقدار کو مکمل اپنانا	اسلامی اصولوں پر مبنی انقلابی نظام	اسلامی جمہوریت، مغربی اصولوں کا تنقیدی استعمال	سماجی نظام
روایتی ثقافت اور رسومات پر مکمل انحصار	مغربی ثقافت کو قبول، روایات کو پس پشت ڈالنا	مکمل اسلامی ثقافت پر اصرار	مغربی ثقافت کے اچھے پہلوؤں کو اپنانا	ثقافت
مذہبی روایات اور رسوم کا تحفظ	ذاتی مذہبی رسومات کا تحفظ	اسلامی انقلابی جدوجہد	اسلامی معاشرتی انصاف اور ترقی	مقصد

تشیع علوی کے پیروکار، خواہ جدت پسند ہوں یا مخالف، مذہب کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مغربی جدت کو یا تو ایک وسیلہ یا خطرہ سمجھ کر اس سے نمٹتے ہیں۔

تشیع صفوی کے پیروکار، خواہ جدت پسند ہوں یا مخالف، زیادہ تر مذہب کو روایات تک محدود رکھتے ہیں اور مغربی جدت کو یا تو اپنے معاشی و سماجی مقاصد کے لیے اپناتے ہیں یا اس سے مکمل اجتناب کرتے ہیں۔

یہ دونوں رجحانات امت مسلمہ میں جاری فکری تقسیم کو نمایاں کرتے ہیں، اور ان کے باہمی تعامل سے اسلامی معاشروں کی آئندہ سمت کا تعین ہو سکتا ہے۔

انقلابی و غیر انقلابی تشیع اور مغرب

انقلابی تشیع اور غیر انقلابی تشیع کا مغرب کے بارے میں نظریہ:

1. **انقلابی تشیع کا مغرب کے بارے میں نظریہ:** انقلابی تشیع، خصوصاً آیت اللہ روح اللہ خمینی کے زیر اثر، مغرب کو ایک ایسے استعمار پسند اور ثقافتی استبداد کے طور پر دیکھتا ہے جو مسلم دنیا کی خود مختاری اور شناخت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ انقلابی تشیع مغربی ممالک کو ایک ناپاک طاقت سمجھتا ہے جو اپنی جغرافیائی اور اقتصادی مفادات کے لیے مسلمانوں کی روحانیت، اخلاقی اقدار، اور اجتماعی زندگی میں مداخلت کرتی ہے۔ خمینی نے مغرب کی ثقافتی بالادستی کے مقابلے میں اسلامی انقلاب کی ضرورت پر زور دیا، جس میں اسلامی اصولوں پر مبنی معاشرتی اور سیاسی نظام کو قائم کیا جائے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق، مغرب کی طرف سے کیے جانے والے ظلم اور استعمار کے خلاف جدوجہد کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان اپنی شناخت کو بچا سکیں۔

2. **غیر انقلابی تشیع کا مغرب کے بارے میں نظریہ:** غیر انقلابی تشیع، خاص طور پر وہ جو اصلاحات کی حمایت کرتا ہے، مغرب کو ایک پیچیدہ اور متنازعہ قوت کے طور پر دیکھتا ہے۔ ان کے نزدیک مغرب میں موجود ترقی اور سائنسی ایجادات کے پہلوؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن وہ مغربی ثقافتی اور اخلاقی اثرات سے خبردار رہتے ہیں۔ غیر انقلابی تشیع میں مغرب کو ایک موقع کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جس سے فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ اسلامی اقدار کی محافظت کی جائے۔ اس میں ترقی پسند نقطہ نظر اپنایا جاتا ہے، جہاں مغرب سے سیکھنے اور اس کے برے اثرات سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سامراجی طاقتوں کی سازشوں کے مقابلے میں دونوں کا موقف:

1. **انقلابی تشیع کا سامراجی طاقتوں کے حوالے سے موقف:** انقلابی تشیع سامراجی طاقتوں کو ایک ایسے استعماری نظام کے طور پر دیکھتا ہے جو مسلم ممالک کی خودمختاری کو نقصان پہنچا کر ان کے وسائل اور ثقافتی شناخت کو لوٹنا چاہتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ طاقتیں مسلمانوں کی آزادی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں اور ان کے خلاف

مزاحمت ضروری ہے۔ انقلابی تشیع ان طاقتوں کے خلاف براہ راست مزاحمت اور ان کے خلاف بغاوت کی حمایت کرتا ہے، جیسا کہ ایران میں 1979 کا اسلامی انقلاب اس بات کا واضح مظاہرہ تھا۔

2. **غیر انقلابی تشیع کا سامراجی طاقتوں کے حوالے سے موقف :** غیر انقلابی تشیع سامراجی طاقتوں کو بھی ایک خطرہ سمجھتا ہے، لیکن اس کے ردعمل میں انقلابی اقدام کے بجائے اصلاحی اور تدریجی تبدیلیوں کی حمایت کرتا ہے۔ اس میں وہ سمجھتے ہیں کہ سامراجی طاقتوں کے خلاف سیاسی، اقتصادی، اور ثقافتی میدان میں قانونی اور ادارہ جاتی اصلاحات کے ذریعے مزاحمت کی جائے۔ غیر انقلابی تشیع کے پیروکاروں کے نزدیک، سامراجی طاقتوں سے لڑنے کے لیے معاشرتی سطح پر تدریجی بیداری اور نظام میں اندرونی اصلاحات ضروری ہیں۔

سامراجی طاقتوں کے مقابلے میں دونوں کا طریقہ کار:

1. **انقلابی تشیع کا طریقہ کار :** انقلابی تشیع سامراجی طاقتوں کے مقابلے کے لیے انقلابی طریقہ کار کو اختیار کرتا ہے، جس میں سیاسی بغاوت،

عوامی تحریکوں، اور حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد شامل ہیں۔
انقلابی تشیع کا موقف یہ ہے کہ طاقتور ممالک اور ان کی اتحادی حکومتوں کے خلاف براہ راست مزاحمت کی جائے۔ اس میں اسلامی انقلاب جیسے اقدام کی حمایت کی جاتی ہے جو بیرونی قوتوں کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے اور اسلامی خودمختاری کو بحال کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔

2. **غیر انقلابی تشیع کا طریقہ کار** :غیر انقلابی تشیع سامراجی طاقتوں کے مقابلے کے لیے ایک نرم اور اصلاحی طریقہ کار کی حمایت کرتا ہے۔ اس میں سیاسی اور اقتصادی نظام میں تدریجاً اصلاحات کی جانی چاہئیں تاکہ سامراجی اثرات کو کم کیا جا سکے اور مسلمان عالمی سطح پر ترقی کر سکیں۔ غیر انقلابی تشیع میں داخلی سطح پر تبدیلیوں اور عالمی سطح پر سفارتی تعلقات کے ذریعے مزاحمت کی حمایت کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار زیادہ تدریجی اور مفاہمت کی طرف مائل ہوتا ہے، تاکہ بیرونی قوتوں کے اثرات کو کم کیا جا سکے۔

انقلابی اور غیر انقلابی تشیع دونوں ہی سامراجی طاقتوں کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے خلاف مزاحمت کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، لیکن ان کے

طریقہ کار میں فرق ہے۔ انقلابی تشیع براہ راست مزاحمت اور انقلاب کی حمایت کرتا ہے، جبکہ غیر انقلابی تشیع تدریجی اصلاحات اور سفارتی طریقوں کی حمایت کرتا ہے۔ مغرب کے حوالے سے بھی ان دونوں کا نظریہ مختلف ہے، جہاں انقلابی تشیع اسے ایک دشمن قوت کے طور پر دیکھتا ہے اور غیر انقلابی تشیع اسے ایک موقع کے طور پر سمجھتا ہے، بشرطیکہ اس کے منفی اثرات سے بچا جائے۔

تشیع علوی اور تشیع صفوی سے کیا مراد ہے؟

تشیع علوی اور **تشیع صفوی** کی اصطلاحات، ڈاکٹر علی شریعتی کے فکری تصورات کے مطابق، شیعہ تاریخ اور فکر کے دو مختلف رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ اصطلاحات دراصل شیعہ مسلم معاشرت میں ایک تضاد اور فرق کو ظاہر کرتی ہیں جو مختلف ادوار میں شیعہ فکری اور سیاسی نظریات کی تبدیلی کو بیان کرتی ہیں۔

1۔ تشیع علوی:

تشیع علوی کی اصطلاح کا مطلب وہ تشیع ہے جو امام علی (علیہ السلام) کی حقیقی تعلیمات، ان کی سیاسی جدوجہد اور اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ تشیع خلافت اور

حکومت کے تعلق کو بہت اہمیت دیتا ہے اور امام علی (علیہ السلام) کو حقیقی رہنما اور اسلامی معاشرت کی فکری بنیاد کے طور پر دیکھتا ہے۔

تشیع علوی کی خصوصیات:

- **اصولی اور فکری نقطہ نظر:** تشیع علوی کو اصولی، جرات مندانہ، اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں علی (علیہ السلام) کے بارے میں ایک گہری فکری تفہیم اور ان کے نظریات کی پیروی کی جاتی ہے۔
- **عدلیہ و انصاف پر زور:** تشیع علوی میں عدلیہ، انصاف، اور معاشرتی برابری پر بہت زور دیا جاتا ہے، جو امام علی (علیہ السلام) کی سیاست کا ایک اہم جزو تھا۔
- **امام کی مرکزی حیثیت:** تشیع علوی میں امام کی سیاسی اور روحانی حیثیت کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، اور اسے ایک اخلاقی رہنمائی اور معاشرتی تبدیلی کے اصول کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

- **مذہبی اور سماجی انقلاب :** اس تشیع میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ دین اور سیاست ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں اور امام کا مقصد صرف مذہب کی نہیں، بلکہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی عدلیہ کا قیام تھا۔

تشیع علوی کے نمایاں خصائص:

- امام علی کی زندگی اور ان کے اصولوں کو معیار بنا کر معاشرت میں تبدیلی کی کوشش کرنا۔
- جمہوریت، انصاف، اور معاشرتی برابری کی اصولی حمایت۔
- حکومت کی روحانی اور اخلاقی حیثیت پر یقین۔

2۔ تشیع صفوی:

تشیع صفوی وہ تشیع ہے جو صفوی سلطنت کے دوران ایران میں ریاستی سطح پر قائم ہوئی۔ صفویوں نے 16 ویں صدی میں ایران میں تشیع کو سرکاری مذہب قرار دیا اور اس کے ذریعے اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ یہ تشیع زیادہ تر ریاستی طاقت اور سیاسی حکمت عملی کے تحت تشکیل پایا تھا۔

تشیع صفوی کی خصوصیات:

- **سیاسی اقتدار اور ریاستی تشیع :** تشیع صفوی میں ریاست اور مذہب کی ایک مضبوط تعلق کی کوشش کی گئی، جہاں صفوی بادشاہت نے تشیع کو ریاستی مذہب قرار دیا۔ اس میں مذہب کو سیاسی اقتدار کے تسلسل اور مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔
- **ایرانی شناخت کی تشکیل :** صفوی سلطنت کے دوران، تشیع صفوی نے ایرانی قوم کی ثقافتی اور مذہبی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں ایران کو اسلامی دنیا میں ایک خاص حیثیت دینے کی کوشش کی گئی۔
- **مذہب کی سیاست میں استعمال :** تشیع صفوی میں مذہب کو سیاسی اور فوجی حکمت عملیوں میں استعمال کیا گیا، اور اسلامی فقہ کے ذریعے حکومت کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔
- **فقہ کی رسمی حیثیت :** صفویوں نے شیعہ فقہ کو ایک مستند قانونی نظام کے طور پر اپنایا اور اس کے ذریعے معاشرتی نظام کی تشکیل کی۔

تشیع صفوی کے نمایاں خصائص:

- تشیع کو ریاستی طاقت کے ساتھ جوڑنا اور اس کے ذریعے حکومت کی طاقت کو مستحکم کرنا۔
- مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا، جیسے کہ صفوی سلطنت کی بقا کے لیے۔
- ایران میں اسلامی شناخت کے ایک مضبوط نظام کی تشکیل۔
- شیعہ فقہ کو قانونی اور ریاستی نظم میں شامل کرنا۔

تشیع علوی اور تشیع صفوی میں فرق:

- **تشیع علوی** میں امام علی (ع) کی روحانی اور سیاسی قیادت پر زور دیا جاتا ہے، اور یہ ایک انقلابی، اصولی اور آزادانہ فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔
- **تشیع صفوی** ایک ریاستی تشیع ہے جس میں مذہب اور حکومت کے تعلق کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی، اور مذہب کو سیاسی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا گیا۔

- **تشیع علوی** کا رجحان اصلاحی اور فکری ہے، جب کہ **تشیع صفوی** ایک طاقتور ریاستی نظام کی حمایت کرتا ہے، جہاں مذہب کو ایک اقتدار کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

تشیع علوی میں اصولی، فکری اور اخلاقی تبدیلیوں پر زور دیا جاتا ہے، جو اسلامی معاشرت کو انقلابی طور پر بدلنے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ **تشیع صفوی** ایک زیادہ ریاستی، سیاسی اور اقتدار پر مبنی تشیع ہے جو مذہب کو حکومتی طاقت کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

مغربی جدت سے کیا مراد ہے؟

مغربی جدت (Western Modernity) ایک وسیع اور پیچیدہ تصور ہے جو مغربی ممالک کی معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی، اور سائنسی ترقیات کو بیان کرتا ہے۔ یہ اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے، اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ مختلف نظریات، افکار، اور اقدامات شامل ہیں۔ مغربی جدت سے مراد عموماً درج ذیل اہم پہلو ہیں:

1۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی

مغربی دنیا کی علمی اور سائنسی ترقیات، جیسے کہ جدید سائنسی تحقیق، ٹیکنالوجی کی ایجادات، اور صنعتوں کا فروغ، مغربی جدت کے اہم اجزاء ہیں۔ ان میں ایجادات جیسے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، جدید میڈیکل ٹیکنالوجیز، خلائی سفر وغیرہ شامل ہیں۔

2۔ جمہوریت اور سیاسی اصول

مغربی جدت کی ایک اور نمایاں خصوصیت جمہوریت اور انسان کے حقوق کی بنیاد پر چلنے والے سیاسی نظام ہیں۔ یہ اصول آزاد انتخابات، اظہار کی آزادی، قانون کی حکمرانی، فرد کی آزادی اور مساوات پر زور دیتے ہیں۔ مغربی ممالک نے ان اصولوں کو اپنے سیاسی ڈھانچے میں نافذ کیا اور دنیا بھر میں ان کی پزیرائی ہوئی۔

3۔ معاشی نظام

مغربی ممالک میں سرمایہ داری اور آزاد منڈی (capitalism) کی بنیاد پر معیشت کا نظام قائم ہے۔ یہ نظام انفرادی ملکیت، کاروباری آزادی، اور منڈی کی قوتوں پر زور دیتا ہے۔ مغربی جدت میں معیشت کا یہ ماڈل اہم حیثیت رکھتا ہے اور دیگر ممالک پر بھی اس کا اثر ہے۔

4۔ ثقافتی تبدیلیاں

مغربی ثقافت میں فردیت، آزادی، اور تنوع کی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس میں فنون، ادب، موسیقی، فلم، اور دیگر ثقافتی سرگرمیاں شامل ہیں جو مغربی معاشروں میں اہمیت رکھتی ہیں اور دنیا بھر میں ان کا اثر ہے۔

5۔ فلسفہ اور اخلاقیات

مغربی جدت کا فلسفیانہ تناظر بھی مختلف ہے، جس میں لبرل ازم، سیکولرازم، انسانیت، اور پوزیٹیوسم جیسے خیالات اہم ہیں۔ اس میں مذہب اور سیاست کے درمیان تفریق پر زور دیا جاتا ہے اور انسانی حقوق، آزادی، اور فرد کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

6۔ سیکولرازم

مغربی جدت کی ایک اہم خصوصیت مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی ہے، جسے **سیکولرازم** کہا جاتا ہے۔ اس میں معاشرتی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو ایک ذاتی اور نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کا حکومت کے فیصلوں میں اثر کم سے کم ہوتا ہے۔

7۔ سماجی اور اخلاقی تبدیلیاں

مغرب میں معاشرتی اقدار اور اخلاقیات میں تبدیلیاں آئیں، جیسے کہ جنسیت، ازدواجی تعلقات، اور فرد کی آزادی سے متعلق مختلف نظریات کا قبول کیا جانا۔

اس میں آزادئ اظہار، اقلیتوں کے حقوق، اور خواتین کی مساوات کے اصول شامل ہیں۔

مغربی جدت ایک جامع تصور ہے جو مختلف پہلوؤں میں مختلف نوعیت کی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے، خاص طور پر سائنس، ٹیکنالوجی، سیاست، معیشت، ثقافت، اور اخلاقیات میں۔ یہ ایک مخصوص فلسفہ اور طرز زندگی کو فروغ دیتا ہے جس میں فرد کی آزادی، ترقی اور سائنسی فکر کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مغربی جدت بعض اوقات اسلامی معاشرتی اقدار اور ثقافتی روایات سے متصادم سمجھی جاتی ہے، اور اس کے اثرات پر مختلف گروہ مختلف ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

قدامت پسندی، جدت پسندی اور جدید علم نفسیات

گروتھ مائنڈ سیٹ اور فکسڈ مائنڈ سیٹ کے تناظر میں مذکورہ فرقوں اور نظریات کو دیکھتے ہوئے، ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس نظریہ یا فرقہ میں ترقی کی پذیرائی اور تبدیلی کا زیادہ امکان ہے، اور کس میں روایات یا اصولوں کی پابندی زیادہ غالب ہے۔ یہ تبصرہ ہر فرقے کے بنیادی عقائد اور ان کی فکری لچک کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

۱۔ تشیع علوی

گروتھ مائنڈ سیٹ

تشیع علوی کا نظریہ فکری آزادی، فلاحی معاشرت اور عدلیہ پر مبنی ہے، جو فرد کی ذاتی اور اجتماعی ترقی کو فروغ دیتا ہے۔ اس فرقہ میں ہر فرد کی ذہنی و روحانی صلاحیتوں کو جِلا دینے کی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں گروتھ مائنڈ سیٹ کا غلبہ ہے۔

۲۔ تشیع صفوی

فکسڈ مائنڈسیٹ

تشیع صفوی میں روایات اور طاقت کے مرکزی ادارے (صفوی سلطنت) کی اہمیت تھی، اور بعض اوقات یہ فرقہ اس بات پر زیادہ توجہ دیتا تھا کہ روایات کو قائم رکھا جائے۔ یہ غیر لچکدار رویہ، خاص طور پر سیاسی اور ثقافتی بنیادوں پر، فکسڈ مائنڈسیٹ کی علامت ہے۔

۳۔ تشیع انقلابی

گروتھ مائنڈسیٹ

انقلابی تشیع (خصوصاً امام خمینی کے انقلاب کے ذریعے) سماجی اور سیاسی تبدیلی کی حمایت کرتا ہے، جو گروتھ مائنڈسیٹ کی خصوصیت ہے۔ اس میں فرد اور قوم کی مسلسل فکری اور سماجی ترقی پر زور دیا گیا ہے، اور تبدیلی کے امکانات کو مکمل طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

۴۔ تشیع غیر انقلابی

فکسڈ مائنڈسیٹ

تشیع غیر انقلابی میں اس بات کی زیادہ ترجیح دی جاتی ہے کہ موجودہ حالات میں اصلاحات آہستہ آہستہ کی جائیں۔ یہاں تبدیلی کی رفتار اور نوعیت روایات سے

مشروط ہو سکتی ہے، جس میں زیادہ لچک یا تیز تبدیلی کی جستجو کم ہو سکتی ہے، اور اس طرح یہ فکسڈ مائنڈسیٹ کا حامل نظر آتا ہے۔

۵۔ معتزلہ

گروتھ مائنڈسیٹ

معتزلہ عقل اور فہم کو اہمیت دیتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان اپنی تقدیر میں آزاد ہے۔ ان کا نظریہ ہمیشہ ترقی پذیر ہے، کیونکہ وہ عقل اور منطق کے مطابق اپنے عقائد اور نظریات کو مسلسل بدلنے یا بہتر بنانے کی حمایت کرتے ہیں۔ اس لیے معتزلہ گروتھ مائنڈسیٹ کا حامل ہے۔

٦۔ اشاعرہ

فکسڈ مائنڈسیٹ

اشاعرہ کا عقیدہ اس بات پر مبنی ہے کہ اللہ کی مرضی اور اس کی حکمت کو مانا جائے، چاہے وہ انسانی عقل سے میل کھاتی ہو یا نہ ہو۔ ان کے فلسفہ میں بہت سے معاملات میں فکسڈ نظریات اور اصولوں کی پیروی کی جاتی ہے، جس سے فکسڈ مائنڈسیٹ کی عکاسی ہوتی ہے۔

۷۔ قدامت پسندی

فکسڈ مائنڈسیٹ

قدامت پسند نظریات میں ماضی کی روایات کو اہمیت دی جاتی ہے اور موجودہ یا مستقبل میں تبدیلی کو غیر ضروری یا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ قدامت پسندی میں تبدیلی کے امکانات محدود ہیں، جس سے فکسڈ مائنڈ سیٹ کی عکاسی ہوتی ہے۔

۸۔ جدت پسندی

گروتھ مائنڈسیٹ

جدت پسندی کا نظریہ ہر سطح پر ترقی، تبدیلی اور نئ سوچ کی پذیرائی پر مبنی ہے۔ اس میں افراد اور معاشرتی ڈھانچوں کی مسلسل ترقی کی حمایت کی جاتی ہے، جو گروتھ مائنڈسیٹ کی خصوصیت ہے۔

خلاصہ:

- **گروتھ مائنڈ سیٹ کا حامل فرقہ / نظریہ :**
    - تشیع علوی
    - تشیع انقلابی

- معتزلہ
- جدت پسندی

- **فکسڈ مائنڈ سیٹ کا حامل فرقہ / نظریہ :**
  - تشیع صفوی
  - تشیع غیر انقلابی
  - اشاعرہ
  - قدامت پسندی

گروتھ مائنڈ سیٹ اور تاریخ

تاریخ میں وہ لوگ جو **گروتھ مائنڈ سیٹ** کے حامل تھے، انسانی فلاح کے کاموں میں کامیاب ہوئے ہیں، کیونکہ ان کا ایمان ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرے کی ترقی ممکن ہے، اور اس کے لیے جدت، تبدیلی، اور سوچ میں لچک کی ضرورت ہے۔ ایسے افراد نے ہمیشہ نئی راہیں تلاش کیں، روایات کو چیلنج کیا، اور معاشرتی، ثقافتی، یا سائنسی سطح پر انقلابی تبدیلیاں لائیں۔ گروتھ مائنڈ سیٹ کے حامل افراد نے انسانیت کے لیے مثبت اثرات مرتب کیے، یہاں صرف شناخت کیلئے چند نام دیئے جارہے ہیں جیسا کہ:

1۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے انسانوں کو اپنی صلاحیتوں پر یقین رکھنے کی ترغیب دی اور ان میں اصلاح اور ترقی کی جستجو پیدا کی۔ آپ کی رہنمائی میں صحابہ کرام نے اپنی زندگیوں میں نمایاں تبدیلیاں کیں اور دنیا بھر میں اسلامی اقدار پھیلائیں۔

2۔ امام علی علیہ السلام:

- امام علی علیہ السلام نے ہمیشہ علم، انصاف، اور عدلیہ پر زور دیا۔ ان کی تعلیمات اور حکمت نے فرد کے فکری ارتقاء کو فروغ دیا، اور آپ کی کوششوں نے سماجی انصاف کی جانب قدم بڑھایا۔

3۔ علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کے پیروکار:

- ان کی تعلیمات میں یہ بات نمایاں ہے کہ انسان کی ذاتی ترقی اور روحانیت میں کمیابی کے لیے مستقل محنت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

4۔ امام خمینی (رحمت اللہ علیہ):

- امام خمینی نے ایران میں اسلامی انقلاب کی قیادت کی اور انسانی فلاح کے لیے ایک نیا سیاسی اور سماجی ماڈل متعارف کرایا۔ ان کا فلسفہ افراد

کی صلاحیتوں پر ایمان تھا، اور ان کی جدوجہد نے لوگوں کو آزادی، عدلیہ، اور فلاحی ریاست کی جانب رہنمائی کی۔

5۔ معتزلہ:

- معتزلہ نے ہمیشہ عقل اور فہم کو اہمیت دی، اور اس بات پر زور دیا کہ انسان عقل و شعور کے ذریعے اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ کہ انسان کو اپنے عقائد میں آزادی حاصل ہے، انسانی فلاح کے لیے ایک طاقتور پہلو تھا، کیونکہ یہ معاشرتی اور فکری آزادی کی طرف راغب کرتا تھا۔

6۔ جدت پسند رہنما اور مفکرین:

- تاریخ میں ایسے بہت سے مفکرین، سائنسدانوں، اور رہنماؤں نے جدت پسندی کی تحریک چلائی ہے، جیسے کہ نظریہ انقلابی تبدیلی، سائنس کی ترقی، تعلیمی میدان میں اصلاحات وغیرہ۔ ان افراد نے نہ صرف اپنے دور کے روایتی اصولوں کو چیلنج کیا بلکہ انسانیت کے لیے بہتر معاشرتی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کی۔

7۔ ماضی کے بڑے مفکرین جیسے ابن سینا، فارابی، غزالی:

- ان علماء نے فلسفہ، طب، اور سائنس کے میدان میں جدت پسندی کے دروازے کھولے اور انسانوں کی فلاح کے لیے علم کے نئے زاویے پیش کیے۔

8. سائنسدان جیسے نیوٹن، آئن سٹائن، مارک زکربرگ:

- یہ افراد ہمیشہ نئے خیالات اور تبدیلی کی جستجو میں رہتے تھے، اور ان کی کوششوں نے نہ صرف سائنسی انقلاب برپا کیا بلکہ دنیا بھر میں انسانوں کی زندگی کو آسان اور بہتر بنانے میں مدد دی۔

تاریخ میں گروتھ مائنڈ سیٹ رکھنے والے افراد نے نہ صرف اپنی زندگیوں میں کامیابی حاصل کی بلکہ انہوں نے انسانی فلاح کے لیے بہت سے انقلاب برپا کیے۔ ان کا ایمان تھا کہ انسان کی صلاحیتیں غیر محدود ہیں، اور دنیا کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں سوچنے اور عمل کرنے میں لچک کی ضرورت ہے۔ برعکس، فکسڈ مائنڈ سیٹ رکھنے والے افراد نے اکثر روایات اور موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، جس سے کچھ کامیابیاں حاصل ہوئیں، مگر انسانیت کے لیے حقیقی تبدیلیاں اور ترقی ان گروپوں سے کم ہی ہوئی۔

قدامت پسندی، جدت پسندی کا نفسیاتی تجزیہ

قدامت پسندوں کا نفسیاتی تجزیہ:

قدامت پسندوں کا نفسیاتی تجزیہ ایک پیچیدہ اور دلچسپ موضوع ہے جس میں مختلف نفسیاتی اور سماجی عوامل شامل ہیں جو ان کے عقائد، رویوں اور معاشرتی تعلقات کو تشکیل دیتے ہیں۔ قدامت پسندی ایک نظریاتی موقف ہے جو روایات، اخلاقی اقدار، اور معاشرتی ڈھانچوں کے تسلسل کو اہمیت دیتا ہے اور تبدیلی یا جدیدیت سے محتاط رہتا ہے۔ قدامت پسند افراد عموماً ایسے معاشرتی، سیاسی، یا ثقافتی نظریات اور طرزِ عمل کو ترجیح دیتے ہیں جو تاریخ یا روایت کی بنیاد پر ہیں۔

1۔ قدامت پسندوں کی نفسیات میں بنیادی رجحانات:

.1.1 روایات اور استحکام کی اہمیت : قدامت پسند افراد روایات، ثقافتی اقدار، اور موجودہ معاشرتی ڈھانچوں کو تسلیم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا

خیال ہے کہ ماضی کے تجربات اور اقدار میں ایک نوعیت کی حکمت اور استحکام ہوتا ہے جو موجودہ یا آئندہ کی نسلوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ یہ افراد معاشرتی تبدیلیوں سے خوفزدہ ہو سکتے ہیں کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں موجودہ معاشرتی ڈھانچوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

1.2. تبدیلی کے خوف کا عنصر :قدامت پسند افراد تبدیلی سے بے چینی محسوس کرتے ہیں اور موجودہ نظام اور عقائد کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بے چینی ایک نفسیاتی میکانزم کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو غیر متوقع یا انجان حالات سے بچنے کے لیے انسان کی فطری ردعمل کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے لیے تبدیلی کا مطلب ہے عدم استحکام، جو ان کے لیے ایک خطرے کی صورت میں ہوتا ہے۔

1.3. مذہبی اور اخلاقی عقائد کا اثر :قدامت پسند افراد عموماً اپنے مذہبی عقائد یا اخلاقی اقدار سے بہت زیادہ جڑے ہوتے ہیں۔ ان کی دنیا کی سمجھ مذہبی یا اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر ہوتی ہے، جس کے مطابق کسی بھی تبدیلی کو غیر اخلاقی یا غیر اسلامی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ افراد اپنے مذہب کو یا ثقافت کو اتنی شدت سے پکڑتے ہیں کہ وہ جدید یا غیر متعارف خیالات کو رد کر دیتے ہیں۔

2۔ قدامت پسندوں کی شخصیت کے نفسیاتی پہلو:

.2.1 کمزور 'پرامن' رویہ : قدامت پسند افراد میں عام طور پر "پرامن " (conservative) رویہ پایاجاتاہے جوانہیں موجودہ معاشرتی نظام میں سکون اور استحکام محسوس کراتاہے۔ یہ نفسیاتی رویہ انہیں مخصوص روایات اور سماجی اصولوں کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتاہے، تاکہ وہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں ایک مستحکم ماحول کی توقع رکھیں۔

.2.2 اجتناب اور عدم تحفظ : قدامت پسند افراد میں ایک عام نفسیاتی رجحان اجتناب (avoidance) کاہوتاہے، جوانہیں نئے یاغیر روایتی خیالات سے دور رکھتاہے۔ یہ رویہ کسی بھی قسم کے خطرے یاغیر متعارف عوامل سے بچنے کی کوشش ہے۔ قدامت پسندافراد میں عدم تحفظ کااحساس زیادہ پایاجاتاہے، خاص طور پراس صورت میں جب وہ جدیدیت یاتبدیلی کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

.2.3 خود مختاری کی کمی اور گروپ کی وابستگی : قدامت پسند افراد عموماً زیادہ گروہی شناخت رکھتے ہیں اوراپنے خیالات کو گروہ یاجماعت سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لیے خاندان، قوم، یامذہب کی اقدار کااحترام اور

ان سے وابستگی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ افراد اپنی ذاتی آزادی سے زیادہ گروہ کی مطابقت یا وابستگی پر توجہ دیتے ہیں۔

3۔ قدامت پسندوں کا سوشل اور سیاسی رویہ:

3.1. سماجی نظم و ضبط کی ضرورت : قدامت پسند افراد سماجی نظم و ضبط اور ضوابط کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر معاشرتی اصولوں اور قواعد کو توڑا جائے تو معاشرتی انتشار اور افراتفری پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ اکثر ریاستی طاقت، مذہبی اداروں اور روایتی سماجی ڈھانچوں کی حمایت کرتے ہیں تاکہ ایک مضبوط اور مستحکم معاشرتی نظام قائم رہے۔

3.2. حکومتی اختیار اور طاقت کی حمایت : قدامت پسند افراد عموماً مضبوط حکومتی اختیار اور طاقت کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ریاستی ادارے موجودہ سماجی نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ حکومتی کردار کو بنیادی طور پر اجتماعی فلاحی نظام کے طور پر دیکھتے ہیں، جو معاشرتی اقدار اور اخلاقیات کو مستحکم کرتا ہے۔

4۔ قدامت پسندوں کا جائزہ جدیدیت سے:

قدامت پسند افراد جدیدیت سے دوری اختیار کرتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ یہ نئے نظریات، ٹیکنالوجی، یا اخلاقی تبدیلیاں روایتی زندگی اور معاشرتی اصولوں کو متاثر کر سکتی ہیں۔ ان کی نفسیاتی ساخت میں تبدیلیوں سے نفرت اور جمود کی حمایت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

.4.1 ماضی کی طرف رجوع : قدامت پسند افراد ماضی کو ایک "سنہری دور" کے طور پر دیکھتے ہیں، جہاں ہر چیز اپنی جگہ پر تھی اور سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ اس لیے ان کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی روایات کو دوبارہ زندہ کریں تاکہ ایک "آسان اور محفوظ" دنیا کی تشکیل ہو۔

.4.2 اخلاقی اصولوں کا تحفظ : قدامت پسند افراد اپنے اخلاقی اور مذہبی اصولوں کا بہت زیادہ تحفظ کرتے ہیں، اور ان میں تبدیلی یا اصلاحات کو خطرے کی طرح دیکھتے ہیں۔ انہیں خوف ہوتا ہے کہ جدیدیت اخلاقی بنیادوں کو مٹا دے گی اور معاشرتی توازن کو متاثر کرے گی۔

5۔ قدامت پسندوں کے نفسیاتی تجزیے کے نتیجے:

قدامت پسندوں کا نفسیاتی تجزیہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ ان کے فکری رجحانات کا تعلق ان کے داخلی خوف، معاشرتی عدم تحفظ، اور ماضی کی طرف لوٹنے کی خواہش سے ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی تبدیلیوں اور جدیدیت کو ایک خطرے کے طور پر دیکھتے ہیں، جو ان کی شناخت، اقدار اور روایت کو مٹا سکتی ہے۔ ان کے رویوں میں جمود، تبدیلی سے خوف، اور اجتماعی تعلقات پر زور دینا شامل ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ تبدیلی کی بجائے استحکام اور روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔

جدت پسندوں کا نفسیاتی تجزیہ:

جدت پسند افراد وہ ہوتے ہیں جو تبدیلی، ترقی اور نئے خیالات کو اپنانے کے حق میں ہوتے ہیں، اور روایتی ڈھانچوں اور اصولوں سے ہٹ کر معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی اصلاحات کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا رویہ ماضی کے مقابلے میں حال اور مستقبل کی طرف مائل ہوتا ہے، اور وہ معاشرتی ترقی اور بہتر مستقبل کے لیے تبدیلی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

1۔ جدت پسندوں کی نفسیاتی خصوصیات:

.1.1 تبدیلی کا قبول کرنا : جدت پسند افراد تبدیلی کو ایک قدرتی اور ضروری عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے معاشرتی، ثقافتی یا سیاسی تبدیلی ایک ترقی کا حصہ ہے، جو انسانوں کو نئی منزلوں تک پہنچا سکتی ہے۔ ان کی نفسیاتی ساخت میں تبدیلی کے لیے کھلے پن اور اس کے فوائد کا شعور نمایاں ہوتا ہے۔

.1.2 خطرات کو قبول کرنے کی اہلیت : جدت پسند افراد میں خطرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ جدیدیت کے راستے میں آنے والی مشکلات اور چیلنجز کو ایک قدرتی حصہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ترقی کے لیے بعض اوقات روایات سے ہٹنا اور نئے راستے اپنانا ضروری ہے۔ یہ افراد غیر متوقع حالات کو اپنی ترقی کا حصہ سمجھتے ہیں۔

.1.3 عقل و فہم کا استعمال : جدت پسند افراد میں عقل و فہم کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیالات اور فیصلوں میں تجزیے، معقولیت اور سائنس کی بنیاد پر سوچنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے لیے روایات کی بجائے تجزیاتی سوچ اور تجربات کی بنیاد پر فیصلے کرنا ضروری ہوتا ہے۔

.1.4 آزاد خیال اور کھلا ذہن : جدت پسند افراد کھلے ذہن کے حامل ہوتے ہیں اور نیا سیکھنے، نئے خیالات کو اپنانے اور روایات سے باہر نکل کر سوچنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کے لیے معاشرتی یا ثقافتی تبدیلیاں ایک مثبت قدم ہوتی ہیں جو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

2۔ جدت پسندوں کی شخصیت کی نفسیاتی ساخت:

.2.1 خود مختاری اور انفرادیت : جدت پسند افراد عموماً خود مختار اور انفرادیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنے فیصلے خود لیتے ہیں اور دوسروں کی رائے سے زیادہ اپنے تجربات اور سوچ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا یقین ہوتا ہے کہ نئے خیالات اور اقدامات کی حمایت کی جانی چاہیے، چاہے وہ روایات سے ہٹ کر ہوں۔

.2.2 تجدیدی سوچ :(Innovative thinking) جدت پسند افراد کی شخصیت میں تجدیدی سوچ اور اختراع کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ مسائل کے حل کے لیے نئے طریقوں کو اپنانا پسند کرتے ہیں اور موجودہ مسائل کے لیے نئے حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ذہن روایات کے بوجھ سے آزاد ہو کر نئے خیالات کو گلے لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

.2.3معروضیت اور حقیقت پسندی : جدت پسند افراد کی نفسیات میں معروضیت اور حقیقت پسندی بھی اہم ہوتی ہے۔ وہ ہر مسئلے کو حقیقت کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جدید تحقیق، سائنسی پیشرفت اور تجربات کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں۔ ان کے لیے تبدیلیاں حقیقت پر مبنی اور عملی ہونی چاہئیں۔

3۔ جدت پسندوں کا سماجی اور سیاسی رویہ:

.3.1معاشرتی ترقی کی تائید : جدت پسند افراد ہمیشہ معاشرتی ترقی اور اصلاحات کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سماجی انصاف، صنفی مساوات، تعلیم کی ترقی، صحت کے شعبے کی اصلاحات، اور معاشرتی بہبود کے لیے جدت ضروری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلیاں کرنے سے فرد اور معاشرے کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔

.3.2ریاستی مداخلت کی حمایت : جدت پسند افراد اکثر ریاستی مداخلت کی حمایت کرتے ہیں تاکہ معاشرتی مسائل حل کیے جا سکیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کو شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے فعال کردار ادا کرنا چاہیے اور

اصلاحات کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے قوانین اور پالیسیاں وضع کرنی چاہئیں۔

.3.3 جدت پسند سیاست کی حمایت : جدت پسند افراد اکثر ایسی سیاسی جماعتوں یا تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں جو تبدیلی، اصلاحات اور ترقی کی بات کرتی ہیں۔ وہ نئے نظریات، قوانین اور طریقہ کار کو اپنانے کے حق میں ہوتے ہیں تاکہ سیاست میں انصاف اور مساوات قائم ہو سکے۔

4۔ جدت پسندوں کا رویہ روایات سے:

.4.1 روایات سے انحراف : جدت پسند افراد روایات کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ وہ سماج کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے روایات کو بدلنا ضروری ہے، تاکہ فرد اور معاشرہ مزید ترقی کر سکے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ روایات کا اتباع کرنے سے موجودہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

.4.2 ماضی کا تنقیدی جائزہ : جدت پسند افراد ماضی کو ایک "غیر فطری" حیثیت کے طور پر دیکھتے ہیں اور ماضی کی اقدار اور نظریات پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ

پرانے اصولوں اور اعتقادات کو چیلنج کرتے ہیں اور جدید خیالات کو اپنانے کو اہمیت دیتے ہیں۔

5۔ جدت پسندوں کے نفسیاتی تجزیے کے نتائج:

جدت پسند افراد میں تبدیلی کی تائید، نئے خیالات کی حمایت اور روایات سے انحراف کی نفسیاتی ساخت پائی جاتی ہے۔ وہ معاشرتی ترقی اور فرد کی فلاح کے لیے نئے راستوں کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے کسی بھی قسم کی جدت یا تبدیلی کو خوش دلی سے گلے لگاتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں عقل و فہم، کھلا ذہن، خود مختاری اور تجدیدی سوچ کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ ماضی کے بجائے حال اور مستقبل کی طرف دیکھ کر تبدیلیوں کو فائدہ مند سمجھتے ہیں اور اس کے لیے جرات مندانہ فیصلے کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

قدامت و جدّت کے رجحانات کی یکجائی

قدامت پسند اور جدت پسند افراد کی زندگی کے مختلف شعبوں میں رویے اور رجحانات مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہر شخص یا گروہ ایک ہی وقت میں ہر شعبے میں ایک ہی نظریہ اپنانے کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص یا گروہ

مختلف سطحوں اور شعبوں میں مختلف رویہ اختیار کر سکتا ہے، اور ان کا رجحان کسی خاص شعبے میں قدامت پسند ہو سکتا ہے، جبکہ کسی دوسرے شعبے میں وہ جدت پسند ہو سکتے ہیں۔

1۔ سماجی و ثقافتی سطح پر:

قدامت پسند : سماجی و ثقافتی معاملات میں قدامت پسند افراد عموماً ماضی کی روایات اور اقدار کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ خاندان، مذہب، اور معاشرتی اصولوں کے حوالے سے قدیم نظریات کو اپنانا پسند کرتے ہیں۔ مثلاً، شادی، خاندان اور بچوں کی تربیت کے حوالے سے روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔

جدت پسند : سماجی اور ثقافتی سطح پر جدت پسند افراد جدید اقدار اور خیالات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ زیادہ آزادی، جندر مساوات، اور انفرادیت کے حامی ہو سکتے ہیں اور روایتی کنونشنز سے انحراف کر سکتے ہیں۔

2۔ تعلیمی سطح پر:

قدامت پسند : تعلیمی میدان میں قدامت پسند افراد عموماً روایتی تدریسی طریقوں اور نصاب کو ترجیح دیتے ہیں، جن میں کلاسیکی مواد اور روایتی اسلوبِ تدریس کو اپنانا زیادہ اہم ہوتا ہے۔

جدت پسند : تعلیم میں جدت پسند افراد جدید تدابیر، ٹیکنالوجی اور تعلیمی نظریات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ انٹرایکٹو تدریس، سائنسی طریقہ کار، اور طلباء کی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑھانے والے طریقوں کی حمایت کرتے ہیں۔

3۔ سیاست و حکومتی سطح پر:

قدامت پسند : سیاسی سطح پر قدامت پسند افراد عموماً موجودہ حکومتوں اور اداروں کو برقرار رکھنے کے حامی ہوتے ہیں اور ان کے لئے کسی بھی تبدیلی کو غیر ضروری سمجھ سکتے ہیں۔ وہ معاشرتی نظم وضبط، قانون کی حکمرانی اور سٹیٹس کو کو اہمیت دیتے ہیں۔

جدت پسند : سیاسی سطح پر جدت پسند افراد حکومتوں اور اداروں میں اصلاحات، تبدیلیوں اور نئے خیالات کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے جدید پالیسیاں اور اقدامات اپنانا چاہتے ہیں۔

4۔ مذہبی و روحانی سطح پر:

قدامت پسند : مذہبی سطح پر قدامت پسند افراد عموماً مذہبی اصولوں کی سختی سے پیروی کرتے ہیں۔ وہ شریعت یا مذہبی روایات کو اپنے زندگی کے تمام پہلوؤں

میں نافذ کرنے کے حق میں ہوتے ہیں اور کسی بھی تبدیلی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

جدت پسند : مذہبی سطح پر جدت پسند افراد عموماً مذہبی اصولوں کی متوازی تشریحات، ان کی تفہیم اور موجودہ دور کے حالات کے مطابق انہیں نئے انداز سے دیکھنے کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ مذہب کو جمود کی بجائے زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

5۔ معاشی سطح پر:

قدامت پسند : معاشی سطح پر قدامت پسند افراد عموماً روایتی اقتصادی ماڈلز اور طریقوں کی حمایت کرتے ہیں، جیسے کہ فری مارکیٹ اکانومی یا ریاستی کنٹرول میں معاشی استحکام۔

جدت پسند : معاشی سطح پر جدت پسند افراد جدید اقتصادی نظریات، جیسے کہ سوشلزم یا ماحولیاتی پائیداری پر مبنی اقتصادی نظاموں کی حمایت کرسکتے ہیں، اور نئے مالیاتی طریقوں، ٹیکنالوجی اور معیشتی نمونوں کو اپنانا چاہتے ہیں۔

6۔ ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی:

قدامت پسند : ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی میں قدامت پسند افراد نئی ٹیکنالوجیز یا طریقوں کے اپنانے میں محتاط اور سست رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ نئی اختراعات کے خطرات یا نتائج سے بچنا چاہتے ہیں اور روایتی طریقوں کی پیروی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

جدت پسند : ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کے حوالے سے جدت پسند افراد نیا سیکھنے، جدید ٹیکنالوجیز اپنانے اور سائنسی تحقیقات کو بڑھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ٹیکنالوجی کے ذریعے زندگی میں بہتری لانے اور نئے امکانات کو دریافت کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔

قدامت پسند اور جدت پسند افراد زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف رویے اپناتے ہیں۔ ایک شخص یا گروہ کسی ایک شعبے میں قدامت پسند ہو سکتا ہے، جبکہ کسی دوسرے شعبے میں وہ جدت پسند ہو سکتا ہے۔ یہ انفرادی ترجیحات، سماجی و ثقافتی حالات، اور وقت کے مطابق بدلے ہوئے مسائل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس طرح کے مختلف رویے افراد کی ذہنیت اور مفادات کے مطابق ہوتے ہیں، جو ان کے سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی تجربات سے جڑے ہوتے ہیں۔

سائنس و مذہب کی یکجائی

سائنس اور مذہب کے درمیان خلیج ڈالنے والے عام طور پر دو انتہاؤں پر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو سائنسی حقیقتوں کو مذہب کے خلاف ایک حتمی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یوں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب محض ایک روایتی یا غیر سائنسی نظریہ ہے۔ یہ لوگ عموماً نیچر لزم یا سائنٹزم (Scientism) کے زیر اثر ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو چیز تجربے یا مشاہدے میں نہیں آتی، وہ حقیقت میں موجود ہی نہیں ہو سکتی۔

دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو مذہب کو ایک جامد اور غیر لچکدار تصور کر کے سائنسی ترقی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سائنس کو ایک مخالف طاقت سمجھتے ہیں اور جدید سائنسی دریافتوں کو قبول کرنے کے بجائے انہیں مذہب کے خلاف ایک چیلنج تصور کرتے ہیں۔ نتیجتاً، وہ سائنسی ترقی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں، خواہ وہ زمانے کی روشنی میں نظر ثانی کے متقاضی ہی کیوں نہ ہوں۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو سائنس اور مذہب میں کوئی حقیقی تضاد نہیں۔ سائنس کا دائرہ محدود ہے، یہ مادی اور تجرباتی حقائق تک رسائی رکھتی ہے، جبکہ مذہب ان حقائق کی تعبیر فراہم کرتا ہے اور ان کی حتمی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو لوگ ان دونوں کے درمیان خلیج ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یا تو سائنس کو اس کی حدود سے بڑھا کر مذہب کا متبادل سمجھنے لگتے ہیں یا پھر مذہب کی اصل حکمت کو نظر انداز کر کے سائنس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ درحقیقت، سائنس اور مذہب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، نہ کہ ایک دوسرے کی نفی۔

سائنس اور مذہب کی تکمیل کو سمجھنے کے لیے ہمیں دونوں کے دائرہ کار اور مقاصد پر غور کرنا ہو گا۔ سائنس فطری قوانین کو دریافت کرتی ہے، مظاہرِ قدرت کی وضاحت پیش کرتی ہے اور دنیا کے مادی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے تجرباتی طریقے اپناتی ہے۔ دوسری طرف، مذہب انسان کو کائنات کی غائی حقیقت، اخلاقیات، روحانیت اور حیات بعد الموت جیسے امور پر رہنمائی فراہم کرتا ہے، جو سائنسی دائرہ کار سے باہر ہیں۔

یہ دونوں ایک دوسرے کی نفی کرنے کے بجائے حقیقت کی تکمیل کرتے ہیں کیونکہ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کائنات کیسے کام کرتی ہے، جبکہ مذہب اس کے "کیوں" کا جواب دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان ارتقائی مراحل سے گزر کر موجودہ شکل میں آیا، لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ اس کے پیچھے مقصد کیا ہے۔ یہ سوال مذہب اٹھاتا ہے اور وضاحت کرتا ہے کہ انسان صرف ایک حیاتیاتی اتفاق نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا ہے۔

اسی طرح، سائنسی ترقی نے ہمیں فطرت کے اصولوں کو زیادہ گہرائی سے سمجھنے میں مدد دی، لیکن یہ اصول قرآن و حدیث میں دی گئی حقیقتوں کی تائید کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، قرآن میں کئی ایسے سائنسی حقائق کا ذکر ہے جو جدید سائنس نے صدیوں بعد دریافت کیے، جیسے کائنات کی توسیع (الذاریات:47) اور انسان کی تخلیق میں مرحلہ وار ارتقاء (المومنون:12-14)۔

مزید برآں، سائنسی تحقیق کی بنیاد مشاہدہ اور تجربہ ہے، جبکہ مذہب کا دائرہ اس سے آگے بڑھ کر غیبی حقائق تک پہنچتا ہے، جنہیں سائنس اپنے موجودہ آلات اور تجربات سے ثابت نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر، روح، دعا کے اثرات،

وحی اور قیامت جیسے موضوعات وہ ہیں جنہیں سائنسی طریقہ کار کے ذریعے مکمل طور پر جانچنا ممکن نہیں، لیکن مذہب ان کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عظیم مسلم سائنسدان جیسے ابن سینا، ابن الہیثم، الرازی اور الخوارزمی نہ صرف سائنسی علوم میں مہارت رکھتے تھے، بلکہ مذہبی علوم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے سائنس اور مذہب کو متضاد نہیں سمجھا، بلکہ دونوں کو ایک مکمل حقیقت کے مختلف زاویے قرار دیا۔

چنانچہ، جب سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کا حریف بنانے کے بجائے ان کے اصل دائرہ کار میں دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ سائنس مادی حقائق کو واضح کرتی ہے اور انسان کو تحقیق پر مائل کرتی ہے، جبکہ مذہب ان حقائق کے پیچھے کارفرما حکمت کو بیان کرتا ہے اور تحقیق کو اخلاقی اور بامقصد سمت عطا کرتا ہے۔

جو مذہبی امور سائنس ثابت کرنے سے قاصر ہے، وہاں انسان کو سب سے پہلے سائنسی محدودیت کو سمجھنا چاہیے۔ سائنس کا دائرہ صرف مادی اور تجرباتی حقائق تک محدود ہے، جبکہ مذہب ان حقائق کے پیچھے کارفرما حکمت اور روحانی پہلوؤں

کو واضح کرتا ہے۔ سائنس ان چیزوں کو ثابت نہیں کر سکتی جو اس کے دائرۂ تحقیق سے باہر ہیں، جیسے روح، وحی، آخرت، ملائکہ، تقدیر اور دعا کے اثرات۔ اگر سائنس کسی چیز کو ثابت نہ کر پائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقت میں موجود نہیں، بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سائنسی طریقۂ تحقیق اسے ناپنے اور پرکھنے کے قابل نہیں۔

مذہب کی سچائی کو سمجھنے کے لیے محض سائنسی تجربے پر انحصار ضروری نہیں، بلکہ عقل، منطق، تاریخی شواہد، نقلی دلائل اور ذاتی و اجتماعی تجربات بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کئی مذہبی تصورات ایسے ہیں جو سائنسی تجربات کے بجائے منطقی استدلال سے ثابت ہوتے ہیں، جیسے اللہ کے وجود کا عقلی اثبات۔ اسی طرح، انبیاء کی پیشین گوئیاں، معجزات اور الہامی کتب میں دیے گئے بیانات جو بعد میں سچ ثابت ہوئے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ دین کا دائرہ سائنسی مشاہدے سے کہیں وسیع ہے۔ مزید برآں، انسان کی ذاتی زندگی میں بھی روحانی تجربات اور دعا کی قبولیت جیسے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں، جو کسی نہ کسی درجے میں مذہب کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ کئیوں سائنسی دریافتیں وقت کے ساتھ ثابت ہوئی ہیں۔ ماضی میں کچھ ایسے حقائق جنہیں غیر سائنسی سمجھا جاتا تھا، بعد میں جدید سائنس نے ان کی تصدیق کر دی، جیسے قرآن میں پانی کو ہر جاندار کی بنیاد قرار دینا اور جدید بایولوجی کا یہ ثابت کرنا کہ تمام خلیے پانی پر انحصار کرتے ہیں۔ اس لیے اگر آج سائنس کسی مذہبی حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہی، تو یہ ممکن ہے کہ مستقبل میں تحقیق اس کی تصدیق کر دے۔

ایمان اور سائنسی ثبوت میں ایک توازن ضروری ہے۔ دین کا مقصد سائنسی تصدیق کروانا نہیں بلکہ ہدایت دینا ہے۔ کچھ امور ایسے ہیں جو خالصتاً ایمان پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا سائنس سے ثابت ہونا ضروری نہیں، جیسے آخرت، فرشتے اور روحانی اثرات۔ جب کافی دلائل ہو جائیں، تو دیگر غیر مرئی حقائق کو قبول کرنا عقل کا تقاضا ہے، کیونکہ یہی توکل اور تسلیم و رضا کی بنیاد ہے۔ اگر کسی مذہبی حقیقت کو سائنس ثابت کرنے سے قاصر ہو، تو انسان کو بے یقینی میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے فہم کو وسیع کرنا چاہیے، سائنسی ترقی کے ممکنہ پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے اور ایمان کی گہرائی میں جا کر حقیقت کی تلاش کرنی چاہیے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس وقت تک سائنس کو مستند مانتے ہیں جب تک وہ ان کے نظریاتی یا فکری ڈھانچے سے متصادم نہ ہو، لیکن جیسے ہی سائنس کسی مذہبی حقیقت کی تائید کرنے لگتی ہے، وہ فوراً اسے "سوڈوسائنس" قرار دے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی سائنس وہی ہے جو مذہب سے الگ ہو اور اگر کسی سائنسی تحقیق سے کسی دینی تصور کی تصدیق ہونے لگے تو وہ اسے غیر معتبر، مشکوک یا سائنسی دائرہ کار سے باہر قرار دینے لگتے ہیں۔ یہ رویہ دراصل تعصب اور نظریاتی جمود کی علامت ہے، جس کی جڑیں یا تو غیر شعوری طور پر مذہب سے گریز میں ہوتی ہیں یا پھر اس خوف میں کہ کہیں سائنسی بنیادوں پر مذہب کی سچائی کا کوئی ایسا ثبوت نہ مل جائے جسے رد کرنا مشکل ہو جائے۔

ایسے افراد عموماً اس فکر کے حامل ہوتے ہیں کہ سائنس اور مذہب دو الگ دنیائیں ہیں اور ان کا کسی بھی سطح پر آپس میں میل ممکن نہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تصور مضبوط ہوتا ہے کہ سائنسی تحقیق کا مطلب مذہبی عقائد کی نفی کرنا ہے، اور اگر کسی سائنسی دریافت سے دینی تعلیمات کی تصدیق ہو جائے تو وہ اسے سائنسی طریقۂ تحقیق کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سائنس کو صرف ایک ایسے نظریے کے طور پر دیکھا جائے جو مذہب سے بالکل آزاد ہو، کیونکہ

اگر سائنس مذہب کی سچائی کی گواہی دینے لگے تو انہیں اپنے فکری موقف میں تبدیلی لانی پڑے گی، جو ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

یہ مائنڈ سیٹ عموماً نیچر لزم یا سائنٹزم سے متاثر ہوتا ہے، جس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ صرف وہی چیز حقیقت ہے جسے سائنسی تجربے سے ثابت کیا جا سکے۔ اس سوچ کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ سائنس کو محض مادی اور تجرباتی معاملات تک محدود رکھا جائے اور غیر مادی یا غیبی حقائق کے دائرے میں اسے داخل نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ اس سے سائنس کے "روایتی نیوٹرل موقف" کو چیلنج لاحق ہو سکتا ہے۔

اس رویے کا تضاد یہ ہے کہ جب سائنس مذہب کے خلاف کوئی نظریہ پیش کرے تو وہ اسے کھلے دل سے قبول کر لیتے ہیں، چاہے وہ نظریہ ابھی محض ایک مفروضہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن جب وہی سائنس مذہبی عقائد کی تصدیق کرنے لگے تو وہ فوراً اس پر سوالات کھڑے کر دیتے ہیں اور اسے سوڈو سائنس کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ اس رویے کی اصل بنیاد نظریاتی تعصب ہے، جو تحقیق پر نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ سوچ پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعی سچائی کی تلاش میں

ہوتے تو وہ ہر سائنسی دریافت کو اس کے علمی اصولوں کے مطابق پرکھتے، بجائے اس کے کہ وہ نتائج کو پہلے سے طے شدہ فکری سانچے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے۔

سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ حقیقت کے مختلف زاویے ہیں، جہاں سائنس مادی قوانین کو واضح کرتی ہے اور مذہب ان کے پیچھے کارفرما حکمت اور غائی مقصد کو بیان کرتا ہے۔ اگر کوئی مذہبی حقیقت سائنسی دائرۂ تحقیق سے باہر ہو تو اس کا انکار کرنا سائنسی محدودیت کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ مذہب کے حق میں آنے والے سائنسی شواہد نہیں مانتے، وہ دراصل تعصب کا شکار ہوتے ہیں اور پہلے سے طے شدہ نظریات کو محفوظ رکھنے کے لیے تحقیق کو قبول یا مسترد کرتے ہیں۔ سچائی کی تلاش تبھی ممکن ہے جب کھلے ذہن اور دیانت داری کے ساتھ ہر علمی ذریعے کو اس کے اصولوں پر پرکھا جائے، بجائے اس کے کہ کسی ایک نظریے کو مطلق مان کر باقی تمام امکانات کو رد کر دیا جائے۔

S. Jahanzaib Abidi is a notable writer for article writings series who has authored several pieces on diverse topics such as education, epistemology, philosopy, culture, media, politics, economics, and society in Islamic perspective.